یو بی ایل یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ
ترقی ہمارا شعار

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۵۷۹ ٹیلی فون نمبر ۶۳۱۵۷۶۳

مدیر

احمد ندیم قاسمی

مدیر منتظم

منصورہ احمد

تزئین کار

موجد

شمارہ : ۴۵

جنوری - اپریل ۱۹۹۵ء

دستی : ۳۰۰ روپے

بذریعہ رجسٹری : ۳۵۰ روپے

ممالکِ غیر کے لیے : ۱۵۰۰ روپے

قیمت موجودہ شمارہ : ۷۰ روپے

مقامِ اشاعت : ۴۵ اے مزنگ روڈ ۔ لاہور

مُندرجات

افسانے

غزلیں

سرورق		موجد	
سلیم کوثر، ۲۲۹	غلام حسین ساجد، ۲۳۰	نصیر احمد ناصر، ۲۴۰	معین نجمی، ۲۴۱
غلام حسین ساجد، ۲۳۰	پروفیسر محمد افضل، ۲۳۱	تصدق شعار، ۲۴۱	علی اصغر عباس، ۲۴۲
پروفیسر محمد افضل، ۲۳۱	امتیاز الحق امتیاز، ۲۳۲	علی اصغر عباس، ۲۴۲	عباس تابش، ۲۴۳
امتیاز الحق امتیاز، ۲۳۲	رفیق سندیلوی، ۲۳۳	عباس تابش، ۲۴۳	قمر رضا شہزاد، ۲۴۴
رفیق سندیلوی، ۲۳۳	مسعود احمد، ۲۳۴	قمر رضا شہزاد، ۲۴۴	عدنان بیگ، ۲۴۵
مسعود احمد، ۲۳۴	نجیب احمد، ۲۳۵	عدنان بیگ، ۲۴۵	تابش کمال، ۲۴۶
نجیب احمد، ۲۳۵	دلنواز دل، ۲۳۶	اے جی جوش، ۲۴۶	اختر شیخ، ۲۴۷
دلنواز دل، ۲۳۶	یوسف حسن، ۲۳۷	آفتاب کاوش، ۲۴۷	اختر عثمان، ۲۴۸
یوسف حسن، ۲۳۷	جلیل عالی، ۲۳۸	مسعود عثمانی، ۲۴۸	جمشید چشتی، ۲۴۹
جلیل عالی، ۲۳۸	اشرف جاوید، ۲۳۹	جمشید چشتی، ۲۴۹	احمد ندیم قاسمی، ۲۵۰
اشرف جاوید، ۲۳۹	نصیر احمد ناصر، ۲۴۰	اختلافات	متفرق اصحاب، ۲۵۱

حرفِ اوّل

ندیم

"فنون" کی اشاعت میں بار بار کی تاخیر کے دو واضح سبب ہیں۔ اوّل مدیر "فنون" کے ساتھ پیش آنے والے بعض المناک اور جاں گداز حادثات، اور دوم کاغذ کی اس حد تک ہوش ربا گرانی کہ کئی بار "فنون" کی اشاعت کو ختم کر دینے اور "فنون" کے قارئین کرام سے حتمی معذرت طلب کر لینے کے بارے میں بھی سوچا گیا۔ کاغذ کی قیمتوں میں ——— اخباری کاغذ کی قیمتوں سمیت ——— یوں مسلسل اور متواتر اضافہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ وہم ہونے لگتا ہے کہ ہماری حکومتیں، قیمتوں پر گرفت رکھنے اور انھیں معقولیت سے آگے بڑھنے سے روکنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہو چکی ہیں اور کاغذ کی مارکیٹ پر اربابِ حکومت کا کوئی دور دراز کا بھی کنٹرول نہیں ہے۔ مطبوعات، طباعت و اشاعت کے مراحل سے صرف اس وقت گزرتی ہیں جب کاغذ وافر اور ارزاں میسر ہو مگر جب کاغذ کے نرخ سدِ سکندری کی صورت اختیار کر جائیں تو کسی کتاب یا رسالے کی طباعت ایک آزمائش کی صورت اختیار کر جاتی ہے جس میں عموماً ہتھیار ڈال دینے پڑتے ہیں۔ ان دنوں دوسرے معیاری ادبی رسالوں کی طرح "فنون" بھی ایسے ہی مراحل میں سے گزر رہا ہے، چنانچہ قارئین سے دعا درکار ہے۔

"فنون" کے آئندہ شمارے (نمبر ۴۶) کا ایک بڑا حصہ ۱۹۹۴ء میں وفات پا جانے والے اہلِ قلم کے حضور نذرانۂ عقیدت و محبت کے لئے وقف ہوگا۔ اس سلسلے میں پروین شاکر، محشر بدایونی، ظہیر کاشمیری، احمد داؤد اور احسن احمد اشک وغیرہ سے متعلق مضامین نثر و نظم کو مرتب کر لیا گیا ہے اور کوشش یہ ہے کہ اس یادگار شمارے کی اشاعت میں تاخیر نہ ہو۔

"فنون" ۴۵ کی اشاعت کے بعد بھی علم و ادب کی بعض اہم شخصیات رخصت ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی پاکستان کے ایک معتبر اور محترم فلسفہ داں تھے۔ سید امجد الطاف نے افسانہ نگاری کے علاوہ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی) کے لئے بڑا اہم اور بنیادی کام کیا۔ اصغر سلیم اردو کے ایک خوبصورت اور بھرپور شاعر تھے۔ خان فضل الرحمٰن خان نے اردو افسانے اور ناول کے خزانوں میں عمدہ اضافے کئے۔ نواز پنجابی افسانے اور ڈرامے کا ایک محبوب نمائندہ تھا۔ ماجد الباقری اور حافظ بشیر آزاد اچھے غزل گو تھے۔

ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ مشہور مزاح نویس نیاز سواتی ٹریفک کے ایک حادثے میں انتقال کر گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائے۔

احمد ظفر

حمد

فیصلے سب مہربانی کے اُسی کے پاس ہیں
دن ہماری شادمانی کے اُسی کے پاس ہیں

زندگی بنتی رہی مجموعۂ غیب و شہود
سلسلے سب دارِ فانی کے اسی کے پاس ہیں

کیسے دریا بن گیا پربت کا سینہ چیر کر
معجزے پتھر میں پانی کے اُسی کے پاس ہیں

پھول کھلتے ہیں گلستاں میں اسی کے حکم سے
دن شجر کی زندگانی کے اُسی کے پاس ہیں

بستیاں نطق و بیاں کی اس نے ہی آباد کیں
شہر مفہوم و معانی کے اُسی کے پاس ہیں

دائرہ گرداب کا کیسے کنارا بن گیا
راز کشتی کی روانی کے اسی کے پاس ہیں

زندگی میرے لئے انعام ہے اس کا ظفر
سانس میری پاسبانی کے اسی کے پاس ہیں

آصف ثاقب

حمد

تجھ کو محسوس کیا میں نے دکھوں کے بن میں
عکس تیرا ہی اُجاگر ہے اکیلے پن میں

لفظ چُن چُن کے میں لکھتا ہوں تری یادوں کے
اے خُدا تیری ہی تنویر ہے میرے فن میں

اِک معصوم سا اخلاص ہے سینے میں مرے
عمر گزرے گی محبت کے اسی بچپن میں

رات بھر لفظ ترے، آنکھ سے میری ٹپکے
جن کی تحریر بنی صبح کے اُجلے پن میں

اُس کے ہونٹوں سے ترا نُور چھلک پڑتا ہے
نام تیرا جو کبھی لیتا ہے من ہی من میں

اے خُدا تجھ کو کہاں ڈھونڈنے ثاقب جاتے
تُو نے ڈیرے تو لگائے ہیں اُسی کے من میں

رشید قیصرانی

حمد

مجھے کیا خبر کہ وہ ذکر تھا، وہ نماز تھی کہ سلام تھا
مرا اشک تھا مقتدی ترا حرف حرف امام تھا

ترے رُخ کا تھا وہی طنطنہ، مری دید کا وہی بانکپن
کہ بس ایک کیفِ جمال تھا، نہ سجود تھا، نہ قیام تھا

میں ورائے جسم تری تلاش میں تھا مگن، مجھے کیا خبر
کہ ہر ایک ریزۂ تن میں بھی تری جلوتوں کا نظام تھا

مجھے رتجگوں کی صلیب پر زرِ خواب جس نے عطا کیا
وہی سحر، سحرِ مبین تھا، وہی حرف، حرفِ دوام تھا

مجھے عرش و فرش کی کیا خبر، مجھے تو ملا تھا جہاں جہاں
وہی آسماں بھی مری زمیں، وہی فرش عرش مقام تھا

"ق"

مری دسترس میں جو آ گیا، ترے حسن کا کوئی زاویہ
وہی سلطنت مرے حرف کی وہی تاجدارِ کلام تھا

ترے کُنجِ لب سے رواں دواں وہ جو ایک سیلِ حرف تھا
اُسے لہر لہر سمیٹنا اُسی کملی والے کا کام تھا

صبیح رحمانی

حمد

نشاں اسی کے ہیں سب، اور بے نشاں وہ ہے
چراغ اور اندھیرے کے درمیاں وہ ہے

نمودِ لالہ و گُل میں وہی ہے چہرہ نما
شجر شجر پہ لکھا حرفِ داستاں وہ ہے

جبینِ شمس و قمر اس کے نُور سے تاباں
سُنہری دھوپ ہی کیا، حُسنِ کہکشاں وہ ہے

اسی کی ذات کے ممنون خد و خالِ حیات
کہ اور کون ہے صورت گرِ جہاں، وہ ہے

ہر اک اُفق پہ اسی کا دوام روشن ہے
جو شے ہے فانی ہے، بس ایک جاوداں وہ ہے

اسی کی یاد لہو سے کلام کرتی ہے
ہے جس کے ذکر سے آباد شہرِ جاں، وہ ہے

سکوتِ نیم شبی میں پکارتا ہوں اُسے
کہ میں ہوں درد کی دستک، درِ اماں وہ ہے

زبانِ اشک سے مانگو دُعائیں بخشش کی
بڑا رحیم، نہایت ہی مہرباں وہ ہے

اسی کی مدح میں لو دے رہے ہیں لفظ صبیح
سخن کا نُور ہے وہ، لذتِ بیاں وہ ہے

گوہر ہوشیارپوری

نعت

روحِ تحقیق نے سچ فرمایا
ہر نبی آپؐ کی خوشبو لایا

ہمہ تائیدِ خدا کی تمہید
آپؐ کا سایہ، خدا کا سایہ

آپ کے اسم کی تسمیہ جلی
جہاں قرآں کا ورق اُلٹایا

للہ الحمد محامد کا بیان
بخدا اسم مسمیٰ پایا

ق کے اس طور قریب و اقرب
پؐ کو ہادئ حق ٹھہرایا

رحِ ممدوحِ خدا کی منزل
ج ایمان کہاں لے آیا

نعت

پھر گئی چشمِ زمانہ، مدد دے!
تھامنا سیدِ بطحا! مدد دے!

آپؐ کے نام کے ہیں فریادی
مدد دے، اے شہِ والا، مدد دے!

تیرہ حالی کا ازالہ، چشمے!
صاحبِ مشعلِ فردا، مدد دے!

ملے گم کردہ رہوں کو منزل
ہادئ و رہبر و مولا! مدد دے!

اک طرف بے سر و ساماں اُمّت
اک طرف لشکرِ اعدا، مدد دے!

سایۂ عفو و اماں میں رکھنا
آپؐ کے ہاتھ ہے پردہ، مدد دے!

جبران خلیل جبران ـــــ اور اس کے افکار و رومان

محمد کاظم

جبران خلیل جبران کے نام سے ہمارے اردو قارئین بڑی حد تک آشنا ہیں، اور ہم میں سے بہت سے لوگوں نے
ں زندگی کے کسی نہ کسی دور میں اسے پڑھا بھی ضرور ہو گا۔ "اشک و تبسم"، "ریت اور جھاگ"، "ارضی دیوتا"، "ٹوٹے
ئے پر"، "زرد پتے" اور "دیوانہ" جیسے حزن آمیز اور شاعرانہ عنوانوں والے اس کے چھوٹے چھوٹے کتابچوں نے شاید کبھی
ا دل بھی بہلایا ہو، اور ہمیں کچھ دیر کے لئے حقیقت کی دنیا سے نکال کر تصور و خیال کی دنیا میں لے گئے ہوں جو عمر
ہ ایک حصے میں بڑی خوش آئند لگتی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہم میں سے بہت کم لوگوں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ
ننے اور سمجھنے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ جبران خلیل جبران آخر ہے کون؟ وہ کس طرح کا ادیب ہے؟ اس کا تصورِ
، (World View) کیا ہے؟ اور وہ اپنے پڑھنے والوں کو کس قسم کا پیغام دیتا ہے؟ ـــ نتیجہ یہ کہ اس کی تحریروں کے
ں عام کے باوجود جبران کی شخصیت اور اس کے ادب پر ایک دھند سی چھائی ہوئی لگتی ہے اور لوگ اس بحث میں پڑے
کہ اس کا فکری و تصوراتی نظام کیا ہے اور عربی اور عالمی ادب میں اس کا مقام کہاں متعین ہوتا ہے اسے پڑھتے چلے
تے ہیں۔

جبران خلیل جبران کئی حیثیتوں سے مشہور ہے۔ وہ شاعر بھی تھا۔ افسانہ نگار بھی اور داناؤں اور مفکروں کے لہجے
ں بات کرنے والا ایک مفکر بھی، اور ان سب کے علاوہ وہ ایک اچھا خاصا مصور بھی تھا۔ ادب و فکر کے میدان میں
ان نے اپنا تخلیقی عمل دو زبانوں میں انجام دیا، ایک عربی اور دوسرے انگریزی میں۔ 1902ء میں امریکہ جا کر بسنے کے
پہلے چودہ یا پندرہ برس اس نے جو کچھ بھی لکھا اپنی مادری زبان عربی میں لکھا۔ اس کے بعد 1918ء سے وہ براہ راست
گریزی میں لکھنے لگا اور 1931ء میں اپنی موت تک کے اس تیرہ سالہ عرصے میں اس نے کم و بیش آٹھ کتابچے انگریزی
ن میں تصنیف کئے۔ ان میں سے ایک کتاب The prophet ہے جو 1923ء میں شائع ہوئی اور جس کے متعلق کہا جاتا
ہ کہ 1958ء تک دنیا میں اس کے دس لاکھ نسخے فروخت ہو چکے تھے۔ اب تک اس کتاب کی اشاعت اگر بیس لاکھ سے
وز کر گئی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہو گی۔ اس کتاب کی ہر دلعزیزی اس سے بھی ظاہر ہے کہ اردو میں اس کے
ں ترجمے ہوئے۔ پہلا قاضی عبدالغفار کا "اس نے کہا" کے عنوان سے دوسرا خلیل صحافی کا "مسائل حیات" کے نام سے،
ر تیسرا ترجمہ جو یہاں زیادہ متداول ہے ہمارے دوست اور "فنون" کے سابق مدیر معاون حبیب اشعر دہلوی کا ہے جس کا
ان انہوں نے اصل عنوان کی مطابقت میں "النبی" ہی رکھا۔

جبران کی تقریباً سولہ تصانیف میں سے نصف عربی زبان میں ہیں اور اتنی ہی انگریزی زبان میں! اور یہ سب کی
ب قاضی عبدالغفار، خلیل صحافی، بشیر ہندی اور حبیب اشعر دہلوی کی کاوشوں کے طفیل اردو زبان میں منتقل ہو چکی ہیں اور
ابوں کی دکانوں میں ہمیشہ سے بک رہی ہیں اور پڑھی جا رہی ہیں۔ ویسے اس کا حلقہ قارئین مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا
ہے۔ پشاور سے لے کر کراچی اور آگے مغرب میں دنیا کے آخری سرے یعنی امریکی ریاست کیلیفورنیا تک میں نے

کتابوں کی دکانوں میں جبران کو شیلفوں پر سجے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ عرب دنیا کے کسی بھی ادیب
مصنف کو غیر عرب دنیا میں اتنی شہرت اور پذیرائی حاصل ہوئی ہو جتنی جبران خلیل کو ہوئی ہے۔ اتنے ہر دلعزیز اور بے
پڑھے جانے والے (Best seller) مصنف کے فکر و فن کے بارے میں کیوں نہ آج ہم تھوڑی سی گفتگو کریں ' اور
جاننے کی کوشش کریں کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے ' اور اگر ہو سکے تو اس راز پر سے بھی پردہ اٹھائیں کہ اتنے عرصے
سے اگر وہ مختلف ملکوں اور متعدد زبانوں میں پڑھا جا رہا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے! یہ گفتگو ہم اس کی زندگی کے حالات
سے شروع کریں گے اور پھر بات سے بات نکلتی چلی جائے گی۔

جبران اصلاً ایک عرب تھا جو 1883ء میں لبنان کے ایک گاؤں بشری میں پیدا ہوا جس میں وہ جنگلات آج بھی
موجود ہیں "جن کے مقدس صنوبروں کی لکڑی سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یروشلم میں اپنا معبد تعمیر کرایا تھا۔
لبنانی رواج کے مطابق بچے کا نام اس کے دادا کے نام پر جبران رکھا گیا۔ (اس کے باپ کا نام خلیل تھا) اور مارونی کلیسا
میں اسے بپتسمہ دیا گیا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک طرف تو ترکی خلیفہ سلطان عبدالحمید کی آمرانہ حکومت شام
و لبنان میں تعلیم یافتہ اور آزادی پسند طبقوں کے لئے زندگی مشکل کئے دے رہی تھی ' اور دوسری طرف تجارتی میدان میں
اہل یورپ چھانے لگے تھے اور مقامی لوگوں کے لئے رزق کی راہیں روز بروز تنگ ہونے لگی تھیں۔ حالات کی اس ناسازگاری
سے عاجز آ کر شام و لبنان میں رہنے والے بہت سے افراد نے جن میں ادباء اور شعراء بھی شامل تھے ' اپنے وطن سے ہجرت
کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں سے کچھ لوگ تو مصر میں رک گئے۔ باقی لوگوں نے اپنا سفر جاری رکھا اور آگے امریکہ کی طرف
نکل گئے۔ اس دوسرے گروہ میں جبران خلیل جبران بھی تھا جو ابھی بارہ برس کا لڑکا ہی تھا کہ 1895ء میں اپنی بیوہ ماں
دو بہنوں اور ایک سوتیلے بھائی کے ساتھ بوسٹن میں جا آباد ہوا۔

امریکہ میں وہ کوئی تین سال ہی رہا ہو گا کہ اس نے محسوس کیا کہ اس کی عربی تعلیم ناقص رہ گئی ہے۔ چنانچہ
وہ بیروت واپس آ گیا اور یہاں کے مدرسۃ الحکمت میں عربی اور فرانسیسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور تقریباً پانچ سال بعد
1902ء میں اس نے لبنان کو دوسری مرتبہ خیر باد کہا۔ اس وقت اس کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ ہو گی کہ وہ اسے
وطن سے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ وہ ایک دفعہ پھر بوسٹن آ گیا۔ یہاں پانچ سال رہنے
کے بعد اس کے سر میں مصوری سیکھنے کا سودا سمایا ' اور اس شوق کی تکمیل کے لئے اس نے پیرس کی فنون لطیفہ کی
اکادمی میں داخلہ لیا ' اور تین برس مشہور سنگ تراش روداں (Rodin) کی زیر نگرانی مصوری کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اسی
زمانے میں وہ ایک صدی پہلے کے انگریز شاعر ولیم بلیک سے بھی متعارف ہوا اور عام خیال یہ ہے کہ اس کی شاعری اور
مصوری نے اور اس کے ساتھ مفکر نیطشے کے خیالات و نظریات نے اس ابھرتے ہوئے شاعر اور فنکار پر گہرا اثر ڈالا۔ پیرس
سے واپس آ کر جبران نے نیو یارک میں رہائش اختیار کی اور 1931ء میں اپنی موت تک وہ اسی شہر میں رہا۔

جبران اور اس کے ساتھ بہت سے لبنانی عرب اپنے وطن سے ہجرت کرنے کو تو کر گئے اور امریکہ جا کر بس بھی
گئے۔ لیکن یہاں پہنچ کر اگر انہوں نے ایک طرف آزادی اور زندگی کے کھلے پن کی صورت میں بہت کچھ پایا تو دوسری
طرف بہت کچھ کھویا بھی۔ اتنی دور واقع ایک بالکل نئی دنیا اور اس کے بالکل اجنبی اور بے مروت ماحول میں جا کر انہیں

پنا وطن بری طرح یاد آنے لگا، جو اس زمانے کے سمندری سفر کی وجہ سے ایک ستارے کی طرح دور لگتا تھا۔ اپنی زمین اور
س کی باس، اس کے قدرتی مناظر، اپنی زبان، اپنی تہذیب اور شہر کی گلیوں اور محلوں میں اپنی بولی بولنے والے
گ ـــــ ان سب کی جدائی نے ان کے اندر ایک عجیب اداسی اور ناسٹلجیا پیدا کر دیا۔ چنانچہ اس کا کسی حد تک مداوا
کرنے اور اپنا عربی تشخص برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے وہاں اپنی ایک ادبی انجمن قائم کی اور عربی زبان میں کچھ اخبار
ور رسالے نکالے، جن میں مہاجر برادری کے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ نظم و نثر میں ان کی ادبی تخلیقات بھی شائع
ہونے لگیں۔

شمالی اور جنوبی امریکہ میں جا بسنے والے ان آٹھ یا دس ادباء اور شعراء نے عربی زبان میں جو ادب ان حالات میں
تخلیق کیا اس کا ذائقہ بالکل نیا اور اس وقت کی عام عربی شاعری سے کافی مختلف تھا۔ یہ ادب چونکہ مقدار میں بھی اچھا
خاصا تھا اس لئے اس کا الگ سے ایک نام پڑا ادب المہجر (ہجرت کے دیس کا ادب) اور معاصر ادب کے تذکروں میں اس
کے لئے ایک الگ باب باندھا جانے لگا، اور شعراء المہجر (پردیسی شعراء) اور الشعر المہجری (پردیسی شاعری) کی اصطلاحیں استعمال
میں آنے لگیں۔

مہجری ادباء کے اس حلقے کا سرخیل کوئی شک نہیں جبران خلیل جبران ہی تھا اور اسی نے اپنے خیالات و افکار سے
ان لوگوں میں ایک روح پھونک دی تھی اور ان کے اندر ادب و شعر کی نئی راہوں پر آگے بڑھنے کا ولولہ پیدا کیا تھا۔ لیکن
ایک جبران کی بات یہ ہے، اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، کہ اس کا اپنا ادبی جوہر (talent) ان سب سے کم تر درجے کا
تھا۔ مثلاً اس حلقے کا ایک شاعر ایلیا ابو ماضی آج بھی صف اول کے شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے شاعر نسیب
عریضہ اور رشید ایوب دونوں اس دور میں اپنے اپنے انداز کے اچھے شاعر تھے، جبکہ ان کے مقابلے میں جبران خلیل جبران کی
شاعری موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے اس وقت نئی اور مختلف تو ضرور تھی، لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے خاصی کمزور
تھی۔ جبران کو عربی زبان پر کوئی زیادہ عبور حاصل نہیں تھا۔ اس پر جب اس نے جانتے بوجھتے روایتی اسالیب اظہار سے
اجتناب برتا تو نتیجتاً ایک ایسی شاعری وجود میں آئی جس میں حسن بیان اور بلاغت اظہار کا دور دور پتہ نہیں چلتا ـــــ اسی طرح
نثر میں جبران کا دوست اور سوانح نگار میخائل نعیمہ ایک اعلیٰ درجے کا ادیب تھا۔ اپنے زمانے کے عربی ادب کی تنقید پر اس
نے "الغربال" (چھلنی) کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو بجا طور پر عربی میں جدید تنقید کا نقطہ آغاز قرار دی جاتی ہے۔ اس
کتاب میں ایک صفحے کا ایک مختصر مقالہ بھی ہے جس کا عنوان ہے "فلنترجم" (تو آئیے ہم ترجمہ کریں) یہ اس وقت کے
عرب ادباء کو اس امر کی دعوت تھی کہ بجائے اپنی محدود دنیا میں مگن رہنے کے وہ عالمی ادب کی بہترین تخلیقات کا ترجمہ
کر کے انہیں عرب قارئین کے سامنے پیش کریں تاکہ اس طرح نہ صرف قارئین کا بلکہ عرب اہل قلم کا بھی ذہنی افق
وسیع ہو اور وہ مغربی معیاروں کو سامنے رکھ کر بہتر ادب پیدا کرنے کے قابل ہوں۔ لیکن اس کے مقابلے میں نثر میں
جبران نے جو کچھ لکھا وہ اس اعتبار سے ضرور قابل توجہ تھا کہ اس کے موضوعات نئی قسم کے تھے اور بات کہنے کا انداز ایسا
تھا جو عرب قارئین کے لئے انوکھا اور غرابت آمیز تھا لیکن جہاں تک اس کی نثر کا تعلق ہے وہ کچھ ناہموار اور بے کیف سی
چیز تھی اور کسی طرح بھی اس قابل نہیں تھی کہ اسے جدید عربی نثر کے عمدہ نمونوں کے مقابل رکھا جا سکے۔

یہی وجہ ہے کہ آج سے بہت عرصہ پہلے جب عربی زبان میرا اوڑھنا اور بچھونا تھی اور اس کے قدیم اور جدید ادباء
کی تخلیقات کا مطالعہ میرا دن رات کا شغل تھا، جبران خلیل جبران سے میری کبھی مڈبھیڑ نہ ہوئی۔ وہ جدید عرب ادباء کے

تہ اولیٰ میں تو یقیناً نہیں آتا تھا' حیرت کی بات ہے کہ وہ عرب ادباء کی دوسری صف میں بھی مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔
ں امر کا شعور البتہ مجھے بہت دیر بعد اس وقت ہوا جب میری اپنے ایک پرانے ہم جماعت اور دوست کے ساتھ' جو جبران
لی جبران کی تحریروں کا عاشق تھا' اتفاقاً ایک دور افتادہ شہر میں ملاقات ہوئی۔ اس نے میرے عربی مشاغل کے بارے
ں سن رکھا تھا۔ چنانچہ اپنی گفتگو میں اس نے دوسری بات جو کی وہ جبران خلیل جبران کے بارے میں تھی۔ "تم نے تو
ے اصل عربی میں پڑھا ہو گا "وہ پوچھنے لگا" کتنے خوش نصیب ہو تم' ہاں یہ تو بتاؤ کہ عربی ادب میں اس کا مرتبہ کیا ہے
. عربی بولنے والے ممالک میں وہ کتنا ہردلعزیز ہے۔ اس پر لوگوں نے یقیناً بہت کچھ لکھا ہو گا۔ وہ تم نے پڑھا؟" اس
ہ ان پے در پے سوالوں کے سامنے میں' ایک طرح کے احساس جرم میں گرفتار' ایک عجیب کشمکش و پیچ کی کیفیت میں
ا تھا کہ اگر سچ کہتا ہوں تو میرے دوست کو صدمہ پہنچے گا اور اگر جھوٹ کہتا ہوں تو اسے نبھانا میرے لئے مشکل ہو گا۔
ز میں نے مصلحت کا راستہ اختیار کیا اور کچھ گول مول سے جواب دے کر اس مشکل صورت حال سے نکل آیا۔ یہاں میں
نوع کی مناسبت سے تھوڑی دیر کے لئے کچھ ذاتی قسم کی یادداشتوں کی طرف نکل جانے کی اجازت چاہوں گا۔

میرا یہ دوست' مختار' بہاولنگر میں مجسٹریٹ آ کر لگا تھا' جبکہ میں اس شہر میں بجلی کی تنصیب اور تقسیم کے کام
امور تھا۔ کالج سے نکلنے کے کئی سال بعد ہمیں قسمت نے اس ریگستانی شہر میں لا اکٹھا کیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے ہاں
تے جاتے' دنیا جہاں کی گفتگو کرتے' جس میں جبران خلیل جبران کا ذکر ضرور آتا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو جبران کو
پڑھتے ہیں کہ وہ ان کے حواس پر چھا جاتا ہے اور وہ جب چاہیں اپنے آپ کو جبران کی دنیا میں منتقل کر لیتے ہیں اور
ا کی طرح باتیں کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ میرے اس دوست کو جبران کی کتابوں کے جملے کے جملے اور پورے پورے
گراف تک یاد تھے' جو وہ موقع بموقع ایک کیفیت میں ڈوب کر مجھے سنایا کرتا۔ اپنے دوست کا دل رکھنے کے لئے میں
لبنانی خیال پرست کا کلام بظاہر شوق سے سنتا اور اس کی تعریف بھی کر دیا کرتا۔ اس کے چند ہی سال بعد مختار
ان کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے چل بسا۔ یہ ایک ذاتی صدمہ تھا' ایک ایسے دوست کی جدائی کا جس کی
ہ اور زندگی سے بھرپور شخصیت کا تاثر میرے ذہن میں دیر تک باقی رہا۔ چنانچہ میں نے اپنے اس دوست کا ایک مفصل
لکھا جو "فنون" کی اشاعت جولائی اگست 1966ء میں "ماڈرن قلندر" کے عنوان سے شائع ہوا (یہ نام مختار نے ایک خط میں
، لئے خود ہی تجویز کیا تھا)

میرا دوست ابھی زندہ تھا اور بہاولنگر میں منصفی کرتا تھا جب میں اس شہر سے تبدیل ہو کر سرائے عالمگیر (جہلم)
قریب ایک مقام راجڑ میں آ گیا۔ بہاولنگر سے اب مختار کے خط آنے لگے جو اس کی مخصوص ظرافت اور جبران خلیل
ن کے اسلوب اور لہجے کا ایک عجیب امتزاج ہوتے۔ اپنے اس خاکے میں میں نے اس کے ان خطوط کے کافی اقتباس
، ہیں۔ یہاں صرف اس کے ایک دو خطوں سے لی ہوئی چند سطریں نمونتاً پیش کرتا ہوں۔ غالباً اپنے پہلے ہی خط میں
نے لکھا۔

"--- میں نے نعرہ ہُو لگایا کہ قلندروں کی صفت [illegible] ہے اور اس دوست کے تصور میں کھو گیا جو یہاں کبھی کنار
ر رہتا تھا اور پھل پھول اور مڈے ٹکڑیوں پر گزارا کرتا تھا اور یوں ایک پرسکون ماحول سے ہم آغوش تھا اور اب سرائے
. میں مقیم ہے جہاں سے نجانے تاریخ کی کتنی معلوم و غیرمعلوم شخصیتیں پل بھر کو سستانے کے لئے گزری ہوں
اور عین ممکن ہے کہ اس عظیم برگد کے درخت کے نیچے کبھی لمبی لمبی جٹاؤں والے قلندر نے دھونی بھی رمائی ہو اور

آنکھیں بند کر کے تصور الوہیت میں غرق ہو گیا ہو۔۔۔۔
اسی طرح ایک اور خط میں لکھتا ہے
"موسم خزاں آ گیا ہے۔ مرجھائے ہوئے پتے آوارہ سیاروں کی مانند ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کل کو شاید بہار بھی آ جائے۔ تو پھر کیوں نہ ہم اس سے پیشتر ان مغموم و افسردہ روحوں سے رشتہ گانٹھ لیں جو ہمیں ماورا سے بار بار تک رہی ہیں۔۔۔ میں آج سرِشام ہی اداس ہوں اور آگ کے گرد تنہا بیٹھا کچھ سوچ رہا ہوں۔۔"

مختار تو اس کے چند روز بعد ہی ہمیشہ کے لئے ان مغموم و افسردہ روحوں کے ساتھ جا ملا اور میرے لئے اپنی یادیں چھوڑ گیا۔

مختار کے حالات اور اس کی ان کیفیات سے میں نے یہ جانا کہ جبران خلیل جبران کچھ بھی ہو ' اور وہ ایک بڑا ادیب ہو یا نہ ہو ' اس کی تحریروں میں کوئی ایسی چیز ضرور ہے جو بعض طبائع پر جادو کا سا اثر کرتی ہے اور ان کے سوچنے سمجھنے اور اظہار و ابلاغ پر اپنا پورا تسلط جما لیتی ہے!

اب اس بات کو بھی ایک زمانہ گزر گیا۔ اس دوران میں مجھے جبران خلیل جبران کے چند ایک رسالے اور اس کی شخصیت اور فن کے بارے میں بعض عرب ادباء کی بکھری ہوئی تحریریں پڑھنے کا موقع ملا ہے (۱) اس مطالعے کے نتیجے میں معاملے کا ایک دوسرا رخ سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ آپ جبران کو بڑا شاعر یا صف اول کا ادیب اور مفکر بے شک تسلیم نہ کریں ۔لیکن اس کی شخصیت کا ایک پہلو ایسا ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا ' اور وہ ہے اس کا خاص رویا

---

(۱) ایک قابل افسوس بات یہ ہے کہ جبران خلیل جبران کی زندگی کے موضوع پر پاکستان میں کوئی کام کی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ جبران کے بارے میں پوری طرح جاننے اور پھر وثوق کے ساتھ کچھ کہنے کے لئے میرے خیال میں کم از کم ان چار کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے
1۔ جبران خلیل جبران میخائل نعیمہ (عربی)
2۔ جبران الدکتور جمیل جبر (عربی)
3- Khalil Gibran- His Background, Character and Works by Khalil S. Hawi
4- This man from Lebanon: Jibran Khalil Jibran by Barbara Jung
لیکن ان میں سے کوئی کتاب بھی یہاں پاکستان میں ' یا کم از کم لاہور میں مجھے نہیں ملی۔ پچھلے دنوں جبران کے فن اور شخصیت پر ہندوستان کی ایک یونیورسٹی (علی گڑھ نہیں) میں تیار ہونے والا پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ' جس کا ایک ایڈیشن حال میں پاکستان میں بھی شائع ہوا ہے۔ اس پر ہمارے ایک محترم پروفیسر اور دو قابل ڈاکٹروں کی تعریفی آراء کے باوجود مقالہ بہت مایوس کن ہے اور بچگانہ انداز میں لکھا ہوا ہے۔ جس یونیورسٹی نے اس مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری مرحمت فرمائی ہے اس کی جانچ اور پرکھ کا معیار اگر یہی ہے تو اس کے لئے دعائے خیر ہی کی جا سکتی ہے۔

(vision) اس کی انقلابی سوچ اور اپنے عہد کے مذہبی ، سماجی اور تہذیبی سانچوں کے خلاف اس کی مکمل بغاوت! یہی وہ روح تھی جو جبران نے اپنے مہجری حلقے کے ادباء میں پھونکی تھی اور اس کے طفیل ان کی ادبی اور شعری کاوشوں کے لئے ایک سمت مہیا کر دی تھی جس میں انہیں ایک داعیانہ (missionary) جذبے کے ساتھ آگے بڑھنا تھا۔ چنانچہ مہجری ادب اور شاعری جس نے دیکھتے ہی دیکھتے عرب دنیا میں اپنی الگ پہچان کرا لی تھی اس کی زیریں لہر میں جبران کی یہی انقلابی روح کارفرما تھی۔

اس صدی کی پہلی دو تین دہائیوں میں لبنان اور دوسرے عرب ممالک میں مذہب ، معاشرت اورعلم و ادب پر قدیم روایات اور موروثی اقدار کا کافی تسلط تھا جس کی وجہ سے عام حالات میں ان سے انحراف کرنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جبران خلیل جبران ، جس کی اٹھان ایک خیال پرست اور خواب دیکھنے والے نوجوان کی صورت میں ہوئی تھی اس نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ اپنے مزاج کی خاص افتاد کی وجہ سے اس کے لئے ان پرانی بندشوں کا قیدی بن کر رہنا ممکن نہیں ہو گا۔ چنانچہ اس کی روح ان سے آزاد ہونے کے لئے پھڑپھڑانے لگی۔ پھر جب سیاسی اور معاشی حالات کی ناسازگاری نے ان علاقوں کے لوگوں کی زندگی اور بھی مشکل بنا دی تو جبران اور اس کی طرح کے دوسرے لوگوں نے وطن سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اور سات سمندروں کا سفر اختیار کر کے شمالی اور جنوبی امریکہ میں جا بسے۔ مغربی دنیا کے کھلے ماحول میں پہنچ کر ان لوگوں نے سکھ کا سانس لیا اور پہلی دفعہ آزادی کے مفہوم سے آشنا ہوئے۔ امریکہ میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد ان کے دل میں یہ خیال راسخ ہوا کہ انسان اس دنیا میں آزاد پیدا ہوا ہے اورکسی کو بھی ، چاہے وہ کوئی فرد ہو ، ادارہ ہو یا تنظیم ، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کی زندگی کے لئے حدود اور ضابطے مقرر کرے۔ جبران اور اس کے حلقے کی یہ بغاوت مذہب کے خلاف بھی تھی ، معاشرتی رسوم اور طور طریقوں کے خلاف بھی اور ادب و شعر کی روایتی صورتوں کے خلاف بھی!

جبران خود ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور حضرت مسیح علیہ السلام سے اسے گہری عقیدت تھی۔ لیکن مذہب کی بنیاد پر وہ انسانوں میں تفریق کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اس کے خیال میں سارے مذاہب صحیح اور برحق تھے۔ اس کے نزدیک ساری اہمیت انسان اور اس کے روحانی وجود کی تھی ، چاہے اس کی پرداخت کسی بھی مذہب میں ہوئی ہو۔ وہ ایک جگہ کہتا ہے احبک یا اخی ساجداً فی جامعک راکعاً فی ھیکلک ومصلیاً فی کنیستک ، فانت وانا ابناء دین واحد ھوالروح (میرے بھائی تم چاہے مسجد میں سجدہ کرو یا کسی ہیکل میں جا کے رکوع کرو یا کسی گرجے میں عبادت کرو ، میں تم سے محبت ہی کروں گا' اس لئے کہ تم اور میں ایک ہی مذہب سے جڑے ہوئے ہیں اور وہ مذہب ہے روح کا) مہجری حلقے کا ایک شاعر کہتا ہے :

اصلی لموسیٰ واعبد عیسیٰ واتلوا السلام علی احمد

(میں موسیٰ علیہ السلام پر صلوات بھیجتا ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے جھکتا ہوں اور احمد پر درود و سلام پڑھتا ہوں)

جبران کا یہ نظریہ ظاہر ہے نہ مسیحی لوگوں کے لئے قابل قبول تھا اور نہ اسلام کے ماننے والے اسے پسند کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہر طرف سے اسے طعن وتشنیع کا نشانہ بننا پڑا اور مذہب کے معاملے میں اسے کافر اور بے دین قرار دیا گیا۔

کسی قوم کی معاشرتی زندگی اس کے مذہب اور مقامی رسموں اور رواجوں کے تابع ہوتی ہے۔ جبران جب مذہب کے معاملے میں اتنا آزاد خیال تھا تو وہ معاشرے پر اس کی عائد کردہ پابندیوں کو کیسے قبول کر سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا

کہ صدیوں پرانے طور طریقوں نے انسان کی آزادی کو کچل کر رکھ دیا ہے اور اسے اس مسرت اور سعادت سے محروم کر دیا ہے جو اسے اپنی مرضی کی زندگی بسر کرنے کی صورت میں حاصل ہو سکتی تھی۔ "آزادی" کے علاوہ "محبت" ایک ایسی قدر تھی جس کے اس نے اپنی تحریروں میں سب سے زیادہ گن گائے۔ محبت جو قوموں کے درمیان ہو، مذاہب کے درمیان ہو، افراد کے درمیان ہو، یا ایک مرد اور عورت کے درمیان ہو، اس آخری قسم کی محبت کے موضوع پر اس نے کئی کہانیاں بھی لکھیں۔ اس کا خیال تھا کہ عورتوں پر مردوں کے جبر و تسلط کا کوئی جواز نہیں۔ وہ مردوں کی طرح معاشرے کا اہم فرد ہوتی ہیں اور ان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ مردوں کی طرح انہیں بھی تعلیم دی جائے اور زندگی میں ان کے لئے گھر سے باہر کام کرنے اور اپنی روزی کمانے کے اتنے ہی مواقع حاصل ہوں جتنے مردوں کو ہوتے ہیں، اور انہیں نہ صرف اپنا طرز حیات بلکہ شریک حیات منتخب کرنے کا بھی حق حاصل ہونا چاہئے اور اس میں ان کے والدین یا دوسرے اہل اختیار کے لئے ان پر اپنی مرضی ٹھونسنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ آج کے زمانے میں جبکہ ہر طرف عورت اور مرد کی مساوات کا چرچا ہے اور Feminist تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں، جبران کے یہ خیالات شاید زیادہ انقلابی نہ لگیں، لیکن آج سے ستر یا اسی برس پہلے عورت کی آزادی کے حق میں جبران کی اٹھائی ہوئی یہ آواز بہت زیادہ انقلابی اور چونکا دینے والی تھی۔ مرد و زن کے تعلقات کے بارے میں وہ اتنا آزادی پسند تھا کہ اس کے نزدیک اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا کہ ایک عورت کی شادی اگر اس کے محبوب کی بجائے کسی ناپسندیدہ مرد سے ہو جاتی ہے تو وہ شادی کے بعد چوری چھپے اپنے محبوب سے ملتی رہے۔ اس کا ایک عربی ناول الاجنحۃ المتکسرۃ (ٹوٹے ہوئے پر) جس کے پیچھے دراصل اس کی اپنی ناکام محبت کا تجربہ تھا، اسی موضوع پر ہے، اور اس کی کہانی یہ ہے کہ ایک لڑکی ایک نوجوان سے محبت کرتی ہے جسے اس کا باپ بھی پسند کرتا ہے لیکن حالات سے مجبور ہو کر اس کا باپ اس کی شادی، اس کی مرضی کے خلاف، ایک اسقف (Bishop) کے بدکردار بھتیجے سے کر دیتا ہے۔ تاہم یہ محبت کرنے والا جوڑا لڑکی کی شادی کے بعد بھی، چھپ چھپ کر ایک گرجے میں ایک دوسرے سے ملتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی ملاقاتوں کی بھنک لوگوں کے کانوں میں پڑ جاتی ہے اور ان پر ہر طرف سے انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔ حالات سے خوفزدہ ہو کر یہ بیچارے آئندہ کبھی نہ ملنے کا عہد کر کے ایک دوسرے سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ پانچ سال بعد لڑکی ایک مردہ بچے کو جنم دیتی ہے اور حالت زچگی میں وہ خود بھی موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔ آخری وقت میں وہ اپنے بچے کو خطاب کرتے ہوئے کہتی ہے

"تو تم مجھے لینے آئے تھے۔ میرے لال، مجھے اس اذیت بھری قید سے نجات دلانے، مجھے وہ راستہ دکھانے آئے تھے جو آزادی کے ساحل تک جاتا ہے۔"

جبران کے اس ناول پر جہاں تعریفی تبصرے ہوئے وہاں بہت سے لوگوں نے اس پر یہ اعتراض بھی کیا کہ اس میں جبران نے عائلی زندگی کے تقدس کا مذاق اڑایا ہے اور نوجوان نسل کو یہ حوصلہ دلایا ہے کہ وہ شادی شدہ ہو کر بھی اپنے قبل از ازدواج معاشقے جاری رکھ سکتے ہیں۔

جبران کی انقلابی فکر کا تیسرا ہدف اس صدی کے اوائل میں مروج شعری روایات تھیں۔ جبران اور اس کے ساتھ کے ادیبوں کے لوگوں کو سب سے پہلے عربی ادبیات کے کلاسیکی سانچوں پر اعتراض تھا۔ فصاحت و بلاغت اور زبان و محاورے کی صحت کا "غلغلہ" التزام، تحریر کی آرائش کے لئے تشبیہہ، استعارے، کنایے، تجنیس وغیرہ کا استعمال، ان لوگوں کے لئے یہ ساری تدابیر غیر ضروری تھیں۔ جبران کا خیال تھا کہ انسان اگر نثر میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہے

تو وہ بالکل راست طریقے پر ہونا چاہئے۔ اس کے لئے عربی کے کلاسیکی اور روایتی اسالیب کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح اس وقت کی عربی شاعری پر اس کا اور اس کے حلقے کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ ابھی تک گھسے پٹے موضوعات کی اسیر چلی آتی ہے۔ مثلاً امراء اور سیاسی و مذہبی اکابر کی مدح سرائی ' کسی قومی یا سیاسی واقعے پر ردعمل کا اظہار ' کسی بچے کی پیدائش پر پیغام تہنیت ' ایک دوسرے کی ہجو اور عتاب وغیرہ ' ان کا خیال تھا کہ شاعری کو انسان کے اندرونی جذبات اور خالص احساسات کا ترجمان ہونا چاہئے ۔ مثلاً محبت کے ایک ایسے تجربے کا بیان جو انسان کی پوری شخصیت کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہو ' وطن اور اہل وطن کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار ' کسی انفرادی یا اجتماعی المیے کی داستان ' فطرت کے ساتھ یگانگت اور اس کے مناظر کی تصویرکشی وغیرہ ' اور جب مہجری شعراء کے اس نئے انقلابی رجحان کے نتیجے میں شاعری کے موضوعات بدلے تو قدرتی طور پر شاعری کا اسلوب اور لہجہ بھی بدلا۔ چنانچہ دیکھا گیا کہ ان کے ہاں شاعری کا وہ پہلے والا بلند آہنگ اور خطیبانہ انداز ختم ہوا اور اس کی جگہ ایک نرم ' دھیمی اور نیچے سروں والی شاعری نے جنم لیا۔ ایسی شاعری جس میں لگتا تھا جیسے شاعر اپنے آپ سے یا اپنے کسی دوست یا ہمزاد سے سرگوشی میں ہمکلام ہے۔ عربی ادب کے ایک موقر نقاد محمد مندور نے بجا طور پر مہجر کی اس شاعری کو الشعر المھموس (سرگوشی کی شاعری) کا نام دیا۔ شاعری کے باب میں اس نئے انداز نظر کے ساتھ جب ان لوگوں نے قدیم شعری روایت پر نگاہ ڈالی تو انہیں دور عباسی کے صرف ان شعراء میں دلچسپی پیدا ہوئی جن کا میلان شاعری میں فکر و فلسفہ کی طرف زیادہ تھا۔ چنانچہ ابو العلاء معری ان کا سب سے پسندیدہ شاعر ٹھہرا اور اس حلقے کے ایک شاعر امین الریحانی نے اس کے دیوان "لز و میات" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح انہیں فارسی کا عمر خیام بھی اچھا لگا کہ وہ اپنی رباعیوں میں فلسفہ زندگی کی بات کرتا تھا اور بو علی سینا کی روح کے بارے میں ایک نظم بھی ان کی توجہ کا مرکز بنی۔

مہجر کے ادباء کی شاعری اس اعتبار سے ایک بڑا انقلاب لائی کہ عربی کی کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی شعری روایت میں ہم پہلی بار یہ دیکھتے ہیں کہ ایک نظم میں مرکزی حیثیت مضمون اور خیال کو حاصل ہے اور زبان و بیان اور لفظ و محاورے کی حسن کاری کی اہمیت ثانوی رہ گئی ہے۔ بلکہ بعض شعراء کے ہاں ' اور سب سے زیادہ خود جبران کے ہاں ' اس کی کوئی زیادہ اہمیت باقی ہی نہیں رہتی۔ عربی شاعری کی نسبت سے یہ بے شک ایک انقلابی نظریہ تھا جس کا سہرا ایک بار پھر جبران خلیل جبران کے سر بندھتا ہے۔ اس نظریے کے اثرات معاصر شاعری پر ' نیز بعد میں آنے والے شعراء پر یہاں وہاں ضرور دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن مہجر کے ان انقلابی شعراء کی تخلیقات ' ایک دو شاعروں کو چھوڑ کر ' فن کا کوئی ایسا اعلیٰ معیار پیش نہ کر سکیں کہ وطن عربی میں رہنے والے شعراء کے لئے نمونہ و مثال کا کام دیتیں اور الشعر المہجری کے اثرات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا۔ اُدھر یہ ہوا کہ دو عالمی جنگوں کے درمیانی عرصے میں وقت اور حالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے زیر اثر سب عرب ممالک میں شاعری کے موضوعات اور مضامین میں ایک نمایاں تبدیلی آتی چلی گئی اور اس میں زبان کے کلاسیکی نمونوں کے احیاء کے ساتھ ساتھ فکر و احساس کا عنصر بھی زیادہ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں مصر و شام اور لبنان و عراق سے تعلق رکھنے والے ایسے شعراء ہمارے سامنے آتے ہیں جو ہر اعتبار سے اہم اور قد آور تھے ۔ احمد شوقی ' حافظ ابراہیم اور خلیل مطران جیسے لوگوں کی شاعری میں فکر و خیال اور جذبے اور احساس کی توانائی تو ہے ہی اس کے ساتھ اس میں زبان و بیان کا بھی ایسا اعلیٰ معیار دیکھنے میں آتا ہے کہ دور عباسی کے اکابر شعراء کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کے شعری جینئس کے سامنے مہجر کے شعراء کم مایہ اور اوسط درجے کی چیز (mediocre) دکھائی

دیتے ہیں۔ مہاجر شعراء کی نئی سوچ اور ان کا انقلابی نظریہ اپنی جگہ لیکن اگر وہ "لفظ" کی اہمیت سے اتنا اعراض نہ برتتے اور بلاغت اظہار کی سحر آفرینی سے آنکھیں بند نہ کر لیتے تو ان کے شعری نظریات زیادہ مقبول اور ان کے اثرات بہت دور رس ہوتے۔

شاعر بن ہیں جبران خلیل جبران کی نظم "المواکب" (قافلے) اور نثر میں اس کی کتاب "The Prophet" (النبی) کے بارے میں اتنا کچھ کہا گیا ہے کہ ایک لحاظ سے یہ دونوں اس کی نمائندہ تخلیقات قرار دی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے ان دونوں شاہکاروں کا ایک مختصر سا جائزہ یہاں پیش کر دیا جائے۔

نظم "قافلے" اپنی ہیئت میں یقیناً جدید ہے اس لئے کہ اس میں شاعر نے ایک ہی قافیے کا التزام نہیں کیا بلکہ نظم کے مختلف بندوں (Stanzas) میں یہ قافیہ بدلتا چلا جاتا ہے۔ اپنے خیالات اور موضوعات میں یہ نظم فلسفیانہ ہے جس میں شاعر مابعد الطبیعاتی اور اخلاقی امور سے بحث کرتا ہے مثلاً خیر و شر کا مسئلہ، روح اور جسم کا رشتہ، مسرت کی حقیقت کیا ہے؟ معاشرتی اور سیاسی تنظیمیں کیوں ہیں اور کیسی ہیں، اور انسان نے انسان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا ہے وغیرہ اور اس نظم کے سارے فلسفے کا لب لباب یہ ہے کہ اے انسانو! آؤ ہم فطرت کی طرف واپس چلیں اور اس زندگی کے فتنہ و فساد اور ہنگاموں کو چھوڑ کر "جنگل" کی راہ لیں۔ عربی میں وہ اس کے لئے الغاب کی اصطلاح استعمال کرتا ہے جس کے معنی جنگل اور بیابان کے ہیں۔ نظم کا عنوان "قافلے" اس مناسبت سے ہے کہ ایک بند کے بعد دوسرے بند میں انسانیت کی اس ساری جدوجہد اور تگ و تاز کی تصویر پیش کی گئی ہے جو وہ مسرت کی تلاش میں ازل سے کئے چلی آ رہی ہے لیکن ہمیشہ صحیح راستے سے بھٹکی ہی رہی ہے، اس لئے کہ صحیح راستہ تو وہی ہے جو فطرت کی طرف یا دوسرے الفاظ میں "جنگل" کی طرف جاتا ہے زندگی کی کشاکش سے دور ایک پرسکون گوشہ امان کی جانب!۔۔۔ زندگی کا یہ پرسکون گوشہ امان بڑی اچھی چیز ہے۔ یہ مجھے بھی مطلوب ہے اور یقیناً آپ کو بھی مطلوب ہو گا۔ لیکن یہ ہے کہاں؟ اور کیا آج کی زندگی میں کہیں کوئی ایسا گوشہ موجود ہے جہاں ہماری رسائی ہو سکے؟ یہ سوال جبران کے زمانے میں بھی شاید اٹھا ہو، لیکن آج کی دنیا میں تو یہ سوال بالکل بنیادی اور برمحل ہے۔ اس اعتبار سے یہ نظم اپنے پیغام میں سراسر رومانی ہے اور زندگی کے بارے میں ایک بالکل ہی سادہ اور مبتدیانہ فلسفہ پیش کرتی ہے۔ نظم کے آغاز میں ایک بگڑے ہوئے انسانی معاشرے کی تصویر کشی کی گئی ہے جس میں ہر طرف ظلم اور بے انصافی کا راج ہے۔ انسان آقاؤں اور غلاموں اور حاکموں اور محکوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد تقابل کے طور پر فطرت کا بیان ہوتا ہے جس میں تمام جاندار برابر ہوتے ہیں اور ان میں آقا اور غلام اور حاکم و محکوم کی تفریق دیکھنے میں نہیں آتی۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کی اقلیم اگر "جنگل" ہے تو اس کا قانون تو یہ ہے کہ ہر چھوٹا جاندار اپنے سے بڑے اور طاقتور جاندار کی خوراک بنتا ہے۔ ایسا جنگل (الغاب) اس ارضی اور حقیقی دنیا میں کہاں واقع ہے جہاں شیر اور ہرن امن و آشتی کے ساتھ اکٹھا رہتے ہوں گے۔ جہاں عقاب فاختہ پر نہیں جھپٹتا ہو گا اور شارک مچھلی چھوٹی مچھلیوں سے تعرض نہیں کرتی ہو گی، ۔۔۔ بہرحال شاعر اپنی نظم کے ہر بند میں انسانی معاشرے کی المناک خامیوں اور کوتاہیوں، اور اس کے مقابلے میں فطرت کی کامل اور اکمل حالت کا خوبصورت نقشہ کھینچتا چلا جاتا ہے جہاں خیر

ر ، محبت اور نفرت ، روح اور جسم ، روشنی اور ظلمت اور ایمان اور کفر کے درمیان کوئی جنگ اور پیکار نظر نہیں آتی حتیٰ کہ موت اور حیات جاوداں بھی ایک دوسرے سے مختلف دکھائی نہیں دیتیں۔ شاعر کے نزدیک ایک انسان جو فطرت کی ش میں زندہ رہنے کا خواب دیکھتا ہے ایک طرح سے پیغمبر ہی ہے۔

فان رایت اخا الاحلام منفرداً
عن قومه وهو منبوذ و مختصر
فهو النبی و برد الغیب یحجبه
عن امة برداء الامن تأتزر
وهو الغریب عن الدنیا و ساکنها
وهو المجاهر لام الناسُ او عذروا

"پس تو اگر خواب دیکھنے والا کوئی ایسا شخص پائے جو اپنے لوگوں سے الگ تھلگ ہو اور ان کی حقارت کا نشانہ بنا ۔تو سمجھ لو کہ وہ نبی ہے اور آنے والے کل کی چادر نے اسے یوں ڈھانپ رکھا ہے کہ اس کی عافیت پسند قوم اسے دیکھ ں پا رہی۔ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اجنبی ہے اور لوگ چاہے اسے ملامت کریں یا چھوڑ دیں وہ اپنی بات کہہ ے رہتا ہے"

چنانچہ جبران اپنی اس نظم میں تمدنی زندگی کے مسائل اور پیچیدگیوں سے بغاوت کر کے انسان کو اس قدیم دگی اور ابتدائی معصومیت کے دور کی طرف واپس لے جانا چاہتا ہے جہاں سے اس نے تہذیب و عمران کی طرف قدم مایا تھا۔

جبران کی یہ نظم "المواکب" اس وقت پوری شکل میں میرے سامنے نہیں ہے کہ میں اس کے فنی پہلوؤں پر ونی تفصیلی رائے دے سکوں۔ تاہم اس کے جتنے اشعار بھی میں نے حوالوں کی صورت میں اس عرصے میں دیکھے ہیں ان ں شاعری کا کوئی اعلیٰ معیار سامنے نہیں آتا۔ نہ صرف ان کی زبان کمزور اور بے کیف ہے بلکہ ان میں جو بات کہی گئی ہے ، بھی بالکل سادہ اور سپاٹ ہے۔ مثلاً ایک جگہ شاعر کہتا ہے :

احن الی الغاب حیث الشرور
هنالک نیر انها خامده
احن الی حیث لا یجلس الغدر
قرب الوفاء الی المائده

مجھے اس جنگل کی آرزو ہے جہاں فتنوں کی آگ بجھی ہوئی ہے" (جنگل میں فتنے تھے ہی کب کہ ان کی آگ اب بجھی ہوئی ہے)

"مجھے ایسے جہاں کی آرزو ہے جہاں غداری اور وفاداری ایک دستر خوان پر جمع نہیں ہوتے"

ں طرح کے اشعار کو سامنے رکھیں تو مہجر کے شعراء کے بارے میں طہٰ حسین کی یہ رائے سب سے زیادہ خود جبران خلیل بران کے بارے میں صحیح لگتی ہے کہ

ان لوگوں کا ذہن زرخیز ہے ، ان کے اندر جوہر بھی ہے ، ان کے تصور کی پرواز بھی دور تک ہے اور ان میں اچھا شاعر بننے

کے سارے لوازم موجود ہیں۔ لیکن انہوں نے اس "وسیلے" (یعنی لفظ) میں کوئی مہارت پیدا نہیں کی جس کے بغیر شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ یا تو وہ عربی زبان سے نابلد ہیں۔ یا پھر انہوں نے جان کر اسے نظر انداز کیا ہے اور اس معاملے میں اپنی کوتاہی کو ایک "جدید اسلوب" کا نام دے کر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے"

جبران خلیل جبران کا دوسرا شاہکار انگریزی میں لکھی ہوئی اس کی طویل مختصر کہانی The Prophet (النبی) ہے جو عالمی سطح پر بہترین بکنے والی کتابوں (best sellers) میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ المصطفیٰ نامی ایک حکیم فرزانہ جو "لوگوں میں محبوب بھی تھا اور منتخب بھی" بارہ برس تک ایک شہر اور فالیس میں اپنے جہاز کا انتظار کرتا ہے جسے ایک دن واپس آ کر اسے ایک چھوٹے سے جزیرے کی طرف لے جانا ہے جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ ایک زمانے کے بعد آخر ایک دن انتظار کی گھڑیاں ختم ہوتی ہیں اور وہ ایلول (ستمبر) کے ساتویں دن شہر کے باہر پہاڑی پر چڑھ کر سمندر کی طرف نظر کرتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کا جہاز کہر کی دھند میں لپٹا چلا آ رہا ہے۔ وہ خوش ہوتا ہے اور اس کے دل کے دروازے کھل جاتے ہیں لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر اداس ہو جاتا ہے۔ "میں یہاں سے مسرور اور بے غم کیونکر جا سکوں گا؟" وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے ' اس لئے کہ بارہ طویل برس اس نے اس شہر کی پناہ میں گزارے تھے اور دکھ کے دن اور تنہائی کی راتیں کاٹی تھیں" اور کون ہے جو اپنے دکھ اور تنہائی سے رخصت ہو اور اس کا دل رنج اور مایوسی سے نہ دھڑکے۔" جب وہ اپنے سفر پر روانہ ہونے کے لئے شہر میں داخل ہوتا ہے تو سارے شہر والے اس سے ملنے نکل آتے ہیں اور شہر کے بڑے بوڑھے اس کی طرف بڑھ کے کہتے ہیں "اتنی جلدی ہم سے رخصت نہ ہو اس لئے کہ تو ہمارا جیتا بیٹا ہے جس پر ہماری روحیں فریفتہ ہیں" اسی طرح دوسرے لوگ ' مختلف طبقوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے ' سب اس سے ٹھہرنے کی التجا کرتے ہیں۔ پھر ہیکل کے ایک گوشے سے ایک کاہنہ نکلتی ہے جس کا نام المترا ہے۔ وہ اسے بڑی گرمجوشی سے سلام کرتی ہے اور کہتی ہے کہ تمہیں ایک دن اپنے وطن پر لوٹنا ہی تھا۔ سو ہم تمہارے قدموں کی زنجیر نہیں بن سکتے۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اپنی روانگی سے پہلے تو ہم سے چند باتیں کر لے۔ چنانچہ اب شہر کے مختلف لوگ باری باری اس سے سوال کرتے ہیں اور وہ ان کے سوالوں کا جواب دیتا ہے۔ سوالات کچھ اس طرح کے ہیں

— المترا نے کہا "ہمیں محبت کے متعلق کچھ بتا"۔

— المترا کا دوسرا سوال تھا "اور شادی کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے میرے آقا"

— ایک عورت نے جو بچے کو چھاتی سے لگائے تھی کہا "ہمیں بچوں کے متعلق کچھ بتا"

— پھر ایک کسان نے کہا "ہمیں غم اور خوشی کے بارے میں کچھ بتا"

اسی طرح کوئی چھبیس کے قریب موضوعات ہیں جن کے بارے میں لوگ سوال کرتے ہیں اور مرد دانا ان سب کا جواب دیتا ہے۔ یہ جواب جو اس زندگی کے گوناگوں مسائل و معاملات کے بارے میں دئے جاتے ہیں ' یہ جبران خلیل جبران کی فکر بھی ہے۔ فلسفہ بھی ہے ' ادب بھی ہے اور شعری اظہار بھی' یہ فکر و فلسفہ اور شعری اظہار کس انداز کا ہے ' اس کے کچھ نمونے یہاں دیکھتے چلتے ہیں

"المترا نے کہا ہمیں محبت کے متعلق کچھ بتا

اس نے اپنا سر اٹھایا اور لوگوں کی طرف دیکھا۔ مجمع پر خاموشی طاری ہو گئی اور اس نے گہری آواز میں کہا " جب محبت تمہیں بلائے تو اس کے پیچھے جاؤ۔ اگرچہ اس کی راہیں کٹھن اور دشوار ہوتی ہیں ' اور جب وہ تمہیں اپنے پروں میں

لپیٹے تو خوشی سے لپٹ جاؤ ' چاہے اس کے پروں میں چھپی ہوئی تلوار تمہیں زخمی ہی کیوں نہ کر دے ' اور جب وہ تم سے بات کرے تو اس کا یقین کرو ' چاہے اس کی آواز تمہارے خوابوں کو مسمار ہی کیوں نہ کر دے ' جس طرح باد شمال باغ کو اجاڑ دیتی ہے----"

کیا سمجھے؟ سوال محبت کے بارے میں تھا کہ یہ کیا بلا ہوتی ہے ' اور جواب یہ ملتا ہے کہ یہ بلا جب تم سے چمٹ جائے تو تمہیں چاہئے کہ ہتھیار ڈال دو اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو۔

"المترا کے ہونٹ دوبارہ جنبش میں آئے اور اس نے کہا : اور شادی کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔
میرے آقا! اور اس نے جواب میں کہا : تم ایک ساتھ ہی پیدا ہوئے تھے اور ایک ساتھ ہی ہمیشہ رہو گے اور جب موت اپنے سفید پر پھیلا کر تمہاری خاکستر حیات کو اڑا دے گی تو اس وقت بھی تم ساتھ ہی رہو گے۔ ہاں تم ساتھ رہو گے۔ یہاں تک کہ اللہ کے گمبھیر حافظے میں بھی' لیکن تمہیں اپنے وصل میں کچھ فصل بھی رکھنا چاہئے تاکہ آسمان کی ہوائیں تم دونوں کے درمیان رقص کر سکیں۔ تم ایک دوسرے سے ضرور محبت کرو ' لیکن محبت کو زنجیر نہ بناؤ---"

جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ شادی کی حقیقت اور اس سے وابستہ تصورات (Concepts) کا بیان نہیں ہے بلکہ شادی کو کامیاب اور دیرپا بنانے کے کچھ نسخے ہیں جو میرے خیال میں بہت صحیح اور کارآمد ہیں۔ مثلاً یہ کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے کچھ عرصے کے لئے الگ بھی ہو جایا کریں تاکہ ہجر کے بعد جو وصل ہوتا ہے اس کا لطف اٹھا سکیں اور دوسرے یہ کہ محبت کے معاملے میں اپنے ساتھی کو آزاد چھوڑ دو ' اسے باندھ کر نہ رکھو ' ورنہ اس کا دم گھٹنے لگے گا وغیرہ۔
بران کے الفاظ میں "ایک دوسرے کے ساتھ گاؤ ناچو اور خوشیاں مناؤ ' لیکن ایک دوسرے سے آزاد بھی رہو۔"

"ایک عورت نے کہا ہمیں غم اور خوشی کے بارے میں کچھ بتا۔
مصطفیٰ نے کہا . تمہاری خوشی ہی تمہارا غم ہے جس کے چہرے سے نقاب اٹھا دی گئی ہے۔ وہی کنواں جس سے تمہارے قہقہے بلند ہوتے ہیں بسا اوقات تمہارے آنسوؤں سے لبریز ہوا ہے----

تم میں سے بعض کہتے ہیں مسرت غم سے بہتر ہے اور بعض کہتے ہیں نہیں غم بہتر ہے۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں . وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ وہ ساتھ آتے ہیں۔ ان میں سے ایک جب تمہارے دسترخوان پر ہو تو یاد رکھو دوسرا تمہارے بستر میں ہو گا--- یقین جانو ترازو کے پلڑوں کی طرح تم اپنی خوشی اور اپنے غم کے درمیان معلق ہو---- اور زندگی کا خزانہ دار۔ خدا۔ اپنا سونا اور اپنی چاندی تولنے کے لئے تمہیں اٹھاتا ہے تو لازمی طور پر تمہاری خوشی یا تمہارے غم کے پلڑے جھک جاتے ہیں یا اٹھ جاتے ہیں۔"

"ایک شاعر نے کہا . ہمیں حسن کے متعلق کچھ بتا
اور مصطفیٰ نے جواب دیا . تم حسن کو کہاں ڈھونڈو گے اور کیسے پاؤ گے ' جب تک وہی تمہیں رستے میں نہ ملے اور تمہاری رہنمائی نہ کرے اور تم کیسے اس کی باتیں کرو گے جب تک وہی تمہاری گفتگو کا تانا بانا نہ بنے۔
نحیف اور درماندہ کہتا ہے حسن ایک دھیمی اور نرم و نازک آواز ہے جو ہماری روحوں سے سرگوشیاں کرتی ہے۔
رات کے وقت شہر کا چوکیدار کہتا ہے . حسن صبح کے ساتھ مشرق سے طلوع ہو گا۔

اور دوپہر کے وقت مزدور اور مسافر کہتے ہیں : ہم نے اسے غروب کے دریچوں سے زمین کو جھانکتے دیکھا ہے۔
ہاں یہ ساری باتیں حسن کے متعلق تم کہتے ہو لیکن یہ سچ ہے تم حسن کی بات ہی کب کرتے ہو، تم ان ضرورتوں

ذکر کرتے ہو جو پوری نہیں ہوئیں، اور حسن ضرورت نہیں، ایک کیف ہے ــــــ
اے اورفالیس کے رہنے والو! حسن زندگی ہے۔ وہ زندگی جو اپنے نورانی چہرے سے نقاب اٹھا دے اور تم زندگی اور تمہی نقاب! حسن ابدیت ہے جو اپنا عکس اپنے آئینے میں دیکھتا ہے اور تمہی ابدیت ہو اور تمہی آئینہ"
اس طرح کی باتیں ہیں جو اور فالیس والوں کو اپنے سوالوں کے جواب میں اس حکیم فرزانہ سے سننی پڑتی ہیں!
اب ہم اصل کہانی کی طرف واپس آتے ہیں۔ المصطفیٰ اور اہل اور فالیس کے درمیان جب سوال و جواب کا یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ عبادت گاہ کی سیڑھیوں سے اترتا ہے اور اپنے جہاز کا رخ کرتا ہے۔ لوگ اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ وہ اپنے جہاز پر سوار ہو جاتا ہے اور اس کے عرشے پر کھڑے ہو کر مجمع پر دوبارہ نگاہ ڈالتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے اپنے اسی فلسفیانہ انداز میں ایک اور لمبی تقریر کرتا ہے اور آخر میں وہ لوگوں کو الوداع کہہ کے ملاحوں کو اشارہ کرتا ہے۔ ملاح اسی وقت لنگر اٹھا دیتے ہیں اور جہاز مشرق کی طرف حرکت کرنے لگتا ہے اس موقع پر کتاب کے اختتامی جملے یہ ہیں۔

"لوگوں کی چیخیں بلند ہوئیں، گویا وہ ایک ہی دل سے اٹھ رہی ہوں اور اول شب کی ظلمتوں کو چیرتی ہوئی سمندر کی سطح پر سے گزر گئیں۔ ایک المترا تھی جو خاموش کھڑی جہاز کو تکتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ کہر میں تحلیل ہو گیا۔ مجمع منتشر ہو گیا لیکن وہ دیر تک ساحل پر کھڑی رہی۔ اس کے دل میں جانے والے کے یہ الفاظ گونج رہے تھے "ہاں چند ہی روز بعد جب میں ہوا کے دوش پر تھوڑی دیر آرام کر چکوں گا، ایک اور عورت مجھے اپنے گربہ میں پالے گی"
اصل انگریزی الفاظ یہ ہیں

" A little while, a moment of rest upon the wind, and another woman shall bear me.

یہ جبران خلیل جبران کے اس شاہکار کے کچھ نمونے ہیں جس کے بیس لاکھ یا اس سے زیادہ نسخے اب تک دنیا میں فروخت ہو چکے ہیں۔ اوپر کے یہ اقتباسات پڑھ کر یہ جان لینا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ جبران نے یہ کہانی نیطشے کے "زرتشت نے کہا" کو سامنے رکھ کر لکھی تھی۔ فرق یہ ہے کہ جہاں نیطشے کے ہاں فکر و فلسفے کی گہرائی ہے وہاں جبران کی کہانی پر رومانی طرز فکر اور جذبہ و شعریت کا غلبہ ہے۔ اگر جبران کے مداحین برا نہ مانیں تو مجھے یہ "النبی" اپنے نام نہاد فکر و فلسفے اور اپنے حکیمانہ اور شاعرانہ لحن کے باوجود ایک نہایت مضحکہ خیز کہانی لگتی ہے۔ اس کے آخری حصے کا منظر پڑھتے ہوئے مجھے ایک پرانی ہندوستانی فلم یاد آ گئی، جس کے اسی طرح کے رومان میں ڈوبے ہوئے ایک منظر میں ہیرو ایک آبادی سے رخصت ہو رہا ہے اور آبادی کے لوگ جو اسے الوداع کہنے آئے ہیں، افق کی طرف ہاتھ پھیلائے یک زبان ہو کر گا رہے ہیں اور دو، جانے والے، ہم کو بھی ساتھ لے لے، ہم رہ گئے اکیلے ــــ"
ــــ یہ کہانی دراصل جبران خلیل جبران کا خواب تھی۔ اسے نیویارک میں رہتے ہوئے بارہ برس ہو چکے تھے جب اس نے The Prophet لکھی، اور اس کے دل کے نہاں خانے میں یہ امید ہمیشہ چٹکیاں لیتی تھی کہ کوئی سبب تو ایسا بنے گا کہ ایک دن غیب سے ایک جہاز نمودار ہو گا اور وہ اسے اپنے وطن واپس لے جائے گا۔ اپنے وطن لبنان کو لوٹنے کی خواہش کبھی اس کے دل سے جدا نہ ہوئی تھی۔ "النبی" کی اس غیر معمولی ہر دلعزیزی کے بارے میں سوچنے والوں نے بہت سوچا ہے، لیکن سوائے ایک دو باتوں کے اس کی کوئی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک تو یہ کہ "النبی" کا اسلوب اور اس کا انداز تکلم انجیل مقدس کے اسلوب پر ڈھالا گیا ہے۔ اس طرح کے پیغمبرانہ لہجے میں جب بھی بات کی جائے گی تو اس کا

مضمون چاہے پامال ہی کیوں نہ ہو، اس کا پڑھنے والے کے دل پر ایک خاص اثر پڑتے گا۔ دوسرے یہ کہ کہانی رومان پسند اور خیال کی دنیا میں رہنے والے انسانوں کو اپنے دل کی بات لگتی ہے، اور روزمرہ کی ارضی حقیقتوں کی تفسیر ایسے مبہم اور خوابناک الفاظ میں کرتی ہے کہ انسان ان کی ظاہری دانائی اور نغمگی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر اس کہانی میں امید کا ایک اشارہ (note) بھی ہے کہ تمہاری زندگی میں انتظار کا عرصہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو ایک دن ایسا جہاز آنے گا جو تمہیں تمہارے خوابوں کے جزیرے تک لے جانے گا۔

جبران خلیل جبران کی زندگی میں کئی عورتیں آئیں۔ ان میں سے کم از کم پانچ نام ایسے ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے ساتھ جبران کا کسی نہ کسی درجے میں جذباتی رشتہ استوار ہوا۔ لیکن صنف مخالف کے کسی فرد کے ساتھ بھرپور محبت یا جنسی تعلق کا کوئی نشان اس کی زندگی میں نہیں ملتا۔ سب سے پہلے اس کا جذباتی رشتہ لبنان کی ایک لڑکی "حلا" کے ساتھ قائم ہوا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ اپنی عربی استعداد کی تکمیل کے لئے امریکہ سے لبنان آیا ہوا تھا۔ جبران نے اس لڑکی کا رشتہ مانگا لیکن اسے انکار ہو گیا۔ اس طرح جبران کے دل پر وہ چوٹ پڑی جس نے اس سے الاجنحۃ المتکسرۃ (ٹوٹے ہوئے پر) جیسی کہانی لکھوائی۔ جبران کی زندگی میں دوسری لڑکی فرانس کی "میشلین" تھی۔ آپ نے اس کے ساتھ بھی اظہار عشق فرمایا لیکن اس تعلق کے بارے میں کوئی زیادہ معلومات میرے سامنے نہیں ہیں۔ تیسری لڑکی امریکہ کی "میری ہیسکل" تھی جسے جبران نے شادی کا پیغام دیا۔ لیکن کسی وجہ سے یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھی۔ چوتھی لڑکی ایک لبنانی ادیبہ "مئ زیادہ" تھی۔ اس کے ساتھ جبران کی طویل خط و کتابت تو رہی لیکن وہ کبھی ایک دوسرے سے مل نہ پانے۔ جبران مئ کے نام اپنے خطوں میں محبت کا بہت ذکر کرتا ہے اور می سے ملاقات کی خواہش کا اظہار بھی کرتا ہے جس کا تصور وہ اس طرح باندھتا ہے کہ "کاش میں مصر میں یا اپنے وطن میں بیمار ہوتا کہ اس طرح اپنے پیاروں کے قریب تو ہوتا۔ کیا تم جانتی ہو مئ کہ ہر صبح اور ہر شام میں اپنے آپ کو قاہرہ کے کسی گھر میں یوں لیٹا ہوا دیکھتا ہوں کہ تم میرے سامنے بیٹھی ہو اور میرا تازہ مضمون پڑھ رہی ہو یا اپنی کوئی ایسی چیز مجھے سنا رہی ہو جو ابھی شائع نہیں ہوئی" جبران کے سوانح نگار اس مخمصے میں مبتلا رہے ہیں کہ جب اس کے اور می کے درمیان ایسا گہرا جذباتی اور ذہنی رشتہ تھا جو اٹھارہ برس کی طویل مدت تک قائم رہا اور جس کا احوال ان کی مراسلت سے ملتا ہے تو انہوں نے اس سارے عرصے میں ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کیوں نہ کی، پانچویں لڑکی جو جبران کی زندگی میں آئی وہ امریکہ کی "بار برابنگ" تھی جو اس کی زندگی کے آخری سات برسوں میں اس کے بہت قریب رہی اور جس نے شہر شہر پھر کر اس کی کتابوں اور اس کے پیغام کو امریکی لوگوں تک پہنچانے کے لئے بڑا کام کیا۔ یہ لڑکی جبران کی مصوری کی بھی دلدادہ تھی اور جبران کی باتیں سننے اور اس کی تیمار داری کرنے کے لئے دن رات کا بڑا حصہ اس کے پاس گزارتی تھی۔۔۔۔۔ ان میں سے پہلی لڑکی "حلا" کو چھوڑ کر باقی چار لڑکیوں کے ساتھ جبران کے تعلقات میں مجھے وہ گرمی اور شدت دکھائی نہیں دیتی جو ایسے حالات میں ایک صحت مند مرد میں پائی جانی چاہئے۔ امریکی لڑکی میری ہیسکل کے ساتھ اس نے جس شادی کی تجویز کی وہ مجھے لگتا ہے زیادہ تر کاروباری اور سماجی مقاصد کے لئے تھی۔۔۔۔۔ کچھ عرصہ ہوا کراچی میں چند ادیبوں اور شاعروں کی ایک چھوٹی سی محفل میں میں نے

ذکر کیا کہ جبران خلیل جبران کی کتاب The Prophet میں اس کی مصوری کے کچھ نمونے بھی شامل ہیں جن میں لباس سے عاری مرد و زن ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں لیکن ان کے جنسی اعضاء پر اس طرح برش پھرا ہوا ہے کہ وہ بالکل دکھائی نہیں دیتے۔ یعنی اس علامتی صورت میں بھی نہیں جو میکلانجلو کے مجسموں میں نظر آتی ہے۔ اس پر محمد خالد اختر بولے "اس لئے کہ جبران کے اپنے جنسی اعضاء بھی نہیں تھے۔" ـــ کہنے کو یہ ایک مزاحیہ اور شرارت بھرا (flippant) قول تھا، لیکن اس کے مفہوم پر اگر آپ غور کریں تو لگے گا کہ جبران خلیل جبران کے جذباتی رشتوں اور محبت کے موضوع پر اس کی کہانیوں میں جسمانی حقیقتوں سے فرار کی جو روش دکھائی دیتی ہے تو کچھ عجیب نہیں کہ اس کے پیچھے اس کی اسی نوع کی کوئی کمزوری ہو۔

اس بحث کے آخر تک آتے آتے میرا خیال ہے ہم جبران خلیل جبران کے بارے میں چند ایک باتیں قدرے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں

پہلی یہ کہ جبران طبعاً ایک رومان پسند اور تخیل پرست انسان تھا، جو اس دنیا میں ہر طرف امن محبت اور آشتی دیکھنا چاہتا تھا لیکن اپنے اردگرد کی مشینی اور صنعتی زندگی میں جب اسے یہ سب کچھ نہیں ملتا تھا تو وہ انسانوں سے کہتا تھا کہ آؤ اس تمدنی زندگی کو چھوڑ کر "جنگل" کی طرف نکل جائیں، جہاں امن ہو گا، سکون ہو گا اور کوئی کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ اس کے نزدیک اس زندگی میں "محبت" ایک بڑی قدر تھی۔ اس موضوع پر اس نے بہت کچھ کہا اور کہانیاں بھی لکھیں، جن کا تانا بانا اس نے سراسر رومانی نقطہ نظر اور انسانی المیے سے ترتیب دیا۔ چنانچہ ان کہانیوں میں دکھ ہے، جدائی ہے، موت ہے، آنسو ہیں اور قبریں ہیں اور یہ باتیں نوجوان دلوں پر بہت اثر کرتی ہیں۔

دوسری یہ کہ جبران اس کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ رؤیا (visionary) اور باغیانہ میلان رکھنے والا ایک مفکر بھی تھا۔ مذہب، معاشرت اور ادب و فن کے بارے میں اس نے ستر اسی برس پہلے جو نظریات پیش کئے اتنا زمانہ گزر جانے پر وہ آج بھی نئے اور انقلابی قرار پائیں گے۔ مثلاً اس کا یہ قول کہ سب مذاہب سچے ہیں اور ان کی وجہ سے انسانوں میں تفریق نہیں کی جانی چاہئے، آج بھی ایسا ہے کہ بہت کم لوگ اس کی حمایت میں کھڑے ہونے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ جبران کے ان انقلابی نظریات کا عرب معاشروں پر اثر ضرور ہوا لیکن ایک محدود پیمانے پر، جبران کو اگر اس انقلابی سوچ کے ساتھ ساتھ اظہار و ابلاغ کی قوت بھی عطا ہوتی اور عربی نثر اور شاعری میں وہ ایک طاقتور اور قائل کرنے والا اسلوب لے کر آتا تو اس کے یہ نظریات زیادہ مقبول ہوتے اور شاید عربوں کی زندگی اور رہن سہن پر ان کے اثرات دیکھے جا سکتے۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر ہوا جبران کا عربی محاورہ اور اظہار نثر میں بھی اور شاعری میں بھی، اوسط درجے کا تھا، اور ایک اوسط درجے کے اظہار سے ذہنوں کو زیادہ متاثر نہیں کیا جا سکتا۔

تیسری بات یہ کہ جبران خلیل جبران نے اپنے عربی اسلوب کی کمزوری کا مداوا، بہت ہوشیاری اور دانشمندی کے ساتھ، یوں کیا کہ انجیل کے خاص اسلوب بیان کو اپنے لئے نمونہ ٹھہرایا اور اپنی سب تحریروں اور کہانیوں میں انجیلی پیغمبروں کے سے لہجے میں بات کی، جسے پڑھتے ہوئے انسان اس کے حکیمانہ انداز، اس کے ٹھہراؤ اور گمبھیرتا سے متاثر

ہونے بغیر نہیں رہتا۔ اور جبران کی باتوں میں الوہی حکمت و دانش کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ بعض اہل نظر کا خیال ہے کہ جبران کی بیشتر تحریریں، خاص طور پر بعد کے دور کی، دراصل نثری نظمیں ہیں جو کتاب مقدس کے اسلوب اور آہنگ میں لکھی گئی ہیں۔

جبران خلیل جبران کے دو قریبی دوست اور ساتھی میخائیل نعیمہ اور امین الریحانی تھے۔ ان میں سے موخر الذکر کے تعلقات جبران کے ساتھ اس کے آخری برسوں میں کچھ اچھے نہ رہے اور وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ جبران کی موت کے بعد جب میخائل نے اس کی سوانح لکھی تو اس میں جبران کی شخصیت اور فن کی بعض کمزوریوں کی طرف بھی اشارے کئے، جو لکھنے والے کی دیانت کا تقاضا تھا۔ اس پر امین الریحانی نے میخائیل کے نام ایک کھلے خط میں اسے معتوب کیا کہ ایک مرے ہوئے دوست کے بارے میں ایسی باتیں لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میخائل نے بھی اس کا جواب ایک کھلے خط کی صورت میں دیا اور امین سے کچھ صاف صاف باتیں کیں۔ اس خط میں ایک جگہ میخائل کہتا ہے۔

"پھر یہ بھی ہے امین صاحب کہ آپ کو جبران کی ادبی کاوشوں کی زیادہ پروا نہیں تھی اور نہ آپ انہیں کوئی خاص چیز سمجھتے تھے۔ اگر آپ بھول گئے ہوں تو میں آپ کو یاد دلاؤں کہ جبران کی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے آپ نے ایک شب میرے ہاں بسر کی تھی، اور اس شب کی کسی ساعت میں ہم براڈوے پر ٹہلنے نکلے تو جبران اور اس کے ادب کا ذکر چل نکلا اور آپ نے صرف دو انگریزی لفظ بول کر جبران کے ادب کی حقیقت بیان کر دی اور وہ لفظ تھے Mawkish sentimentalism مراد یہ کہ جبران کے ہاں سوائے ایک بدمزہ اور رقت آمیز جذباتیت کے اور کچھ نہیں"

میرا خیال ہے ہم دوسروں کی بات چھوڑیں، جبران خلیل جبران کے ایک بہت ہی قریبی دوست نے ایک رات نیو یارک کے براڈوے پر چہل قدمی کرتے ہوئے اس کے ادب کے بارے میں جو الفاظ استعمال کئے تھے اور اس کے دوسرے بہت ہی قریبی دوست نے جن کی تردید نہ کی تھی، وہی ہمارے لئے اس موضوع پر حرف آخر ہونے چاہئیں۔

رشید ملک

مارشل کے مسلمات کا جائزہ (۲)

اس سلسلے کی پچھلی قسط میں ہم نے اس خطے کے قبل از تاریخ ادوار کا ایک انتہائی اجمالی جائزہ لیا تھا تاکہ معلوم ہو سکے کہ مارشل اور اس کے رفقائے کار کا قائم کردہ یہ مسلمہ کہ اس خطے کی اپنی کوئی تاریخ نہیں اور سب تہذیبیں اور اقوام باہر سے آئی تھیں، حقائق کے بالکل برخلاف ہے اور اس کو جھٹلانے والے اور یہاں نوع انسان کی موجودگی ثابت کرنے والے شواہد پر ہم ایک نظر ڈال سکیں۔ جہاں ان شواہد کا تذکرہ کیا گیا ہے وہاں یہ انتباہ ضروری ہے کہ اس خطہ ارض کے قدیم حجری ادوار کے مطالعہ میں ابھی باقاعدگی پیدا نہیں ہوئی۔ اس قسم کے مطالعات یورپ اور برعظیم میں اکٹھے شروع ہونے تھے لیکن برعظیم میں ان مطالعات میں ابھی تک کوئی خاص پیش رفت نظر نہیں آتی۔ ڈی ٹیرا اور پیٹرسن نے اس مطالعہ کا آغاز ۱۹۳۰ء میں کیا تھا۔ ان کا مقصد شوالک اور کشمیر کے گلیشیائی تسلسل اور اس علاقے کے قدیم حجری ادوار کی صنعتوں کی تقویم میں کسی قسم کے تطابق کی تلاش تھا۔ ان کے بعد صرف وسطی حجری دور کی صنعتوں، دریاؤں کے کٹاؤ اور ملبے کے اکٹھے ہونے کی مناسبت دریافت کرنے کے علاوہ اس شعبہ علم میں کوئی بنیادی کام نہیں ہوا۔ یہ مسئلہ ہے بھی بڑا ٹیڑھا۔ حکماء کا خیال ہے کہ ہمالیہ کے گلیشیائی سلسلوں اور یورپ کے گلیشیائی سلسلوں کے درمیان جب تک کوئی تسلسل قائم نہیں ہوتا اس وقت تک اس خطہ ارض کے حجری ادوار کے مطالعات کی افادیت محدود ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ایسی نئی تکنیک اور طریق کار کی ضرورت ہے جو اس خطے کے مطالعہ کے لیے موزوں ہو۔ موجودہ کام بڑے محدود پیمانے پر ہو رہا ہے۔ علم الارض، شکلات الارض (جیومارفالوجی) یعنی زمین کے کلی خد و خال اور آب و ہوا کے علوم کے نقطہ نظر سے برجٹ آلچن، بڑودا یونیورسٹی کے ڈاکٹر ہیگڑے اور آکسفورڈ کے اینڈریو گڈی نے گجرات (بھارت) کے علاقے اور وہاں کے دریاؤں کا مطالعہ کیا ہے (انڈین آرکیالوجی (ریویو) ۶۸-۱۹۶۹: 8) گو ان کے نتائج محدود علاقے سے متعلق ہیں مگر حوصلہ افزا ہیں۔ وہ قدیم حجری ادوار کی صنعتوں پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے مغربی ساحل کی ارضی ساخت اور تاریخ کے مختلف ادوار میں بحیرہ عرب کی سطحوں کا جائزہ بھی لیا جا رہا ہے۔ یہ مطالعات بھی حوصلہ افزا ہیں ہیں۔ مختلف مقامات پر انسان کی آبادیوں اور اس کی صنعتوں کا مختصر سا جائزہ اوپر آ ہی چکا ہے۔ اس ضمن میں محترمہ ڈاکٹر گوردن کارنیوس اور سنکالیا سرخیل ہیں۔ ان کے کام کا بھی مختصر سا ذکر ہو چکا ہے۔

یہ انتباہ تو قدیم حجری ادوار کے متعلق تھا۔ درمیانی حجری دور یا میسولتھک زمانے کے دو مختلف پہلوؤں پر غور ہو رہا ہے۔ پہلا موضوع وسیع تر تقویم ہے۔ اس کا مقصد اس زمانے کی ترقی یافتہ ثقافتوں کے پہلو بہ پہلو برصغیر کی ہم عصر

ثقافت / ثقافتوں کی تقویم کے قیام کے امکانات کا جائزہ لینا ہے۔ اب یہ نظر آ رہا ہے کہ یہاں کی ثقافتوں کی تاریخیں ماضی میں بہت دور جا رہی ہیں۔ سرائے ناہر رائے میں یہ زمانہ گیارہویں صدی ق ۔ م تک چلا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ان مقامات کی کاربن 14 پر مبنی تاریخیں تاحال یوں مرتب ہوتی نظر آتی ہیں۔

	نمبر نمونہ	بنیاد : ہاف لائف 5568	ہاف لائف 5730
سرائے ناہر رائے	ٹی ایف 1104	110+10050	(110+10445)
باگور (ضلع بھیل واڑہ)	ٹی ایف 786	200+6245	(200+6430)
	ٹی ایف 1007	125+5620	(130+5785)
	ٹی ایف 1009	105+4575	(105+4715)
	ٹی ایف 1005		
	ٹی ایف 1006	90+3945	(90+4060)
آدم گڑھ	ٹی ایف 120	125+7240	(150+7450) (آکین + 10)

دوسرا پہلو اقتصادی اور معاشی ہے جس میں جانوروں کو پالنا پوسنا اور فصلیں اگانا اور ان سے منسلک دوسرے عوامل ہیں۔

اگرچہ ابھی تک لانگھنج کی باقیات کا مطالعہ ہوا ہے لیکن امید ہے کہ دوسرے مقامات سے حاصل کردہ شواہد کے تجزیئے کے نتائج بھی حوصلہ افزا ہوں گے۔ ان مقامات کی مزید کھدائیاں اس لیے بھی ضروری ہیں کہ ان کے ذریعے گرد و پیش کے مختلف مقامات کی آبادیوں سے ان مقامات کے رابطوں کا پتہ چل سکتا ہے۔

"ہڑپہ کے کلچر اور بالخصوص اس کلچر کی تبدیلیوں کے متعلق تیار کیے گئے عہد بعہد نمونوں (پیریاڈک ماڈلز) کے ہڑپہ کلچر پر غیر ناقدانہ اطلاق نے اس کلچر کی ہیئت اور نوعیت کے متعلق ایسی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں جو بہت نتیجہ خیز ہیں۔ ارتقاء یافتہ (میچیور) ہڑپن کلچر کی ابتدائی تعبیروں کو ناقدانہ جائزے کے بغیر اتنا شرف قبول بخشا گیا ہے اور ان کی اتنی تبلیغ کی گئی ہے کہ پہلے سے سوچے سمجھے خیالات و تصورات ارتقاء یافتہ ہڑپہ کلچر کے متعلق آثار کے پرانے اور نئے کوائف (ڈیٹا) کی تعبیر کو بھی شدید طریقے سے متاثر کرتے رہے ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان عوامل نے مل کر ارتقاء یافتہ ہڑپہ کلچر کے متعلق موجود تفاصیل کے تجزیئے پر ایک ہمہ گیر نظریاتی جمود طاری کر دیا ہے۔ ایک طویل عرصے سے ہڑپہ کلچر کی نوعیت کے بارے میں پہلے سے سوچے سمجھے نظریات ہی اس امر کا تعین کرتے رہے ہیں کہ آثاری اعداد و شمار اور معلومات سے کیا نتائج مرتب کئے جائیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ آثار سے حاصل شدہ معلومات کا جیسی کہ وہ ہیں، جیسی کہ وہ ہیں جائزہ لیا جانے نہ کہ اس نقطہ نظر سے کہ کوئی اس کے متعلق کیا سوچتا ہے۔ ہڑپہ کے مطالعات کی اہمیت کو ان حالیہ مطالعات نے اجاگر کرنا شروع کر دیا ہے جو یہ بتلاتے ہیں کہ جنوب مشرقی ایشیا میں شہری اور خواندہ کلچر کا ایک لاثانی تجربہ

ہو رہا تھا۔ ایسا کلچر مقامی حالات سے پوری طرح ہم آہنگ تھا اور یہ میسوپوٹیا کے شہری تجربے کا یا کسی اور ایسے علاقے کا جس نے اسی طرح کے کلچر کی ترقی کا تجربہ کیا ہو کا 'ایک مرآتی انعکاس (مرر امیج) نہیں تھا۔" (شیفر : 49)

مارشل کے مندرجہ بالا چاروں مسلمات (فنون ۔ 41) کے بعد وادی سندھ پر تحقیق میں کافی پیش رفت ہوئی ہے جس کا مختصر ذکر ضروری ہے تاکہ اس خطے میں محققین کی دلچسپی کا کچھ پتہ چلے اور مارشل کے مسلمات کو غلط قرار دینے والی شہادت کا کچھ اندازہ ہو جائے۔

مارشل نے اپنی تحقیق کے نتائج 1931 میں شائع کر دیے تھے۔ اس کے جانشینوں نے اس وادی پر تحقیق کا کام جاری رکھا۔ سندھ اور بلوچستان میں ان آثار کی تلاش جاری رہی اور وادی سندھ یا اس سے متعلق کئی مقامات دریافت ہوئے۔ موجمدار نے 1931 میں چھنودارو دریافت کیا اور محدود پیمانے پر کھدائیاں کیں۔ مارشل کے جانشین میکے نے یہاں ان 1954 میں وسیع پیمانے پر کھدائیاں کیں اور جھکر کلچر کے آثار دریافت کئے۔ آمری کو بھی موجمدار نے ہی دریافت کیا اور کاسل نے 1960ء اور 1970 میں یہاں کھدائی کی۔ یہاں اسے آمری کلچر کی باقیات ملیں جو ہڑپہ یا وادی سندھ کے کلچر کا پیشرو تھا۔ ہڑپہ کے بعد آنے والے جھکر اور جھانگر کلچر تھے۔ موجمدار نے ہی جوہی 'سہون اور کوہستان میں سروے کیا اور جھکر کی کھدائی کی۔ اس مقام کی ابتدائی سطحوں سے اسے وادی سندھ کے کلچر کا مخصوص مواد ملا۔

سر آرل سٹین نے 1927-1928 میں شمالی اور جنوبی بلوچستان کا سروے کیا اور کئی ایسے مقامات کی نشاندہی کی جن کا تعلق وادی سندھ سے قائم ہوتا تھا۔ پھر اس نے پرانی ریاست بہاولپور میں دریائے ہاکڑا۔ گھگھر سسٹم میں کئی اور ایسے ہی مقامات کی نشاندہی کی۔ سٹین کے کام کو گھوش نے جاری رکھا اور دریائے سرسوتی کے معاون دریا درشداوتی کے کنارے پرانی ریاست بیکانیر کے شمالی ضلع گنگانگر میں وادی سندھ سے متعلق تقریباً بارہ مقامات کی نشاندہی کی۔ ان میں سے ایک بڑا اہم مقام کالی بنگن ہے۔ اس کی کھدائی ہندوستان کے بی بی لال اور بی کے تھاپر نے کی۔ یہ کھدائیاں 1962ء سے 1967ء تک جاری رہیں۔ ہندوستان میں کئی اور مقامات بھی دریافت ہوئے جیسے بانا والی 'راکھی گڑھی اور مِتھا تھل۔ ان میں وادی سندھ پر تحقیق کے لیے آر۔ ایس۔ بشت کے مطابق بانا والی بڑا اہم مقام ہے۔ گجرات کے علاقے میں ایس آر راؤ نے 1954 میں لوتھل دریافت کیا اور یہاں ایک بندرگاہ برآمد کی جس کا تعلق وادی سندھ سے قائم ہوتا ہے۔

"گوداوری کے معاون دریا پروار کے کنارے دائم آباد سے تین اشیاء ملی ہیں۔ ان میں سے ایک ٹھوس کانسی کا پھولدان ہے جس کے کنارے پر ہڑپہ رسم الخط میں تین حروف کندہ ہیں۔ دوسری چیز سرخ پختہ مٹی کی ایک گول مہر ہے جس پر اسی خط کا ایک حرف لکھا ہوا ہے۔ ایسی دوسری شہادت بھی ملتی ہے جو وسطی ہندوستان میں بعد میں پھلتے پھولتے کالکولتھک کلچر کے ساتھ رشتہ قائم کرتی نظر آتی ہیں اور وادی سندھ کو ہندوستان کے قومی کلچر ہونے کی نوعیت کا پتہ دیتی ہیں۔" (پانڈے 98)

"سکالرز جب مغرب سے پھیلنے والے روایتی تصورات کو بار بار دہرا رہے تھے 'ماہرین آثار نے پرانے تصوراتی فریم ورک سے باہر نکل کر تمام موجود شہادت کا از سر نو جائزہ لینا شروع کر دیا اور وادی سندھ کی تہذیب کے اقتصادی اور سماجی تنظیم کے بڑے قابل تعریف "ماڈلز" پیش کئے لیکن ان ماڈلز اور نئی تشریحات کو کوائف (ڈیٹا) کی کمی نے بڑا محدود کر دیا۔ چنانچہ وادی سندھ کا آغاز گرفت سے باہر ہی رہا۔" (رفیق مغل 1980 : 4)

"1970ء کے بعد کئی جگہوں پر عمیق کھدائیوں اور عظیم تر وادی سندھ میں وسیع سروے سے بہت بڑی مقدار

میں آثاری شہادت دستیاب ہوگئی جس نے وادی سندھ کی تہذیب کے تشکیلی مراحل کی موجودگی ثابت کر دی۔ یہ نئی شہادت گملا ' وادی گومل میں رحمان ڈھیری ' بنوں کے طاس میں لیوان اور ترکئی قلعہ ' ٹیکسلا کی وادی میں سرائے کھولا ' ہتھیال اور جھنگ ' جلیل پور اور چولستان کے علاقے اور جنوب مغربی بلوچستان میں کچھی ضلع میں مہرگڑھ سے دستیاب ہوئی ہے"۔ [مغل 2:1987] ۔ ان مقامات میں پرانی ریاست بیکانیر کے ضلع گنگا نگر کے سرحدی گاؤں کالی بنگن کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ [تھاپر ' انڈین آرکیالوجی (ریویو) 1968-1969:28-32 اور 1973:85-104]

ان مقامات کے فرداً فرداً تجزیے کی نہ یہاں کوئی گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ صرف مہرگڑھ سے فراہم شدہ شہادت پر علماکے خیالات کافی ہوں گے۔

"حالیہ زمانے تک وادی سندھ کی تہذیب یا ہڑپہ کلچر کی ابتداء اور اس کے مراحل اسی طرح تاریکی میں چھپے ہوئے تھے۔ اس معاملے کی صورت اب وہ نہیں رہی۔ ژاں فرانسوا جیریج 1977 سے فرانسیسی مشن کے سربراہ ہیں۔ ان کی ہدایت پر اس مشن کی 1974 سے مہرگڑھ کی کھدائیو ں سے آٹھ پرتیں دریافت ہوئی ہیں۔ ان کا تعلق آٹھویں سے تیسری صدی کے اختتام سے ہے۔ ان سے واضح ہو گیا ہے کہ یہ معاملہ اب وہ نہیں رہا۔ ان کے تفصیلی تجزیے نے وادی سندھ کے انسان کے متعلق ہمارے علم میں وسیع اضافہ کیا ہے اور وادی سندھ میں ابھرنے والے ہڑپہ کلچر پر بڑی خوش آئند روشنی ڈالی ہے۔" [اربن : 24] اور

"کھدائیوں کے انکشافات میں اس مقام پر نیوتھک افق پر ظروف سازی کی غیرموجودگی اہم ترین دریافت ہے۔ یہ مرحلہ (یعنی ظروف سازی) 7000 ق م کے بعد شروع ہوا۔ بظاہر یہ غیر منقطع تسلسل دو سو پچاس ہیکٹیئر پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ ہمیں 2500 تک لے آتا ہے۔ اس کے مراحل میں یہ افق سب سے پہلا مرحلہ ہے۔ یہ بھی واضح ہو گیا کہ مہرگڑھ کی آبادی کے اس علاقے سے لوگ شمال سے جنوب کی طرف نقل مکانی کرتے رہے ہیں۔ اس وسیع علاقے کا بڑا حصہ دریائے بولان اپنے رخ کی تبدیلی سے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔" [جیریج : 36.1983]

یہاں علمی تخصص کے یک رخا پن کی ایک مثال پیش کرنا دلچسپ ہو گا۔" ڈاکٹر آلچن جنہوں نے 1970ء میں پیش کیے گئے نئے تصوراتی فریم ورک کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ اب عظیم تر وادی سندھ سے نئی تائیدی شہادت کی اہمیت کے پیش نظر جس میں بنوں میں ان کی اپنی دریافت کردہ شہادت بھی شامل ہے 'اب اس معاملے میں ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ ڈاکٹر آلچن بہاولپور کی دریافتوں کو بھی متواتر نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ طنزیہ پہلو یہ ہے کہ اس بارے میں وہ وہی دلایل پیش کرتے رہے جو موجودہ راقم نے بارہ سال قبل پیش کیے تھے اور مانتے ہیں کہ کوٹ ڈجی کے ذخایر ہڑپہ کا اوائلی (ارلی ہڑپن) مرحلہ پیش کرتے ہیں گو وہ اس اصطلاح اوائلی ہڑپہ (ارلی ہڑپن) کو اپنی پچھلی نگارشات میں استعمال کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے ہیں۔" [مغل = 17.1983] ڈاکٹر آلچن لسانیات کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں اور آثار سے صرف تائید شہادت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ وہ لسانیات کی بنیاد پر اب بھی انڈو ایرین زبان بولنے والوں (آریاؤں) کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ دوشنبہ میں انہوں نے اسی موضوع پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔ [آلچن 1980: 68 - 102]

حال ہی میں ہڑپہ میں کئی برسوں سے کھدائیوں میں مصروف ڈاکٹر کنائر سے جب سوال کیا گیا کہ اس تہذیب کی جڑیں کہاں تک جاتی ہیں تو ان کا مختصر مگر برجستہ جواب تھا "حجری زمانے تک۔"

چنانچہ اس شہادت کی بناء پر مارشل کا قائم کردہ پہلا اور اہم ترین مسلمہ مکمل طور پر منہدم ہو جاتا ہے۔

Bibliography

Allchin, F. R., 1973 — Problems and perspectives in South Asian archaeology *in* Hammond (ed South Asian Archaeolgy, Noyes Press, New Jersey

Allchin, F. R., 1980 — Archaeolgy and Language Historical Evidence for the Movements of Indo Aryan Speaking Peoples into India and Pakistan, delivered at International Symposium on the Ethnic Problems of the Early History of Central Asia, Dushanbe, Tajik SSR, Journal of K. R. CAMA Institute, Bombay No.48

Indian Archaelolgy — A Review, 1967-68

Jarriage, J.F., 1991 — Mehrgarh: Its Place in the Development of Ancient Cultures in Pakistan, Jenson et.al. (eds.) Forgotten Cities on The Indus, Mainz, Germany.

Mughal R., 1980 — New research on the origins of the Indus civilization, An unpublished summary of a lecture delivered at Hyderabad Museum, January 17, 1980

Mughal R., 1983 — Current research Trends on the Rise of Indus civilization, in Urban and Jensen (eds.) Forschungsprojkt DFG Mohenjo-Daro, Aachen

Pande, B. M., 1982 — History of research on the Harappan Culture in Possehl (ed.) Harappan Civilization, Oxford, New Delhi.

Shaefer, J. G., 1982 — Harappan Culture: a reconsideration, Possehl, (ed.)op.cit. 1982

Thapar, B. K., 1973 — New Traits of the Indus civilization at Kalibangan: an appraisal in Hammond (ed.) op. cit.

Urban, G., 1991 — The Indus Civilization: the Story of a Discovery, in Jensen et. al.op. cit.

دیوان غالب پر مولانا حامد علی خاں صاحب کے حواشی

ڈاکٹر خورشید رضوی

جامعہ پنجاب کی مطبوعات میں ایک وقیع سلسلہ "مطبوعات مجلس یادگار غالب" کا ہے جس میں پہلے نمبر پر دیوان غالب (اردو) کی دیدہ زیب اشاعت ۱۹۹۰ء میں سامنے آئی۔ تحقیق متن و ترتیب کا کام مولانا حامد علی خاں صاحب، مدظلہ العالی نے انجام دیا، کتابت وطن عزیز کے مایۂ ناز خطاط حضرت نفیس رقم نے فرمائی اور آرائشی بیل بوٹے مصور پاکستان جناب عبدالرحمن چغتائی مرحوم کی جانب سے فراہم کئے گئے۔ چونکہ یہ نسخہ حسن ظاہر و باطن کا ایک قابل قدر مرقع ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ارزاں بھی تھا لہذا ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے۔

جیسا کہ مولانا حامد علی خاں صاحب نے "حرف آغاز" میں بیان فرمایا ہے، ان کو

"--- ایک ایک مختلف فیہ شعر اور ایک ایک مختلف فیہ لفظ کی صحت کا فیصلہ کرنے کے لئے، بہ نظر احتیاط، دس دس پندرہ پندرہ قدیم و جدید نسخوں کا مقابلہ کرنا اور بسا اوقات شرحوں اور لغت کی مستند کتابوں کا سہارا بھی ڈھونڈنا پڑا۔ یہ کام بڑی احتیاط سے کیا گیا ہے اور قارئین کو اس کی دقت اور وسعت کا اندازہ متن کے ذیلی حواشی پڑھ کر ہو گا----"۔ فی الواقع یہ حواشی مولانا کے حسن ذوق اور نکتہ رسی کے ساتھ ساتھ ان کی محنت شاقہ کے بھی آئینہ دار ہیں اور ان میں متن کی بعض متداول لیکن نادرست روایتوں کی اصلاح مضبوط علمی و ذوقی استدلال کے ساتھ کی گئی ہے۔ مثلاً صفحہ 193 پر غالب کے شعر

صرفِ اعدا اثرِ شعلہ و دودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

کے ضمن میں جو حاشیے دیے گئے ہیں وہ بعض نسخوں کی روایت "شعلۂ دودِ دوزخ" کو لغت و قواعد نیز سلامتی ذوق، ہر دو سطحوں پر نہایت عمدگی کامیابی سے رد کر دیتے ہیں۔ اسی طرح صفحہ 200 پر "مدح شاہ" میں غالب کے قصیدے کے ایک مصرع

بادباں بھی، اٹھتے ہی لنگر، کھلا

کی ایک مشہور روایت

بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھلا

کو بڑی خوبی سے اس دلیل پر رد کیا گیا ہے کہ "صریحاً سہو کاتب ہے، لنگر اٹھتا ہے، بادبان کھلتا ہے"۔ صفحہ 220 پر ضمیمہ میں "یک شہرِ آرزو" (بہ اضافت) کے بجائے "یک شہر، آرزو" (بلااضافت) کی ترجیح، نیز "ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے" کے بارے میں مولانا کا یہ قیاس کہ "ثواب" غالباً "صواب" تھا جو سہواً تمام مروجہ نسخوں میں "ثواب" بن گیا، وزنی اور قابل غور ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ قارئین دیوان مولانا کی اس "کاوش و کاہش" پر ہمیشہ ان کے ممنون رہیں گے۔

تاہم بعض حواشی ایسے بھی ملتے ہیں جن کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یا تو "مختصر سے مختصر رکھنے کی کوشش" میں ان کا جو پس منظر مولانا کے ذہن میں تھا، تشنۂ ابلاغ رہ گیا ہے یا پھر اس عدیم الفرصتی کے سبب جس کا ذکر انہوں نے "حرف آغاز" میں فرمایا ہے، مولانا کو ان سے متعلق ضروری تحقیق کا وقت نہیں مل سکا۔ چونکہ دیوان کی دوبارہ اشاعت زیر غور ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت، بصد ادب، چند گزارشات کی جسارت، اس درخواست کے ساتھ کی جائے کہ اگر وہ قصور فہم کا نتیجہ ہوں تو معاف فرمائی جائیں اور اگر کسی قابل نظر آئیں تو، مولانا کی اجازت سے، اشاعت دوم میں ضروری ترمیم کا اہتمام ہو سکے۔

چونکہ ابھی صفحہ 220 کے ضمیمے کا ذکر ہوا ہے اس لئے بات کا آغاز وہاں سے کرتے ہیں۔ اس ضمیمے کا تیسرا اور آخری حصہ صفحہ 218 سے متعلق ہے جس پر غالب کی رباعی کے مصرع

دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب

پر مولانا نے ایک "رک" نکال کر وزن درست کر لینے سے معنوی اختلاف کیا ہے اور فرمایا ہے "عروض خواہ کچھ کہے "رک کر" کو "رک رک کر" کی جگہ نہیں دی جا سکتی۔" مولانا کی یہ رائے واضح اور دو ٹوک ہے۔ البتہ عروضی اعتراض کا ذکر انہوں نے کچھ مبہم سے انداز میں فرمایا ہے یعنی

"اس رباعی کے دوسرے مصرع کے متعلق بڑا جھگڑا رہا ہے۔ یہ بہ ظاہر حضرت طباطبائی کے عروضی اعتراض سے شروع ہوا جو غالباً غلط فہمی پر مبنی تھا۔"

"غالباً غلط فہمی پر مبنی تھا" سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دراصل اس مصرع میں کوئی عروضی سقم نہ تھا۔ ایسی صورت میں لازم تھا کہ عروضی اعتبار سے صحت وزن کی وضاحت کی جاتی۔ شاید اسی لئے ڈاکٹر محمد باقر صاحب مرحوم سے یہ سن کر کہ "پروفیسر شیرانی نے اس مصرع پر عروضی اعتراض مسترد کر دیا تھا" مولانا نے مذکورہ بالا ضمیمے میں" اورینٹل کالج میگزین" (بابت فروری و مئی 1940ء) کا حوالہ درج فرما دیا۔ غالب کا طرف دار ہونے کی حیثیت سے مجھے شیرانی صاحب جیسے محقق اور عالم عروض کی رائے کی تفصیل جاننے کا تجسس ہوا۔ فروری و مئی 1940ء کے "اورینٹل کالج میگزین" میں ان کے اس مضمون کی دونوں قسطیں مل گئیں جس کا عنوان ہے "رباعی کے اوزان یاد رکھنے کا ایک آسان طریقہ"۔۔۔۔ (ضمیمہ مذکورہ میں "ایک آسان" کے الفاظ ساقط ہو گئے ہیں)۔ مضمون کی پہلی قسط کا بیشتر حصہ سید سلیمان ندوی صاحب سے بعض علمی اختلافات پر مشتمل ہے۔ اثناء بحث میں شیرانی صاحب نے وضاحت کی ہے کہ سید صاحب نے بعض اوقات غیر رباعی اوزان کو رباعی تصور کر لیا ہے۔ اسی حوالے سے پہلی قسط کے آخر میں فرماتے ہیں

"ترانہ، موسیقی میں باعتبار اقسام الحان و رنگینیٔ نغمات خواہ کتنا ہی دلپذیر و خوش آئند کیوں نہ ثابت ہو، عروضی اوزان کے اعتبار سے ہمیشہ دقت اور دشواری کا سامان بنا رہا ہے۔ غیر رباعی اوزان سے اس کے اوزان کی شناخت نہ صرف عوام بلکہ شعراء کے لئے بھی ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ اس سے متعلق اکثر لوگوں کو مشابہ لگ جاتا ہے۔ سید سلیمان پہلے شخص نہیں ہیں جو حنظلہ بادغیسی اور عمارہ مروزی کے شعروں کو رباعی سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہوئے بلکہ ان سے پیشتر بھی بہت لوگوں کو رباعی کے باب میں دھوکا ہوا ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بعض غیر رباعی اوزان کو رباعی سمجھتے رہے اور جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس کے ازالہ کی کوشش کی۔ میرزا غالب کے واسطے مولانا نظم طباطبائی نے اپنی شرح دیوان غالب میں ذکر کیا ہے کہ میرزا ایک رباعی میں سہوا ایک سبب

خفیف زاہد از وزن باندھ گئے ہیں۔ وہ رباعی حسب ذیل ہے جس کے مصرع دوم میں ایک "ترک" زاہد
از وزن ہے۔۔" (1)
گویا شیرانی صاحب نے تو جناب نظم طباطبائی کے اعتراض کی توثیق کی ہے ' اسے رد نہیں کیا۔ چنانچہ مناسب ہو اگر اس ضمیمے کو ' نیز صفحہ 218 پر جناب طباطبائی کے اعتراض کے بارے میں "جو غالباً غلط فہمی پر مبنی تھا" کے الفاظ کو ' حذف کر دیا جائے۔ ہاں غالب کی عروضی حمایت میں اگر "عزم" کی گنجائش سے کچھ فائدہ اٹھایا جا سکے تو اور بات ہے۔ (2)

ضمیمے سے آغاز کتاب کی طرف رجوع کرتے ہوئے قارئین کی توجہ صفحہ 2 کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا جہاں "صحرا مگر بہ تنگیِ چشم حسود تھا" میں "حسود" کو بالالتزام "حُسُود" (بضمتین) لکھوایا گیا ہے اور حاشیے میں وضاحت کی گئی ہے کہ

"یہاں "حُسود" کی جگہ "حَسود" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ حُسود = جمع حاسد۔ حَسود = بہت حسد کرنے والا۔"

"حاسد" عربی کا لفظ ہے اور عربی کے مستند علمائے لغت کے ہاں اس کی جمع "حُسّاد" "حُسّد" اور "حَسَدة" ملتی ہے۔ (3) اور جمع سالم کے قاعدے سے "حاسدون / حاسدین" بھی لائی جا سکتی ہے۔ "حُسُود" (بضمتین) ان کے ہاں بطور مصدر ملتا ہے ' بطور جمع نظر سے نہیں گزرا۔ یہ درست ' ہے کہ عربی میں وزن "فاعل" کی جمع بسا اوقات "فُعول" (بضمتین) بھی آتی ہے مثلاً "شاہد" سے "شُہود" لیکن یہ امور سماعی ہیں ' قیاس کو ان میں دخل نہیں۔ فارسی اور اردو کے بعض متاخر لغت نویسوں نے جو "حُسود" (بضمتین) کو جمع "حاسد" لکھا ہے تو یہ قیاس ہے جو اصولاً قابل قبول نہ ہونا چاہئے۔ راقم کی محدود سی نظر کے مطابق غالباً اس قیاسی صیغے کو رواج دینے کی ذمہ داری غالب کے سخت ناپسندیدہ لغت "غیاث اللغات" پر عائد ہوتی ہے (4) اسی کی عبارت کو فرہنگ آنند راج میں نقل کر دیا گیا اور پھر بعد کے بعض لغت نویسوں نے اخذ کر لیا۔ اس غیر مستند قیاسی صیغے کو متن میں ثبت کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ "حَسود" (بفتح الحاء) صاف اور مستند لغت ہے اسی کو متن میں آنا چاہئے۔

صفحہ نمبر 5 پر غالب کے مصرع

اے نو آموز فنا ' ہمت دشوار پسند

پر حاشیے میں "اے" ' "ہے" اور "تھی" کے اختلاف متن پر روشنی ڈالنے کے بعد "اے" کی روایت سے متعلق مولانا کی یہ وضاحت راقم کی فہم ناقص میں نہیں آ سکی کہ:

"اس" ' "اے" کی مثال غالب کے اس مصرع میں بھی ' کسی قدر ملتی ہے۔

اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے"

مولانا کی دقیقہ شناسی کے پیش نظر یقین ہوتا ہے کہ ضرور کوئی باریک پہلو ان کی نظر میں ہے۔ لیکن اس کا ابلاغ نہیں ہو پاتا اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس "اے" کی مثال اس "اے" میں "کسی قدر" بھی کیونکر ملتی ہے۔ وہاں تو "اے" ' "جز" کے معنوں میں آیا ہے جس کی وضاحت مولانا حالی نے یادگار غالب میں یوں فرمائی ہے:

"بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے جو نہ ان سے پہلے اردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں۔ مثلاً ان کے موجودہ اردو دیوان میں ایک شعر ہے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے۔ فرمایا کہ "اسے" کی جگہ "جز" پڑھو۔ معنی خود سمجھ میں آ جائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری جو ایک کف خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفس عنصری سے زیادہ نہیں انکے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف ان کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔

یہاں جس معنی میں مرزا نے "اسے" کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہراً یہ انہیں کا اختراع ہے۔" (5)

معلوم نہیں "اسے" بمعنی "جز" کا پرتو اس شعر میں کہاں محسوس ہوتا ہے

اسے نو آموزِ فنا ، ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

صفحہ نمبر ۱۰۸ پر غالب کے مصرع

شور سودائے خط و خال کہاں

پر مولانا کا حاشیہ یہ ہے کہ "ممکن ہے غالب نے خد و خال کہا ہو"۔ "ممکن ہے" کے الفاظ سے اندازہ ہوا ہے کہ یہ مولانا کا اپنا قیاس ہے ۔ کسی نسخے کی اختلافی روایت نہیں۔ چونکہ اس قیاس کا پس منظر بیان نہیں کیا گیا اس لئے بادی النظر میں اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو مولانا کی سخن فہمی اور باریک بینی کی داد دینا پڑتی ہے۔ "شور" کو نمکینی سے نسبت ہے اور "سودا" کو سیاہی سے۔ غالباً مولانا کا ذوق چاہتا تھا کہ جس طرح "سودا" کے مقابل "خال" آیا ہے جس میں سیاہی پائی جاتی ہے اسی طرح "شور" کے مقابل کوئی ایسی چیز آنی چاہئے جس میں "نمک" ہو۔ یہ نمک ان کو "خد" یعنی عارضِ محبوب کی ملاحت میں زیادہ محسوس ہوا چنانچہ انہوں نے اس رائے کا اظہار فرمایا۔ غالب شناسی کی دنیا میں اس دقّت نظر کو اپنی جگہ جس قدر خراجِ تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ تاہم معروضی نقطہ نظر سے اس سلسلے میں چند معروضات کی گنجائش نکلتی ہے

(۱) "خط و خال" کے معنوں میں "خد و خال" کی بھی اگرچہ بعض اساتذہ کے کلام میں نشاندہی کی گئی ہے تاہم فارسی کی غالب روایت "خط و خال" یا "خال و خط" ہی رہی ہے۔ حافظ کا مشہور شعر ہے

زعشق نا تمام ما ، جمال یار مستغنی است
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روی زیبارا (6)

اکثر فصحائے ریختہ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔(7)

ولی نے کہا

ولی شعر میرا سراسر ہے درد ، خط و خال کی بات ہے خال خال

گلزار نسیم میں ہے

دیکھا تو نہ فرق تھا سرِمو ، جانچے خط و خال و چشم و ابرو

میر انیس فرماتے ہیں

تعجیل کیا ، ہوش میں اک خود غلط نہ تھا
زخمی تھے منہ ، کہیں اثر خال و خط نہ تھا

"خد و خال" اگرچہ آج اردو میں رتبہ فصاحت پر فائز ہے لیکن غالب مذکورہ بالا روایت کے آدمی تھے۔ ان کے ہاں "خط و خال" ہی متوقع ہے۔

(2) "ملاحت" کی جو مناسبت "خد و خال" کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ "خط و خال" میں بھی موجود رہتی ہے۔ حافظ ہی کا شعر ہے:

شیوہ و ناز تو شیریں ، خط و خال تو ملیح
چشم و ابروی تو زیبا ، قد و بالای تو خوش (۸)

(3) حسن ذوق غالب کے ہاں ، جس حسن اہتمام کا طالب ہے اس کے لئے مصرع اول بھی کار آمد ہے۔
پورا شعر یوں ہے

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شور سودائے خط و خال کہاں

"شور" کو "شوریدگی دل" اور "سودا" کو "دماغ" سے بھی تو مناسبت ہے۔ اور یہی چوکھی مناسبتی غالب کے اشعار کو گنجینۂ معنی کا طلسم بناتی ہیں۔

مختصر یہ کہ "خد و خال" کی اختلافی روایت کی عدم موجودگی میں اس قیاس کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

صفحہ ۱۱۱ ، "بنات النعش" پر حاشیہ لکھتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں

"جنازے کے آگے آگے چلنے والی ماتم دار لڑکیاں؛ یہاں یہ لفظ غالباً "ابن" کی جمع کے طور پر استعمال نہیں ہوا۔ غالب نے صیغہ تانیث استعمال کیا ہے"

یہ حاشیہ اپنے ایجاز کے سبب چیستان بن کر رہ گیا ہے۔ مولانا نے جس اشکال کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ غالب کے بعض شارحین اور اردو کے بعض لغت نویسوں کی طرف سے عربی لغت کے ایک مسئلے کو غیر ضروری اور نامکمل طور پر بیان کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ "بنات النعش کبریٰ" اور "بنات النعش صغریٰ" آسمان پر ، شمال کی جانب ، سات سات ستاروں کے دو برجوں کا نام ہے۔ "نعش" عربی میں جنازے کو کہتے ہیں۔ ان دونوں برجوں کے چار چار ستارے ایک چار پائی یا جنازے کی شکل میں تصور کئے جاتے ہیں چنانچہ ان کو "نعش" قرار دیا گیا ہے اور "نعش" سے متصل تین ستاروں کی قطار "بنات" کہلاتی ہے۔ "بنات" ، "بنت" کی جمع ہے جس کا لغوی مطلب ہے "بیٹی"۔ "ابن" ، "بنت" ، "ابو" ، "اخت" ، "ام" جیسے الفاظ عربی میں اپنے اصل مفہوم کے علاوہ ، کسی بھی نوع کا تعلق ظاہر کرنے کے لئے بھی آتے ہیں۔ مثلاً "ابن السبیل" ، راستے کا بیٹا" یعنی راہ گیر ، "ام القریٰ" ، بستیوں کی ماں" یعنی مرکزی بستی (مکہ معظمہ) ، "ابو تراب" ، "مٹی کا باپ" ، یعنی مٹی میں اٹا ہوا (حضرت علی کی کنیت) چنانچہ "بنات النعش" ، "جنازے کی بیٹیاں" سے مراد ہوئے وہ ستارے جو جنازے کی شکل سے متصل ہیں۔ یہاں عربی لغت کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ستارہ الگ الگ "ابن النعش" ، "جنازے کا بیٹا" کہلاتا ہے لیکن جمع کی صورت میں یہ "بنات النعش" ، "جنازے کی بیٹیاں" تصور ہوتی ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ اس کا نہ تو یہ مفہوم ہے کہ "ابن" کی جمع "بنات" ہے اور نہ یہ کہ عربی میں جنازہ اٹھانے والے کو ابن النعش کہتے ہیں (جیسا کہ اردو میں بعض فضلاء نے لکھ دیا ہے)۔ "ابن النعش" صرف ان ستاروں ہی کے حوالے سے استعمال ہوتا ہے جبکہ کوئی ایک ستارہ مراد ہو (۹) انسانوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اشیاء اور حیوانات کے بارے میں واحد کے لئے "ابن" (مذکر) ، اور جمع کے لئے "بنات" (مونث) ، لانے کی مثالیں عربی میں اور بھی ہیں مثلاً "ابن آویٰ" (گیدڑ) کی جمع "بنات آویٰ" اور "ابن عرس" (نیولا) کی جمع "بنات عرس" آتی ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ اشیاء و سوامات کی جمع کا عمومی تصور عربوں کے ہاں مونث کا ہے۔ اس بحث کی اور بھی بعض باریکیاں ہیں لیکن [illegible] یاق میں اسی قدر

کافی ہے۔ اور غالب کے شعر کی تشریح کے لئے تو اس کی بھی ضرورت نہ تھی۔ "بنات النعش" کے مفہوم کی اجمالی توضیح کافی تھی، صیغہ واحد "ابن النعش" سے بحث کرنا غیر ضروری تھا۔ مولانا حامد علی خاں صاحب کا اشکال اسی غیر ضروری بحث سے پیدا ہوا ہے کہ "ابن" کی جمع "بنات" کیونکر ہوئی اور اس کی تانیث کا کیا جواز ہے۔ چونکہ خود یہ حاشیہ بھی قاری کے ذہن میں مزید اشکال کا باعث بنتا ہے لہذا اس کو حذف کر دینا مناسب ہو گا۔ یا پھر اس بحث کا مختصر پس منظر بھی حاشیے میں شامل ہونا چاہئے۔

یہاں ضمنی طور پر ایک قدرے غیر متعلق بحث بھی قابل ذکر ہے۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی شرح دیوان غالب "نوائے سروش" میں "بنات النعش" کی تشریح کے آخر میں فرمایا گیا ہے

"اردو میں ساتوں ستاروں کو سات سہیلیوں کا جھمکا یا گچھا یا سات سہیلیاں بھی کہتے ہیں۔ ان کا ایک نام عقد ثریا بھی ہے۔" (10)

یہ التباس ہے۔ "بنات النعش" کا سات سہیلیوں کے جھمکے یا عقد ثریا سے کوئی تعلق نہیں۔ "ثریا" یا "پروین" (Pleiades) برج ثور میں ستاروں کا ایک گچھا ہے جس کو یونانی دیومالا کے حوالے سے "Seven Sisters" بھی کہا گیا ہے اور غالباً وہیں سے ہمارے ہاں بھی "سات سہیلیوں" کا تصور پیدا ہوا۔ بنات النعش کبریٰ و صغریٰ کا ایک اور مشہور نام "دب اکبر" اور "دب اصغر" ضرور ہے۔ "دب" عربی میں "ریچھ" کو کہتے ہیں۔ چار ستاروں کے مستطیل کو ریچھ کا جسم اور تین متصل ستاروں کو اس کی دم سمجھتے ہوئے ان دونوں برجوں کو ریچھ کی شکل میں بھی تصور کیا جاتا ہے۔

صفحہ ۱۳۰ پر غالب کے شعر

اللہ رے تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

پر حاشیے میں "رے" اور "ری" کے اختلاف روایت کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد کیا ہے کہ

"۔۔۔ اللہ رے" اور "اللہ ری" میں یہ امتیاز قابل تعریف ہے۔ مگر اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مخاطب "تندی خو" نہیں بلکہ "تند خو محبوب" ہے جو محبوبہ بھی نہیں"

جہاں تک مولانا کے انتخاب روایت یعنی "اللہ رے" کا تعلق ہے وہ ان کے حسن ذوق کا آئینہ دار ہے کہ یہی فصحاء کی زبان پر زیادہ ہے۔ تاہم حاشیے میں صرف اختلاف روایت کا ذکر کافی معلوم ہوتا ہے، تذکیر و تانیث کی بحث سے بات سلجھنے کے بجائے الجھنے لگتی ہے۔ "اللہ ری" کے بعد واقعی صیغہ تانیث ہی لایا جاتا ہے۔ (اور اسی کے پیش نظر مولانا نے اس امتیاز کو قابل تعریف ٹھہرایا ہے)۔ لیکن "اللہ رے" مذکر مونث سب کو محیط ہے۔ مثلاً (11)

(مذکر کے ساتھ)

اللہ رے آئنے میں ترے حسن کا شکوہ
پانی میں ماہتاب کی جیسے جھلک پڑے
(قائم)

(مونث کے ساتھ)

نیرنگ حسن و عشق کی اللہ رے بہار
بیکار کوئی فعل نہیں کارساز کا (آتش)

اللہ رے گرمیاں مرے معشوق کی امیر
آیا خیال دل میں تو اک آگ لگ گئی
(امیر)

دراصل یہ کلمۂ تحسین و استعجاب ہے۔ کسی کو اس کا مخاطب قرار دینا اور پھر اس مخاطب کی تذکیر و تانیث سے اس کا تعلق جوڑنا چنداں ضروری نہیں۔ اور بالفرض اگر جوڑنا ہی ہو تو پھر "تندی خو" سے جوڑنے میں بھی کیا مانع ہے مزید براں اس شعر میں محبوب کے مذکر یا مونث ہونے پر حتمی استدلال کیونکر ممکن ہے؟

صفحہ 205 پر لامیہ قصدے کا یہ شعر متن میں یوں درج ہے

ذرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ امر کی زنبیل

اور حاشیے میں وضاحت کی گئی ہے کہ

"غالب نے یہاں "امر" ہی لکھا تھا، یعنی متحرک "م" کے ساتھ۔ جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ یہاں "عَمرو" ہی لکھنا مناسب ہے انہیں سوچنا چاہئے کہ "عَمرو" میں "م" ساکن ہے۔"

یہ حاشیہ بھی، پس منظر سامنے نہ ہونے کے سبب قاری کے لئے الجھن پیدا کرتا ہے پس منظر غالباً یہ ہے کہ نسخہ نظامی یعنی غالب کی زندگی میں اور ان کی تصحیح کے مطابق شائع ہونے والے نسخۂ دیوان میں جو ذی الحجہ 1278ھ / جون 1864ع میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا، یہ لفظ اسی طرح الف سے "امر" درج ہے (ص 94)۔ غالباً اسی بنیاد پر جناب طباطبائی نے اپنی شرح میں فرمایا کہ

"یہاں عمرو کو مصنف نے الف سے لکھا ہے اور میم کو متحرک نظم کیا ہے، دونوں باتیں غلط ہیں۔" (12)

مولانا غلام رسول مہر "نوائے سروش" میں رقم طراز ہیں کہ:

"مولانا طباطبائی نے یہ نام "امر" لکھا ہے اور فرماتے ہیں کہ مرزا غالب نے یونہی لکھا تھا تاکہ حضرت عمر سے التباس نہ ہو" غالباً یہاں مولانا مہر کو التباس ہوا۔ اس خیال کا اظہار جناب طباطبائی نے نہیں مولانا حسرت موہانی نے اپنی شرح میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں

"غالب نے عمرو کے بجائے "امر" شاید بلحاظ ادب لکھا ہے۔ یعنی وہ اس خیال سے کہ عمرو عیار، جو ایک فرضی نام ہے، اس میں اور حضرت عمر ابن امیہ صحابی کے نام میں غلط ملط نہ ہو جائے۔" (14)

لفظ "شاید" سے واضح ہے کہ یہ مولانا حسرت موہانی کا ذاتی قیاس ہے نیز یہاں حضرت عمرو بن امیہ مراد ہیں۔ (اگرچہ طباعت میں "عمرو" کی واؤ الف بن گئی ہے) ـــــ نہ کہ حضرت عمر فاروق جیسا کہ مولانا مہر کی عبارت سے متبادر ہوتا ہے۔

شرح طباطبائی میں جس قیاس کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے:

"۔۔۔ مصنف کو یہ دھوکا ہوا کہ جس طرح قصہ فرضی ہے نام بھی بے اصل ہو گا۔" عمرو "نہیں "امر" سہی" نیز جناب طباطبائی نے عمرو عیار کے کردار کو حضرت عمرو بن امیہ صحابی ہی سے ماخوذ بتایا اور اسی سیاق میں لکھا ہے کہ

"میں نے خود سنا ہے داستان گویوں کو اس طرح کہتے ہوئے (عیار عیاراں عمرو بن امیہ ضمری) یعنی عمرو کے باپ کا اور خاندان تک کا نام داستان میں ذکر کرتے ہیں" (16)

واضح رہے کہ لفظ "عیار" عربی لغت کے اعتبار سے ذم کا پہلو نہیں رکھتا بلکہ متحرک، فعال، جہاں گرد، ذہین اور مہم جو جیسے مفاہیم کا احاطہ کرتا ہے۔ (17)

لفظ "عمرو" میں واؤ کا اضافہ "عمر" سے امتیاز کے لئے کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ واؤ صرف لکھنے میں آتی ہے، آواز نہیں دیتی۔ "عمرو" اور "عمر" کے تلفظ میں جیسا کہ مولانا حامد علی خاں صاحب نے اشارہ فرمایا، یہ فرق ہے کہ "عمر" میں عین مضموم اور میم مفتوح ہے جبکہ "عمرو" میں عین مفتوح اور میم ساکن ہے اور واؤ غیر ملفوظی۔ لیکن نور اللغات میں ("عمرو" کے تحت) یہ تصریح کی گئی ہے کہ یہ لفظ اردو میں بیشتر بفتح اول و دوم زبانوں پر ہے اور غالب کا زیر بحث شعر ہی بطور مثال درج کیا گیا ہے۔

اس تمام پس منظر کو سامنے رکھیں تو بجز اس کے کہ نسخہ نظامی میں "امر" چھپا ہے اور اس نسخے کو غالب کی تصحیح کی روشنی میں چھاپا گیا تھا، اور کوئی دلیل اس کے املائے غالب ہونے کی نظر نہیں آتی۔ اگر غالب کے اپنے ہاتھ کا اسی طرح لکھا ہوا کہیں محفوظ ہے یا اس سلسلے میں کوئی اور مضبوط دلیل ملتی ہے تو اس کا حوالہ دینا بہت ضروری ہے۔ اور اگر نسخہ نظامی ہی اس قیاس کی بنیاد ہے تو یہ بنیاد کسی حد تک وزن رکھنے کے باوجود، حتمی اور یقینی تصور نہیں کی جا سکتی عین ممکن ہے کہ اس نسخے میں سابقہ نسخے کی اغلاط کی اصلاح تو مرزا غالب کی تصحیحات کی روشنی میں کر لی گئی ہو لیکن اس مقام پر سہو کتابت ہو گیا ہو (18) یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ غالب کو اس امر کا گہرا شعور تھا کہ ناموں میں رد و بدل مناسب نہیں۔ تفتہ کو ایک خط میں اس بات پر سرزنش کرتے ہیں کہ سرنامے پر انہوں نے محلہ "حمام کا کنواں" کو "چاہ گرمابہ" لکھا اور فرماتے ہیں کہ "اسماء و اعلام کا ترجمہ فارسی میں کرنا، یہ خلاف دستور تحریر ہے۔" (19) داستان امیر حمزہ، غالب نے فقط سنی نہ تھی کہ التباس سماعی کا امکان ہو، باقاعدہ ان کے مطالعے میں رہ چکی تھی۔ تقریباً اسی زمانے کے لگ بھگ جب نسخہ نظامی طبع ہوا (20) میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں

> "مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آ گئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادہ ناب کی توشک خانے میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔" (21)

نسخہ نظامی کی اشاعت سے قبل اور بعد کی بعض اور تحریروں میں بھی یہ لفظ غالب کے ہاں ملتا ہے اور اسی معروف املا کے ساتھ یعنی "عین" سے ــــ اور اس سلسلے میں کوئی اختلافی نوٹ نظر سے نہیں گزرا۔ چنانچہ خواجہ امان نے "بوستان خیال" کا جو ترجمہ "حدائق انظار" کے عنوان سے کیا اس کے دیباچے میں غالب لکھتے ہیں

> "داستان طرازی منجملہ فنون سخن ہے سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لئے اچھا فن ہے۔ عمرو کی عیاریاں دیکھو، حمزہ کی میداں داریاں دیکھو ـــ" (23)

اسی میں ذرا آگے چل کر مزید لکھتے ہیں

> "معز الدین کی طلسم کشائیاں اگر سنیں تو امیر حمزہ کی یہ صورت ہو کہ اپنی صاحب قرانی کو ڈھونڈتے پھریں اور کہیں پتا نہ پائیں۔ ابوالحسن کی عیاریوں کے جوہر اگر دیکھیں تو خواجہ عمرو کو یہ حیرت ہو کہ زیرہ سی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں ـــ" (24)

علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ۳۰ مئی ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں مرزا نے اپنا ایک فارسی قطعہ نقل کیا ہے جس میں ایک شعر یوں ہے

سر زنبیل آں عمر عیار ، گرز عیاریش خبر داری (25)

یہ قطعہ سبد چین میں بھی شامل ہے (26) اور سبد چین کی اشاعت 1867ء یعنی نسخہ نظامی کے بعد کی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب نے "عمرو" کے سجے خاص اسی مصرع (عمر گیتی سے مرا سینۂ عمرو کی زنبیل) میں کیوں تبدیل کر دئے ہوں گے۔ بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو ، بعد کو طبع ہونے والے دیوان غالب کے اکثر نسخوں میں "امر" نہیں "عمرو" یا "عمر" ہی شائع ہوتا رہا ہے۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ "امر" لکھ کر قارئین کو الجھن میں مبتلا کرنے کے بجائے متن میں "عمرو" ہی ثبت کیا جائے اور حاشیے میں اس کا درست تلفظ بتانے کے ساتھ ساتھ نور اللغات کی وضاحت بھی درج کر دی جائے یعنی یہ کہ یہ لفظ اردو میں بیشتر بفتح اول و دوم زبانوں پر ہے۔ اور اگر "امر" کے املائے غالب ہونے کا کوئی ناقابل تردید ثبوت موجود ہے تو پھر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ، اس کی وضاحت حاشیے میں لائی جانی چاہیے۔

آخر میں ایک عرض اور۔ دیوان کی اشاعت دوم میں اگر فہرست غزلیات کا اضافہ کر دیا جائے تو مفید ہو۔ نیز صفحہ نمبر 16 پر دوسرے شعر میں "بیاباں" کا لفظ سہو قلم سے "بیاباں" بن گیا ہے اسے درست کر دیا جائے۔

حواشی

(1) اورنٹنل کالج میگزین ، فروری 1940ع ، ص 115-116

(2) "خزم" کا لغوی مطلب اونٹ کی ناک میں وہ حلقہ ڈالنا ہے جس میں مہار باندھی جاتی ہے۔ یہ حلقہ چونکہ جسم ایک چیز ہوتی ہے اس لئے اس کی تشبیہہ پر علم عروض میں "خزم" اس اضافے کو کہا گیا ہے جو شعر کے مصرع کے آغاز میں کیا جائے۔ یہ اضافہ زائد از وزن ہوتا ہے اور تقطیع میں شمار نہیں کیا جاتا۔ علمائے عروض ، مصرع کے آغاز میں چار حرف تک اور دوسرے مصرع کے آغاز میں دو حرف تک کا اضافہ "خزم" کے ذیل میں مناسب کیا ہے چنانچہ محیط الدائرۃ میں وضاحت کی گئی ہے کہ

"الخزم و ھو زیادۃ حرف الی اربعۃ اول البیت و حرف اور حرفین فی اول العجز"

(کرنیلیوس فان دیک ، محیط الدائرۃ ، مع الریاض الناضرۃ

مدنی کتب خانہ ملتان ، الفصل الثامن فی العلۃ ، ص 23)

(یاد رہے کہ "خزم" (بازائے ہوز) "خرم" (بارائے قرشت) سے الگ ہے جس میں اضافے کے بجائے کمی ہوتی ہے)

خود جناب نظم طباطبائی اپنی کتاب تلخیص عروض و قافیہ میں اسے زیر بحث لائے ہیں۔ اصل کتاب ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی البتہ اس کے حوالے سے محترمہ ڈاکٹر اشرف رفیع فرماتی ہیں

"خزم کیا چیز ہے؟ اور اس کا فن عروض میں کیا مقام ہے؟ یہ بتاتے ہوئے طباطبائی لکھتے ہیں کہ کوئی مناسب لفظ جو کبھی مصرع کے شروع میں یا کبھی درمیان میں بڑھا دیا جاتا ہے ، جو معنی شعر کی توضیح و تاثیر میں اضافہ کے لئے یا مخاطب کو متوجہ کرنے کے لئے استعمال ہوا ہو ، خزم کہلاتا ہے۔ یہ لفظ وزن و تقطیع میں محسوب نہیں ہوتا۔"

(ڈاکٹر اشرف رفیع ، نظم طباطبائی (حیات اور کارناموں کا تنقیدی مطالعہ ،

الیاس ٹریڈرز ، حیدر آباد (دکن ، دوسری بار 1986 ، ص 201

بحوالہ طباطبائی ، تلخیص عروض و قافیہ ص 53)

اس کے بعد محترمہ ڈاکٹر اشرف رفیع نے غالباً اپنی طرف سے مثال دیتے ہوئے فرمایا ہے :

"مثلاً غالب کے مندرجہ ذیل شعر کو اگر اس طرح سے پڑھیں

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی

جانئے اب کسی بات پر نہیں آتی

اس میں "جانئے" عزم ہے۔۔۔" (بحوالہ بالا)

غالب کے مصرع زیر بحث کے آغاز میں اگر لفظ "دل" کو عزم تصور کر لیا جائے تو اسے تقطیع سے باہر رکھا جا سکتا ہے اور باقی مصرع "رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب" وزن میں آ سکتا ہے اگرچہ یہ توجیہ تکلف سے خالی نہیں۔

(۳) مثلاً دیکھئے زمخشری کی اساس البلاغۃ' ابن منظور کی لسان العرب' اور زبیدی کی تاج العروس۔

(۴) غیاث اللغات کا اندراج یوں ہے

"حسود بفتح اول وضم ثانی ' بدخواہ و بسیار حسد کنندہ ۔ از منتخب و مدار ۔ وبضمتین جمع حاسد و ہم مصدرست بمعنی بدخواستن۔ وبضم اول و ثانی کہ بمعنی حاسد شہرت دارد غلط ست۔ از خیابان۔"

پہلا مفہوم (بدخواہ و بسیار حسد کنندہ) طے شدہ ہے اور اس کی سند منتخب اللغات اور مدار الافاضل سے لائی گئی ہے۔ دوسرا مفہوم (وبضمتین جمع حاسد) محل نظر ہے اور اس کی سند درج نہیں۔ آخر میں "از خیابان" کے الفاظ سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید اس کی سند کا حوالہ بھی یہی ہے۔ مولف غیاث نے دیباچے میں اپنے جن مآخذ کا ذکر وضاحت سے کیا ہے ان میں "خیابان" شامل نہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس سے مراد سراج الدین علی خان آرزو کی خیابان شرح گلستان ہے جسے دیباچہ غیاث میں مولف کے جملے "۔۔۔ و شروح ثقات و دیگر کتب کہ بیان آنہا موجب تطویل ست" کے ذیل میں تصور کرنا چاہئے۔ خیابان میں آخر گلستان کی ایک حکمت "حسود از نعمت حق بخیلست و بندۂ بے گناہ را دشمن میدارد" کی شرح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے

"حسد ' بدخواستن وحسود بضم۔ وبالفتح نعت۔ در صراح ۔ پس حسود بالضم کہ بمعنی حاسد شہرت دارد غلط باشد" (خیابان ' طبع نول کشور لکھنو 1293ھ 'ص 113)

گویا "از خیابان" کہہ کر غیاث اللغات میں جو حوالہ لایا گیا ہے وہ تیسرے اور چوتھے مفہوم (وہم مصدرست بمعنی بدخواستن۔ وبضم اول و ثانی کہ بمعنی حاسد شہرت دارد غلط ست) کا حوالہ تو ہے لیکن دوسرے مفہوم (وبضمتین جمع حاسد) کے لئے کارآمد نہیں۔ اس مفہوم کی سند ' دیباچے کے جملے "۔۔۔ مگر بعض جاایں التزام ترک نیز شدہ است" ' کے بموجب مہیا نہیں کی گئی حالانکہ اسی کی سند سب سے بڑھ کر درکار تھی۔

بہرحال غیاث کے اس اندراج نے رواج پایا۔ فرہنگ اندراج میں اس کو لفظ بلفظ نقل کر دیا گیا ہے اور پھر اردو میں نور اللغات وغیرہ کئی لغتوں میں حسود جمع حاسد درج ہو گیا۔

(۵) یادگار غالب ' غالب انسٹی ٹیوٹ ' نئی دھلی 1986ع ' ص 113-114

(۶) دیوان حافظ شیرازی (از نسخہ محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی) از انتشارات انجمن خوشنویسان ایران ' چاپ دوم ' پائیز 1363 ' ص ۳

(7) دیکھئے اردو لغت (ترقی اردو بورڈ کراچی) "خال و خط" ' "خط و خال" نیز اصل حوالوں کے لئے رجوع کیجئے۔

دیوان ولی (انتخاب محمد خاں اشرف ' مولانا حسرت موہانی) مکتبہ میری لائبریری ' لاہور 1965ء ص 96
مثنوی گلزار نسیم (مع مقدمہ سید وقار عظیم) اردو اکیڈمی سندھ کراچی ' جولائی 1964 ع ' ص 79
مراثی انیس (مکمل) (ترتیب نائب حسین نقوی امروہوی) شیخ غلام علی اینڈ سنز " لاہور 1959
جلد چہارم ص 170 (مرثیہ نمبر 10 " جاتا ہے شیر بیشہ حیدر فرات پر ")
(8) دیوان حافظ شیرازی ' ص 222
(9) ابن منظور ' لسان العرب ' "نعش" ' "الواحد ابن نعش لان الکوکب مذکر فیذکرونہ علی تذکیرہ"
(10) غلام رسول مہر ' نوائے سروش ' شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور س ۔ ن ص 371
(11) یہ مثالیں اردو لغت اور نور اللغات میں "اللہ رے" کے تحت مذکور ہیں۔
(12) طباطبائی ' سید علی حیدر نظم ' شرح دیوان اردوئے غالب "ادارہ فروغ اردو 37 امین آباد پارک لکھنؤ 1977 ع ' ص 384۔
(13) مہر ' نوائے سروش ' ص 825
(14) حسرت موہانی ' شرح دیوان غالب ' الکتاب ' آرام باغ روڈ کراچی ' مارچ 1965 ع ص 198
(15) طباطبائی ' شرح دیوان اردوئے غالب ' ص 384
(16) ایضاً
(17) "عیار" اور "عیاری" کے تصور پر جناب اختر مسعود رضوی کی تحریر " کچھ عیاروں کے بارے میں " کا مطالعہ مفید ہو گا
دیکھئے مقدمہ طلسم ہوش ربا ' خدا بخش اورنٹل پبلک لائبریری ' پٹنہ ' س ۔ ن ' ص 144 - 150
(18) نسخہ نظامی میں سہو کتابت کی گنجائش کو خود مولانا حامد علی خاں صاحب نے تسلیم فرمایا ہے۔ دیکھئے دیوان زیر بحث میں
"حروف آغاز" ص "ج" نیز حواشی ص 80،171-204۔
(19) غالب کے خطوط ' مرتبہ خلیق انجم ' غالب انسٹی ٹیوٹ ' نئی دہلی ' چار جلدیں 1984-1993 ع 264/1۔
(20) مولانا غلام رسول مہر نے داخلی شہادت کی بناء پر اس خط کو جولائی 1861 ع سے پیشتر کا قرار دیا ہے اور منشی مہیش
پرشاد کے قیاس (دسمبر 1862 ع) کو رد کیا ہے۔ جناب خلیق انجم نے بھی 1861 ع سے اتفاق کیا ہے۔ دیکھئے
خطوط غالب : باہتمام غلام رسول مہر ' مطبوعات مجلس یادگار غالب ' پنجاب یونیورسٹی لاہور ' دو جلدیں 1969 ع 385/1
غالب کے خطوط (خلیق انجم) 529/2، 897
(21) ایضاً
(22) یہ اس کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے سال اشاعت 1275 ھ (مطابق 1859 ع) برآمد ہوتا ہے " حدائق الانظار
درست نہیں۔ دیکھئے اردوئے معلی (صدی ایڈیشن) تدوین و حواشی سید مرتضیٰ حسین فاضل ' مجلس ترقی ادب "لاہور
1969-1970 حصہ دوم ' حاشیہ ص 860
(23) خطوط غالب (مہر) 966/2
(24) ایضاً
(25) اردوئے معلیٰ کی بعض اشاعتوں میں یہاں "عمرو" درج ہے۔
(26) سبد چیں (بہ تصحیح و تحقیق سید وزیر الحسن عابدی) ' مطبوعات مجلس یادگار غالب ' پنجاب یونیورسٹی لاہور 1969 ص 82

شیخ الاکبر محیّ الدین ابن عربیؒ

ڈاکٹر منیر الدّین احمد

ابن عربیؒ کا پورا نام، جن کو محی الدین (دین کو زندہ کرنے والا) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، محمد بن علی بن محمد الطائی الحاتمی تھا۔ مشرق میں آپ کو ابن عربیؒ کہتے ہیں (قاضی ابو بکر بن العربی سے تمیز کرنے کی خاطر آپ کے نام کے ساتھ ال نہیں لگایا جاتا) جب کہ مغرب میں آپ ابن العربی اور ابن سراقہ کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ آپ اندلس کے شہر مُرسیہ میں ۲۷ رمضان المبارک ۵۶۰ھ مطابق ۱۱۶۵ء کو ایک معزز عرب خاندان میں پیدا ہوئے۔ جو مشہور زمانہ سخی حاتم الطائی کے بھائی کی نسل سے تھا۔ آپ کے والد مرسیہ کے ہسپانوی الاصل حاکم محمد بن سعید مرذنیش کے دربار سے متعلق تھے۔ ابن عربیؒ ابھی آٹھ برس کے تھے کہ مرسیہ پر موحدون کے قبضہ کر لینے کے نتیجہ میں آپ کے خاندان کو وہاں سے ہجرت کرنا پڑی۔ چونکہ اشبیلیہ پہلے سے موحدون کے ہاتھ میں تھا، اس لئے آپ کے والد نے لشبونہ (حالیہ پرتگال کا دارالحکومت لزبن) میں پناہ لی۔ البتہ جلد ہی اشبیلیہ کے امیر ابو یعقوب یوسف کے دربار میں آپ کو ایک معزز عہدہ کی پیشکش ہوئی اور آپ اپنے خاندان سمیت اشبیلیہ منتقل ہو گئے۔ جہاں پر ابن عربیؒ نے اپنی جوانی کا زمانہ گذارا۔ ابتدائی تعلیم کے مراحل آپ مُرسیہ اور لشبونہ میں طے کر چکے تھے، اشبیلیہ میں آپ کو اپنے وقت کے نامور عالموں کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت ملی۔ مروجہ دینی اور دنیاوی تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ آپ کا بہت سا وقت صوفیا کی خدمت میں گزرتا تھا۔ تصوف کا سلسلہ آپ کے خاندان میں قائم تھا۔ چنانچہ آپ کے چچا ابو محمد عبداللہ بن محمد بن العربی کو اپنی وفات سے تین برس قبل طریقہ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ملی، جس کا سبب ایک نوجوان بنا تھا، جسے خود تصوف کا کوئی علم نہ تھا۔ آپ اپنے گھر کے قریب واقع ایک پنساری کی دوکان پر جا کر بیٹھا کرتے تھے، جو جڑی بوٹیاں بیچتا تھا۔ ایک روز دوکان دار کی غیر حاضری میں آپ وہاں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک خوبرو لڑکا آیا اور آپ کو دوکان کا مالک سمجھتے ہوئے آپ سے ایک خاص پودے کے سفید بیج مانگے۔ آپ ہنس دیئے اور پوچھا کہ وہ کیا ہوتا ہے؟ لڑکے نے کہا کہ اسے ایک تکلیف ہے، جس کا علاج ایک عورت نے اس پودے کے سفید بیج بتایا تھا۔ آپ کے چچا نے کہا کہ میں تمہاری بے علمی کے سبب ہنسا تھا، کیونکہ اس پودے کا بیج سفید نہیں سیاہ ہوتا ہے۔ اس پر لڑکے نے کہا۔ چچا میری اس بارہ میں لاعلمی کا مجھے اللہ کی نظر میں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، مگر آپ کی اللہ سے غفلت آپ کے لئے بہت نقصان کا موجب بنے گی، بالخصوص جب آپ عمر رسیدگی کے باوجود اس کی مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں۔ یہ بات ابن عربیؒ کے چچا کے دل کو لگی اور ان کے اندر ایک انقلاب برپا کرنے اور ان کے طریقہ کی طرف رجوع کرنے کا باعث بنی۔

اسی طرح آپ کے ماموں ابو مسلم الخولانی، جو ساری ساری رات عبادت میں گزارتے تھے اور جب ان کی ٹانگیں تھک جاتی تھیں، تو انہیں چھڑیوں سے مارتے تھے اور کہتے تھے کہ تمہیں مارنا بہتر ہے اپنی سواری کے جانور کو مارنے سے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کیا رسول اللہ صلعم کے صحابہ سمجھتے ہیں کہ حضور صرف ان کے لئے ہیں۔ اللہ کی قسم ہم ان پر اس طرح ہجوم کر

کے آپ کی طرف آگے بڑھیں گے، کہ انہیں پتا چل جائے گا کہ انہوں نے اپنے پیچھے مُردوں کو چھوڑا ہے، جو آپ کے مستحق ہیں (فتوحاتِ مکیّہ ۔ جلد دوم ۔ ص ۱۸)۔

دوسرے ماموں یحییٰ بن یغمان تھے، جو ایک زمانے میں تلمسان کے بادشاہ تھے۔ ان کے زمانے میں ایک عابد زاہد شخص ابو عبداللہ التونسی تھے، جو لوگوں سے کنارہ کش تھے۔ اور تلمسان سے باہر ایک جگہ پر رہتے تھے۔ ایک روز وہ شہر میں جا رہے تھے، جب ابن عربیؒ کے ماموں کا اپنے جاہ و حشم کے ساتھ ادھر سے گذر ہوا۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ شخص عابدِ وقت ہیں۔ انہوں نے اپنے گھوڑے کی لگام کو کھینچا اور شیخ کو سلام کیا، جواب میں انہوں نے بھی سلام کیا۔ بادشاہ لباس فاخرہ میں ملبوس تھا اس نے پوچھا: اے شیخ کیا میرے لئے ان کپڑوں میں، جو میں نے پہن رکھے ہیں، نماز کا ادا کرنا جائز ہے؟ شیخ اس پر ہنس دیئے۔ بادشاہ نے ہنسنے کی وجہ پوچھی، تو کہا تمہاری بے عقلی اور اپنے نفس کو نہ جاننے پر اور تمہارے حال پر۔ میرے نزدیک تم اس کتے کی طرح ہو، جو ایک مردار کے خون میں سونگھتا پھرتا ہے اور اس کی غلاظت کے باوجود اسے کھاتا ہے، مگر جب پیشاب کرتا ہے، تو ٹانگ اٹھاتا ہے تاکہ پیشاب اسے گیلا نہ کر دے۔ تم حرام سے بھرے ہوئے برتن کی طرح ہو، اور اپنے کپڑوں کے بارے میں پوچھتے ہو، جب کہ لوگوں کے مظالم تمہاری گردن پر ہیں۔ بادشاہ رُو دیا، گھوڑے سے اترا اور اسی وقت اپنی بادشاہت سے دستبردار ہو گیا اور شیخ کے ساتھ ہو لیا۔ شیخ نے تین روز تک اسے اپنے پاس رکھا۔ پھر رسی لے کر اس کے پاس آیا اور کہا۔ اے بادشاہ ضیافت کے دن گذر گئے۔ اب اٹھ، جا اور لکڑیاں ڈھو۔ اس کے بعد وہ لکڑیاں اپنے سر پر اٹھا کر لاتا اور انہیں بازار میں لے جایا کرتا تھا۔ لوگ اس کی طرف تکتے تھے اور روتے تھے۔ وہ لکڑیاں بیچتا تھا اور اپنے لئے صرف گذارہ کی رقم رکھتا تھا، باقی کے پیسے وہ صدقہ کر دیتا تھا۔ وہ اس شہر میں اپنی موت تک رہا۔ اس کو شیخ کے مقبرے کے باہر دفن کیا گیا۔ لوگ ابن عربیؒ کی زمانے میں اس کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ جب شیخ حیات تھے اور لوگ ان سے دعا کے لئے کہتے تھے، تو وہ کہا کرتے تھے کہ یحییٰ بن یغمان سے دعا کے لئے کہو، کیونکہ وہ بادشاہ تھے، پھر زہد اختیار کیا۔ اگر میں اس ابتلاء میں ڈالا گیا ہوتا، جس میں وہ ڈالا گیا ہے، تو میں شاید زہد اختیار کرنے میں کامیاب نہ ہوتا (فتوحاتِ مکیّہ ۔ جلد دوم ۔ ص ۱۸)۔

ابن عربیؒ لکھتے ہیں کہ میں نے اس چیز کا مشاہدہ اپنے زمانہ جاہلیت میں کیا تھا (فتوحاتِ مکیّہ ۔ جلد اول ۔ ص ۱۸۵)۔ اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ میرا دخول اس طریقہ میں ۵۸۰ھ میں ہوا، جبکہ آپ کی عمر بیس برس کی تھی۔ (فتوحاتِ مکیّہ ۔ جلد دوم ۔ ص ۴۲۵)۔ اس بارہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ اشبیلیہ کے کسی امیر کبیر کی دعوت میں مدعو تھے، جہاں پر آپ کی طرح دوسرے روساء کے بیٹوں کو بلایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد جب جام گردش کرنے لگا اور صراحی آپ تک پہنچی اور آپ نے جام کو ہاتھ میں پکڑا تو غیب سے آواز آئی: "اے محمد کیا تم کو اسی لئے پیدا کیا گیا تھا؟"۔ آپ نے جام کو ہاتھ سے رکھ دیا اور پریشانی کے عالم میں دعوت سے باہر نکل گئے۔ گیٹ پر آپ نے وزیر کے چرواہے کو دیکھا، جس کا لباس مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ آپ اس کے ساتھ ہو لئے اور شہر سے باہر اپنے کپڑوں کا اس کے کپڑوں سے تبادلہ کیا۔ کئی گھنٹوں تک ویرانوں میں گھومنے کے بعد آپ ایک قبرستان پر پہنچے، جو ایک نہر کے کنارے واقع تھا۔ آپ نے وہاں پر ڈیرا لگانے کا فیصلہ کیا اور ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں جا اترے۔ دن اور رات ذکر الٰہی میں مصروف ہو گئے اور سوائے نماز کی ادائیگی کے وقت کے اس میں سے نہ نکلتے تھے۔ چار روز کے بعد آپ باہر نکلے، تو علوم کا ایک دریا لے کر لوٹے۔ (الدر الثمین فی مناقب الشیخ محی الدین ۔ مصنفہ الشیخ ابراہیم بن عبداللہ القاری البغدادی ۔ بیروت ۱۹۵۹ء ص ۲۲ ۔ ۲۳) آپ نے اس کے بعد اپنے شیخ کی زیر نگرانی ایک نو ماہ کا چلہ کاٹا۔ ابن سَوْدَکین

نے آپ سے روایت کیا: "میری خلوت فجر کے وقت شروع ہوئی اور فتح (اسرار کا کھلنا) طلوع الشمس سے قبل وقوع میں آئی۔ فتح کے بعد مجھ پر "ابدار" کی حالت وارد ہوئی اور اس کے علاوہ دوسرے مقامات ترتیب وار آئے۔ میں اپنی جگہ پر قائم رہا چودہ مہینوں تک اور ان سارے اسرار تک رسائی حاصل کی، جنہیں میں نے فتح کے بعد تالیف کیا ہے۔ اور میری فتح اس لمحہ میں ایک جذب (کی طرح) تھی"۔ (کتاب وسائل السائل۔ مصنفہ شمس الدین اسماعیل بن سَودکین۔ ص ۲۱) یہاں پر ابن عربیؒ نے جس مقام "ابدار" کا ذکر کیا ہے، اس کی تشریح آپ نے دوسری جگہ پر ان الفاظ میں فرمائی ہے: "ابدار کو اللہ نے عالم میں اپنی تجلی کی مثال کے لئے اپنے حکم سے نصب کیا ہے۔ پس وہ خلیفۃ الٰہی ہے، جو عالم میں اللہ کے اسماء اور احکام اور رحمت اور قہر اور انتقام اور عفو کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے، جیسے سورج ظاہر ہوتا ہے چاند میں اور جب وہ پورے کو روشن کر دیتا ہے، تو اس کو بدر (پورا چاند) کہتے ہیں۔ گویا سورج اپنے آپ کو بدر کے آئینے میں دیکھتا ہے"۔ (فتوحات مکیّہ۔ جلد دوم۔ ص ۵۵۶)۔

آپ پہلے پہل سرکاری ملازمت میں کاتب (سیکریٹری) کے عہدے پر فائز تھے، جو دیوان سلطنت کا اہم عہدہ تھا۔ آپ کے والد وزیر ریاست تھے اور آپ کے خاندان کا شمار ملک کے باوقار لوگوں میں ہوتا تھا۔ اپنے روحانی تجربہ کے بعد آپ نے ملازمت سے ہاتھ اٹھالیا اور طریقہ کے دوسرے لوگوں کی طرح فقر کو اپنا شعار بنالیا۔ آپ کے مرشد شیخ یوسف بن یخلف الکومی کو خبر پہنچی کہ ابن عربیؒ اپنا وقت قبرستانوں میں گزارتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کسی موقعہ پر کہا کہ سنا ہے کہ ابن عربیؒ نے زندوں کی مجلس کو چھوڑ کر مُردوں کی مجلس کو اختیار کر لیا ہے۔ ابن عربیؒ نے انہیں پیغام بھیجا کہ آپ خود آکر دیکھیں کہ میں کن لوگوں کے ساتھ مجلس لگاتا ہوں۔ چنانچہ ایک روز وہ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد قبرستان میں گئے، جہاں پر ابن عربیؒ حاضر ہونے والی ارواح کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔ شیخ یوسف دھیرے سے آپ کے پہلو میں جا کر بیٹھے اور ابن عربیؒ نے دیکھا کہ ان کا رنگ فق پڑ گیا تھا۔ ابن عربیؒ نے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا، مگر شیخ یوسف اپنے اندرونی کرب کے سبب مسکرا نہ سکے۔ جب مجلس ختم ہوئی، تو استاد کے چہرے پر رونق لوٹ آئی اور انہیں نے شاگرد کی پیشانی کو چوما۔ ابن عربیؒ نے پوچھا: "استاد کون مُردوں کے ساتھ مجلس لگاتا ہے، میں یا آپ؟" شیخ یوسف نے کہا: "خدا کی قسم میں مُردوں کے ساتھ مجلس کرتا ہوں۔ اگر مجھ پر حال وارد ہو جائے تو میں سب کچھ چھوڑ دوں"۔ اس کے بعد وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ جو کوئی لوگوں سے منہ موڑنا چاہتا ہے، اسے فلاں (مراد ابن عربیؒ) کی طرح کرنا چاہیئے، کیونکہ اس میں عالم الغیب کی استقامت کا علم ہے، اور وہ مخالفت سے نپٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ عالم الوفاق ہے اور اس میں ایسا علم پایا جاتا ہے، جس پر انسانی قویٰ قدرت نہیں رکھتے۔ (فتوحات مکیّہ۔ جلد سوم ص ۴۵)۔

ابن عربیؒ کی غیر معمولی صلاحیت اور علم کا چرچا اندلس میں پھیلنا شروع ہوا، تو مشہور فلاسفر اور قرطبہ کے قاضی القضاۃ ابو الولید ابن رُشد نے آپ کے والد سے کہا کہ کسی وقت اپنے بیٹے کو میرے پاس بھیجیں۔ اس ملاقات کا حال ابن عربیؒ نے فتوحات مکیّہ میں خود ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "میں ایک روز قرطبہ میں وہاں کے قاضی ابو ولید بن رُشد کے پاس گیا۔ انہیں میری ملاقات کا شوق تھا، اس سبب سے، جو انہوں نے میرے بارے میں سن رکھا تھا اور مجھ پر اللہ نے میری خلوت میں جو اسرار کھولے تھے، جن کے بارے میں ان کو پتا چلا تھا۔ وہ ان سنی ہوئی باتوں پر تعجب کا اظہار کرتے تھے۔ میرے والد نے مجھے کسی حاجت کے سلسلے میں ان کے پاس بھیجا، اس قصد کے ساتھ کہ وہ مجھ سے ملیں، کیونکہ وہ آپ کے دوستوں میں سے تھے۔ اور میں ابھی بچہ تھا، میری مسیں ابھی نہ بھیگی تھیں۔ جب میں داخل ہوا، تو وہ محبت اور تعظیم کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے

ہوئے اور مجھ سے معانقہ کیا۔ پھر مجھ سے کہا: ہاں۔ میں نے ان سے کہا: ہاں۔ اس پر ان کو بہت خوشی ہوئی کہ میں نے ان کی بات کو سمجھ لیا تھا۔ پھر میں جان گیا کہ وہ کیوں اس بات پر خوش ہوئے تھے۔ تو میں نے ان سے کہا: نہیں۔ اس پر ان کو انقباض ہوا اور ان کا رنگ بدل گیا۔ اور انہیں اپنے علم کے بارے میں شک پیدا ہوا۔ انہوں نے کہا، تم نے کشف اور فیض الٰہی میں اس امر کو کیسا پایا۔ کیا وہ وہی کچھ ہے، جو ہمیں سوچ و بچار سے ملتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں اور نہ، اور ہاں اور نہ کے مابین روحیں اپنے مواد سے اور گردنیں اپنے اجسام سے اڑتی ہیں۔ ان کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ کانپنے لگے اور بیٹھ کر لاحول پڑھنے لگے اور وہ اس چیز کو جان گئے، جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔ اور یہ عین وہی مسئلہ ہے، جس کا ذکر اس قطب امام یعنی مداوی الکلوم نے کیا تھا۔ اور اس کے بعد انہوں نے میرے والد سے مجھ سے ملنے کو خواہش کا اظہار کیا، تاکہ وہ میرے سامنے اس چیز (علوم) کو پیش کر سکیں، جو ان کے پاس تھی، یہ جاننے کے لئے کہ کیا وہ موافق ہے یا مخالف۔ کیونکہ وہ ارباب فکر اور (اصحاب) نظر و عقل میں سے تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اس بات پر کہ وہ ایسے زمانے میں تھے، جس میں انہوں نے ایک شخص کو دیکھا، جو اپنی خلوت (چلہ) میں جاہل ہوتے ہوئے داخل ہوا اور اس طرح (علم سے مالا مال) خارج ہوا، بغیر لیکچروں کے اور بحث (مباحثہ) کے اور بغیر (تحقیقی) مطالعہ کے اور بغیر (استاد کے سامنے) پڑھنے کے۔ انہوں نے کہا کہ اس بات کو ہم نے (دلائل) سے جانا ہے، مگر ایسے (استعداد رکھنے والے) ارباب کو ہم نے نہیں دیکھا تھا۔ سو اللہ کا شکر ہے کہ میں ایسے زمانے میں ہوں، جس میں ان ارباب میں سے ایک پایا جاتا ہے، جو بند دروازوں کو کھولنے والے ہیں۔ اور اللہ کا شکر اس بات پر کہ اس نے مجھے اس کو دیکھنے کی خصوصیت سے نوازا" (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۱۵۳۔ ۱۵۴)۔

قطب مداوی الکلوم نے اپنے اصحاب کو ایک جگہ پر جمع کر کے جو باتیں کہی تھیں، ان میں سے یہ فقرے قابل غور ہیں اور غالباً ابن عربیؒ انہیں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ آپ نے کہا تھا: "ہر علم کے لئے انسان مخصوص ہوتے ہیں، جنہیں کو نہ تو سب لوگ حاصل کر سکتے ہیں، نہ ہی اس کے لئے وقت میسر ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر گروہ میں مختلف فطرتوں کے لوگ پائے جاتے ہوں اور آپس میں موافقت نہ رکھنے والے اذہان موجود ہوں، اگرچہ اس جماعت کا مقصود ایک ہی ہو۔ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو، اور اس کے ہاتھ میں میرے رمز کی مفتاح ہے۔ اور ہر مقام کے لئے مقال اور ہر علم کے لئے رجال اور ہر وارد کے لئے حال پائے جاتے ہیں" (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۱۵۳)۔

ایک اور ہستی کے ساتھ آپ کا ملنا تصوف کے اعتبار سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اور وہ بھی ایک ایسے وقت میں جبکہ آپ کو طریقہ سے وابستہ ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔ یہ تھے خضر علیہ السلام، جن کے ساتھ اپنی ملاقات کا ذکر ابن عربیؒ نے "فتوحات مکیہ" میں ان الفاظ میں کیا ہے۔ "... اور ہم کو خضر علیہ السلام کے بارہ میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ یوں ہے کہ ہمارے شیخ ابا العباس عریبی رحمۃ اللہ علیہ کے اور میرے درمیان ایک شخص کے بارہ میں ایک مسئلہ جاری ہوا، جس کے ظاہر ہونے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش خبری فرمائی تھی۔ اور اس نے مجھے فرمایا کہ وہ فلاں بن فلاں شخص ہے اور میرے آگے ایک شخص کا نام بیان کیا، جس کو میں نام سے جانتا تھا اور دیکھا نہیں تھا۔ لیکن اس کی پھوپھی کے بیٹے کو میں نے دیکھا تھا۔ اور میں اس کے بیان میں متوقف تھا اور اس کو قبول نہ کیا تھا۔ یعنی اس کے بارہ میں اس کی بات کو میں نہیں مانتا تھا۔ کیونکہ میں اس کے بارہ میں علی وجہ البصیرت تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ شیخ عریبی کا تیر اس پر پھر آیا اور شیخ کو دل میں میری اس بات سے رنج ہوا۔ اور مجھے اس سے کچھ آگاہی نہ ہوئی۔ کیونکہ میں اس وقت ابتدائی حال میں تھا۔ اور میں اس

سے اپنے گھر لوٹ آیا۔ ابھی میں راستہ میں ہی گھر کی طرف آرہا تھا۔ اور ایک شخص مجھے ملا جسے میں نہیں جانتا تھا۔ اور اس نے مجھے ایک بڑے محب مہربان کی طرح پہلے السلام علیکم کہہ کر فرمایا۔ اے محمد تم کو شیخ ابا العباس عربی نے فلاں شخص کے بارہ میں جو کچھ ذکر کیا، وہ سچ ہے۔ اس کی تصدیق کرو۔ اور اس شخص کا نام لیا، جس کا ذکر ابو العباس نے کیا تھا۔ میں نے کہا: بہت اچھا۔ میں نے ان کے ارادہ کو جان لیا اور اسی وقت میں شیخ صاحب مذکور کی طرف لوٹ آیا کہ اس کو اس واقعہ کی اطلاع دوں جب میں شیخ صاحب کے پاس آیا، تو انہوں نے مجھے فرمایا۔ اے ابا عبداللہ جب میں تیرے پاس کوئی مسئلہ بیان کرتا ہوں، تو تیرا دل اس کے قبول کرنے سے متوقف ہو جاتا ہے، تو مجھے تیرے لئے خضر علیہ السلام تک (کی) ضرورت پڑتی ہے کہ وہ تیرے آگے اس بات کو پیش کریں کہ فلاں شخص کی تصدیق کر لو، جو تیرے آگے بیان کیا گیا۔ یہ واقعہ تمہارے لئے ہر ایک واقعہ کے بارہ میں، جو تم مجھ سے سن کر متوقف ہو جاتے ہو، کہاں تک ہوتا رہے گا۔ میں نے کہا: توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ فرمایا: قبولیت توبہ واقع ہو چکی۔ میں نے جان لیا کہ وہ شخص خضر علیہ السلام تھے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ میں نے شیخ صاحب مذکور سے اس بارہ میں پوچھا کہ آیا راستہ میں مجھ سے ملنے والے خضر علیہ السلام تھے؟ فرمایا: ہاں وہ خضر علیہ السلام تھے۔ (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۱۸۶۔ ترجمہ مولوی محمد فضل خان۔ ص ۵۳۵-۶۳۶)۔

ابن عربیؒ نے پہلی بار ۵۹۰ھ میں اندلس کی سرزمین سے باہر کا سفر کیا۔ آپ نے تونس میں ابو القاسم بن قسی، جو الغرب میں المراودون کے خلاف اٹھنے والے صوفیوں کے بانی قرار دیئے جاتے ہیں، کی کتاب "خلع النعلین" کا درس لیا۔ بعد میں آپ نے اس کتاب کی شرح پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا۔ اسی سفر کے دوران آپ کی ملاقات ابو محمد عبد العزیز بن ابو بکر القریشی المہدوی کے ساتھ ہوئی، جن کی فرمائش پر آپ نے اندلس کے صوفیا کے تذکروں پر مشتمل اپنی کتاب "روح القدس" لکھی۔ اس کتاب میں پچپن صوفیا کا تعارف کروایا گیا، جن کے ساتھ آپ کا رابطہ رہا یا جن سے آپ کا شاگردگی کا رشتہ تھا۔ غالباً اسی سفر کے دوران آپکو ابو محمد عبد اللہ بن خمیس الکنانی کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا، جو پیشہ کے اعتبار سے جراح (سرجن) تھے اور جن کا تذکرہ آپ نے اپنی کتابوں "روح القدس" اور "درۃ الفاخرہ" میں کیا ہے۔ ان کی صحبت میں آپ ایک سال سے کچھ کم عرصہ رہے تھے۔ ان سے ملنے کے لئے جاتے ہوئے آپ نے اپنے استادوں ابو یعقوب اور ابو محمد الموروری کی سنت کی پیروی کی اور ان کی طرح ننگے پاؤں چل کر گئے۔ جب آپ نصف فاصلہ طے کر چکے تھے، تو آپ کو ایک شخص مخالف سمت سے آتا ہوا ملا، جس نے بتایا کہ شیخ نے مجھے تم سے ملنے اور یہ پیغام دینے کو کہا ہے کہ اپنی جوتیاں پہن لو۔ انہیں تمہاری آمد کا علم ہو چکا ہے اور انہوں نے تمہارے لئے کھانا بھی تیار کر رکھا ہے۔ اس شیخ کے پاس سے واپسی والے روز آپ کی ملاقات دوسری بار خضر علیہ السلام سے ہوئی۔ جس کے بارے میں آپ لکھتے ہیں: "پھر دوسری بار میرے لئے ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں تونس کی بندرگاہ میں کشتی کے اندر تھا، تو مجھے شکم میں درد پیدا ہوا اور کشتی والے سو گئے تھے۔ اور میں کشتی کے ایک طرف کھڑا ہو گیا اور سمندر کی طرف نظر کی، تو چاند کی روشنی میں دور ایک شخص مجھے نظر آیا۔ یہ رات چودہویں تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ شخص پانی پر چلا آتا ہے اور میرے پاس پہنچ کر میرے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اور ایک قدم اٹھایا اور دوسرے قدم پر تکیہ کیا۔ میں نے اس کے قدم کے نیچے دیکھا کہ اس کو تری پانی کی نہ لگی تھی۔ پھر ایک قدم رکھا اور دوسرا اٹھایا۔ تو دیکھا کہ وہ بھی اسی طرح خشک تھا۔ پھر ان کے ساتھ جو کلام کرنی تھی، وہ انہوں نے فرمائی اور مجھے السلام علیکم فرما کر لوٹ گئے۔ اور بلب دریا ایک بلند ٹیلہ پر جو منارہ واقع ہے، اس کی طرف تشریف لے گئے، جس کی مسافت ہم سے دو میل سے زیادہ تھی۔ انہوں نے اس

مسافت کو دو یا تین قدموں میں طے کیا۔اور میں نے ان کا آواز سنا کہ وہ منارہ کے اوپر اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید میں مشغول تھے اور ہمارے شیخ جراح بن خمیس کنانی کی طرف تشریف لے گئے۔وہ عالی خاندان سے تھے۔اور بندر گاہ عیدون میں رہتے تھے۔ میں ان کے پاس سے اسی رات کو آیا تھا۔جب میں شہر میں داخل ہوا، تو ایک صالح مرد سے میری ملاقات ہوئی۔اس نے مجھے کہا کہ کل رات کو کشتی میں خضر علیہ السلام کے ساتھ آپ کی کیسی گذری۔انہوں نے آپ کو کیا فرمایا تھا (اور آپ نے انہیں کیا کہا تھا)"۔(فتوحات مکیہ۔جلد اول۔ص ۱۸۶۔ترجمہ مولوی محمد فضل خان۔ص ۶۳۶)۔

عین ممکن ہے کہ اس سفر کے دوران آپ کی ملاقات قطب زمان ابو النجا المعروف بہ ابُو مُدیَنْ کے ساتھ بھی ہوئی ہو، جو شیخ ابن خمیس الکنانی کے استاد تھے۔اور جن کے مناقب کا ذکر ابن عربیؒ اپنی کتابوں میں بار بار کرتے ہیں اور ان کا شمار اپنے شیوخ میں کرتے ہیں۔واپسی کے رستے میں آپ تلمسان میں ابو عبد اللہ الطرطوسی سے ملے، جن کے بارے میں آپ کے دل میں گرہ تھی، کیونکہ یہ بات آپ تک پہنچی تھی کہ وہ شیخ ابو مدینؒ کے خلاف تھے۔ایک رات خواب میں آپ کو رسول اللہ صلعم کا دیدار ہوا۔حضور نے پوچھا کہ تم اس شخص سے کیوں کراہت کرتے ہو۔عرض کیا اس کے ابو مدین سے بُغض کرنے کی وجہ سے۔حضور نے فرمایا: کیا وہ اللہ سے اور مجھ سے محبت کرتا ہے؟ عرض کیا: یارسول اللہ وہ اللہ سے اور آپ سے محبت کرتا ہے۔ فرمایا کہ تم کیوں اس کے ابو مدین سے بُغض کرنے کے سبب اس سے بُغض کرتے ہو اور کیوں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرنے کے سبب اس سے محبت نہیں کرتے؟ عرض کیا: یارسول اللہ میں نے اللہ کی قسم خطا کھائی اور غفلت کا مرتکب ہوا مگر اب میں تائب ہوتا ہوں اور میں اس شخص سے تمام انسانوں سے بڑھ کر محبت کرتا ہوں۔جب بیدار ہوئے، تو قیمتی پارچات اور بہت سی نقدی لے کر ان کے دروازے پر پہنچے اور ساری واردات سنائی، جس پر وہ رو دیئے۔انہوں نے تحفے کو قبول کیا اور اس رویا کو اللہ کی طرف سے ایک تنبیہ کے طور پر جانا۔اور ان کے دل سے ابو مدینؒ کے بارے میں ساری کراہت جاتی رہی اور محبت نے اس کی جگہ لے لی۔ابن عربیؒ نے اس کراہت کا سبب جاننا چاہا اور کہا کہ ابو مدین ایک صالح شخص ہیں۔اس نے کہا کہ میں بجایہ میں ان کے پاس تھا، جب عید الاضحیٰ کی قربانی کا گوشت آیا اور انہوں نے سارا اپنے اصحاب میں تقسیم کر دیا اور مجھے اس میں سے کچھ نہ دیا۔اس سبب سے میں ان سے کراہت کرنے لگا۔مگر اب میں نے اس سے توبہ کر لی ہے (فتوحات مکیہ۔جلد چہارم۔ص ۴۹۸۔۴۹۹)۔

خضر علیہ السلام کے ساتھ آپ کی تیسری ملاقات بھی غالباً اسی سفر کے دوران ہوئی، جس کا حال آپ نے اس طرح بیان کیا ہے: "اس تاریخ کے بعد میں بطور سیر نکلا اور بحر محیط کے کنارہ کنارہ چلا جاتا تھا اور میرے ساتھ ایک دوسرا شخص تھا، جو صالحین کے خرق عادات اور کرامات کا منکر تھا۔میں ایک ویران اور ٹوٹی پھوٹی مسجد میں داخل ہوا تاکہ میں اور میرا ساتھی اس میں نماز ظہر پڑھیں۔دیکھا کہ منقطع الی اللہ مردان خدا کی ایک جماعت ہمارے پاس مسجد میں آداخل ہوئی۔اور نماز پڑھنے کا ارادہ فرما رہے تھے۔اور ان میں وہ مرد بھی تھا، جس نے میرے ساتھ دریا پر گفتگو کی تھی اور جس کے بارہ میں مجھے کہا گیا تھا کہ وہ خضر علیہ السلام ہیں۔اور ان میں ایک مرد عظیم الشان بڑے قد والا تھا۔اور میرے اور اس کے درمیان قبل ازیں دوستانہ محبت کی ملاقات ہو چکی تھی۔پس میں کھڑا ہوا اور ان کو سلام کہا۔اور انہوں نے مجھے سلام فرمایا اور میرے ساتھ بہت خوش ہوئے اور ہم کو نماز پڑھانے کے لئے امام بنے۔جب ہم نماز سے فارغ ہوئے، تو امام صاحب نکلے اور میں ان کے پیچھے نکلا اور مسجد کے دروازہ کو آئے۔مسجد کا دروازہ مغربی جانب بحر محیط کے سامنے اس مقام میں واقع تھا، جس کو بکہ کہتے ہیں۔میں ان کے

ساتھ مسجد کے دروازہ پر بات کر رہا تھا۔ اتنے میں وہ شخص ، جس کے بارہ میں میں نے کہا تھا کہ وہ خضر علیہ السلام ہیں، آئے اور مسجد کے محراب میں سے ایک چھوٹی سی چٹائی اٹھا کر زمین سے قریباً سات گز کی بلندی پر ہوا میں بچھا دی اور ہوا میں چٹائی پر کھڑے ہو کر نفل پڑھنے لگے۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا: کیا تم اس مرد خدا کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس نے مجھے کہا کہ آپ چلیں ان سے پوچھیں۔ میں اپنے ساتھی کو کھڑا ہوا چھوڑ کر اس کی طرف آیا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے، تو ان کو السلام علیکم کہا اور اپنے لئے نظم (کی ہوئی) ان کو پڑھ کر سنائی۔ شغل المحب عن الھواء بسرہ۔ فی حب من خلق الھواء و سخرہ (دوست نے محبت کو روک رکھا ہے اور خوش کرتا ہے۔ اس کی محبت میں جس نے ہوا کو پیدا کیا اور اس کو مسخر کیا) العارفون عقولھم معقولۃ۔ عن کل کون ترتضیہ مطھرہ (عارفوں کے عقول معقول ہوتے ہیں۔ ہر ایک کون سے، وہ عقل خدا کو پسند آتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں) فھولدیہ مکرمون وفی الوریٰ۔ احوالھم مجھولۃ و مسترہ (پس وہی اس کے نزدیک باعزت ہیں اور لوگوں میں۔ ان کے احوال مجہول اور چھپے ہوئے ہیں) پس مجھے فرمایا اے فلانے تم نے کیا کیا، تم نے جو کچھ دیکھا وہ اسی منکر کے حق میں تھا، اور میرے ساتھی کی طرف اشارہ فرمایا، جو صالحین کی خرق عادات کا منکر تھا۔ اور مسجد کے صحن میں بیٹھا ہوا اس کو دیکھ رہا تھا، تا کہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ چاہے اور جیسکے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہے۔ پھر میں نے اپنا رخ اس منکر کی طرف کیا اور اس کو کہا کہ تم اب کیا کہتے ہو۔ اس نے کہا کہ اب دیکھنے کے بعد کیا کہا جا سکتا ہے۔ پھر میں اپنے ساتھی کی طرف لوٹ آیا۔ اور وہ دروازہ مسجد پر میرے انتظار میں تھے۔ ایک گھڑی میں نے اس کے ساتھ بات چیت کی اور اسکو کہا کہ یہ کون صاحب ہیں، جو ہوا میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ اور جینے اس سے جو واقعہ قبل ازیں اسکے ساتھ پیش آیا ذکر نہیں کیا تھا۔ تو مجھے فرمایا کہ یہ خضر علیہ السلام ہیں اور پھر چپ رہے۔" (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۱۸۶۔ ترجمہ مولوی محمد فضل خان۔ ص ۹۳۶-۹۳۷)۔

واپسی کے رستے میں آپ عبد اللہ القلفاط سے ملاقات کے لئے جزیرہ طریف میں رکے۔ وہاں پر ان کے درمیان ایک دلچسپ بحث چل نکلی۔ سوال یہ تھا کہ شاکر غنی اور صابر فقیر میں سے کون افضل ہے۔ ابن عربیؒ نے اپنے لئے فقر کا ہی رستہ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "میں کسی حیوان کا ہرگز مالک نہیں ہوں اور نہ ہی اس کپڑا کا، جس کو میں پہنتا ہوں۔ کیونکہ وہ بھی میں معین شخص سے، جو مجھے اس میں تصرف کا اذن دے، بطور عاریت لے کر پہنتا ہوں۔ اور اس زمانہ میں کہ جس میں کسی چیز کا مالک ہوتا ہوں، اسی وقت یا بذریعہ ہبہ کے یا بذریعہ آزاد کرنے کے، اگر وہ چیز قابل آزاد کرنے کے ہو، خارج ہو جاتا ہوں۔ یہ حال مجھے اس وقت حاصل ہوا، جبکہ میں نے خدا تعالیٰ کے لئے عبودیت اختصاص کے تحقق کا ارادہ کیا تھا۔ تو اس وقت مجھے کہا گیا کہ تیرے لئے یہ بات درست نہیں ہو سکتی، حتیٰ کہ تجھ پر کسی کی کوئی حجت قائم نہ ہو۔ میں نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے، تو اس کی بھی حجت مجھ پر نہ ہو۔ تو مجھے کہا گیا کہ یہ بات تمہارے لئے کس طرح درست ہو سکتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی حجت تم پر قائم نہ ہو۔ میں نے کہا کہ دلائل اور حجج منکروں پر قائم کئے جاتے ہیں نہ کہ خدا تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرنے والوں پر دلائل اور براہین اہل دعاوی اور اصحاب حظوظ نفس و مال و متاع والوں پر قائم کئے جاتے ہیں۔ اور جو کہے کہ میرا کوئی حق نہیں ہے اور نہ اموال و متاع دنیا سے کوئی حظ و حصہ ہے، اس پر حجج و دلائل قائم نہیں کئے جاتے"۔ (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۱۴۹)۔ ابن عربیؒ ساری عمر فقر کے اصول پر قائم رہے، جس کا ثبوت وہ واقعہ ہے کہ جب آپ کو قونیہ کے بادشاہ کیکاؤس کی طرف سے ایک مکان بنا کر دیا گیا، جس پر ایک لاکھ درہم صرف ہوئے تھے۔ تو آپ کا قیام اس مکان میں بہت مختصر عرصے کے

لئے تھا۔ کیونکہ ایک روز آپ نے وہ مکان ایک بھکاری کو، جس نے آپ سے بھیک مانگی تھی، یہ کہہ کر دے دیا کہ میرے پاس دینے کو بس یہی ایک چیز ہے (فتوحات مکیہ۔ جلد چہارم۔ ص ۵۴۰)

جب آپ سفر سے اپنے شہر اشبیلیہ واپس لوٹے، تو ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ آپ لکھتے ہیں: "میں نے افریقہ میں جامع تونس سے مشرقی طرف واقع ابن مثنیٰ کے محل میں نماز عصر کے وقت ایک معین دن، جس کی تاریخ میرے پاس ہے، کچھ شعر لکھے تھے۔ پھر میں اشبیلیہ لوٹا۔ اور دونوں شہروں کے درمیان تین مہینوں کا قافلے کا سفر حائل ہے۔ میرا ایک شخص سے ملنا ہوا، جسے میں نہیں جانتا تھا۔ اس نے اتفاقیہ طور پر بعینہٖ وہی اشعار پڑھے، جو میں نے کسی کو لکھ کر نہ بھیجے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اشعار کس کے ہیں۔ اس نے کہا: محمد بن العربی کے، گویا میرا نام لیا۔ میں نے پوچھا کہ اس نے انہیں کب حفظ کیا تھا۔ اس نے عین وہی تاریخ بتائی، جب میں نے انہیں منظوم کیا تھا، اگرچہ اس دوران اتنا وقت گذر چکا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اس کے سامنے انہیں کس نے پڑھا تھا، کہ وہ انہیں حفظ کر سکا۔ اس نے کہا کہ میں ایک رات مشرقی اشبیلیہ میں اصحاب الطریق کی مجلس میں بیٹھا تھا، جب ایک اجنبی شخص کا، جو سیاح لگتا تھا، وہاں سے گذر ہوا۔ وہ ہمارے پاس بیٹھا اور ہم سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے یہ اشعار پڑھے، جو ہمیں بہت پسند آئے اور ہم نے انہیں محفوظ کر لیا۔ پھر ہم نے پوچھا کہ وہ اشعار کس کے ہیں۔ اس نے کہا فلاں شخص کے اور میرا نام لیا۔ پھر ہم نے کہا کہ ابن مثنیٰ کے محل کو ہم اس ملک میں نہیں جانتے۔ اس نے کہا کہ وہ جامع تونس سے مشرق کی طرف ہے اور وہاں پر وہ اس گھڑی منظوم کئے گئے ہیں۔ میں نے انہیں اس سے محفوظ کر لیا۔ پھر وہ ہم سے غائب ہو گیا اور ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی ہمیں پتہ ہے کہ وہ ہم سے کیسے رخصت ہوا اور نہ ہی ہم نے اس کے بعد اسے دیکھا ہے" (فتوحات مکیہ۔ جلد سوم۔ ص ۳۳۸۔۳۳۹)۔

اگلے ہی سال ابن عربیؒ پھر فاس (مراکو) میں تھے، جب الموحدون فوجیں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے اندلس بھیجی گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن عربیؒ کا رجحان زیادہ سے زیادہ شمالی افریقہ کی طرف ہوتا جا رہا تھا، جہاں پر آپ کو صوفیا کی صحبت ملتی تھی، جن کی قربت آپ کی اپنی روحانی ترقی کے لئے اہم تھی۔ مگر اندلس میں آپ کے والدین مقیم تھے اور دوسرے رشتہ دار رہتے تھے۔ آپ کی دو غیر شادی شدہ بہنیں تھیں۔ خود آپ کی شادی غالباً ہو چکی تھی۔ کیونکہ آپ اپنی صالحہ بیوی مریم بنت محمد بن عبدون بن عبد الرحمان البجائی کا ذکر کرتے ہیں، جو ایک امیر کبیر کی بیٹی تھی اور آپ کی طرح طریقہ پر چلنے کی متمنی تھی۔ انہوں نے خواب میں ایک انسان کو دیکھا، جسے انہوں نے کبھی زندگی میں نہ دیکھا تھا، مگر جو کشف میں انہیں نظر آیا کرتا تھا۔ اس شخص نے پوچھا کہ آیا آپ الطریق پر چلنے کی خواہش مند ہیں۔ آپ نے کہا اللہ کی قسم میں ایسا کرنا چاہتی ہوں، مگر نہیں جانتی کہ اسے کیسے اختیار کروں۔ اس شخص نے جواب دیا پانچ باتوں سے: توکل، یقین، صبر، عزیمت اور صدق کے ساتھ۔ ابن عربیؒ نے خواب کو سن کر تصدیق کی کہ یہی صوفیا کا مذہب ہے (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۲۷۸)

۵۹۳ھ میں ابن عربیؒ پھر ایک بار فاس میں تھے، جہاں پر ایک کشف میں آپ کا روحانی درجہ دکھایا گیا۔ آپ بیان کرتے ہیں کہ مسجد الازہر میں، جو عین الجبل کے پہلو میں واقع ہے، آپ نے عصر کی نماز کے دوران ایک نور کو دیکھا، جو ہر چیز کو منور کر رہا تھا۔ جو آپ کے سامنے تھی، جب کہ آپ یہ تمیز بالکل کھو بیٹھے تھے کہ آگے کیا ہے اور پیچھے کیا۔ اور آپ کشف میں جہتوں میں فرق نہ کر سکتے تھے، بلکہ ایک گوب کی طرح تھے اور جہتوں کو صرف ایک مفروضے کے طور پر نہ کہ حقیقی رنگ میں تصور کر سکتے تھے۔ اس قسم کا تجربہ آپ کو پہلے بھی ہو چکا تھا، مگر اس کی کیفیت ایسی تھی کہ آپ کو صرف سامنے کی چیزیں

کھائی دیتی تھیں، جب کہ اس کشف نے ہر طرف کی چیزوں کو ظاہر و باہر کر دیا تھا (فتوحات مکیّہ - جلد دوم - ص ۴۸۶)
ابن عربیؒ ایک مصفا شیشہ کی طرح تھے، جس میں ہر چیز کا عکس پڑتا تھا اور وہ پوشیدہ ترین حقیقتوں کو جان جاتے تھے
آپ کو کشف میں قطب المتوکلین دکھائے گئے، جو آپ کے استاد ابو محمد عبد اللہ الموروری تھے - آپ نے کشف میں دیکھا کہ
توکل کا سارا اسٹیشن ایک چکی کی طرح آپ کے گرد گھوم رہا ہے - ابن عربیؒ نے ان سے ملاقات ہونے پر انہیں اس بارہ میں بتایا
تو وہ مسکرائے اور اللہ کا شکر ادا کیا - اسی طرح ابن عربیؒ لکھتے ہیں کہ انہیں اپنے وقت کے قطب الزمان سے بھی ملنے کی سعادت
ملی - یہ واقعہ ۵۹۳ھ میں فاس میں پیش آیا، جب اہل الطریق ابن الحیوان کے باغ میں جمع تھے اور ان میں الاشعل القبائیلی بھی
تھے، جو بجایہ کے رہنے والے تھے اور ان کا ایک ہاتھ شل تھا - وہ ہر ملاقات پر صرف قرآن کے بارے میں بات کرتے تھے - اور
کسی کو ان کے مقام کا علم نہ تھا - باتوں باتوں میں اقطاب کا ذکر ہونے لگا - ابن عربیؒ نے کہا: بھائیو میں تمہیں اپنے وقت کے
قطب کے بارے میں بتاؤں اور اس شخص کی طرف رخ موڑا، جسکے قطب الوقت ہونے کے بارے میں انہیں اللہ نے خواب
میں اطلاع دی تھی - اس نے کہا کہ وہ بات بیان کرو، جو اللہ نے تمہیں بتائی ہے مگر اس کا نام نہ لینا - جب مجلس ختم ہوئی، تو
وہ آپ کے پاس آیا اور اس بات پر شکریہ ادا کیا کہ ابن عربیؒ نے اس کا راز نہ کھولا تھا - پھر اس نے کہا کہ اب جب کہ تمہیں اس
بات کا پتہ ہے، اس لئے میرا یہاں پر ٹھہرنا درست نہیں ہے - اس کے بعد ابن عربیؒ کی اس کے ساتھ ملاقات نہیں ہوئی
(فتوحات مکیّہ - جلد چہارم - ص ۷۶ - روح القدس میں ان پر علیحدہ باب موجود ہے)

۵۹۴ھ میں فاس کے مقام پر آپ پر خاتم الاولیاء کی حقیقت کھولی گئی (فتوحات مکیّہ - جلد سوم - ص ۵۱۴) - معلوم ہوتا
ہے کہ آپ کو جلد بعد وطن جانا پڑا، جس کا سبب شاید یہ ہو کہ آپ کے والد کی وفات کے بعد، جو غالباً ۵۹۱ھ کے لگ بھگ ہوئی
تھی، آپ پر گھر بار کی ذمہ داری آن پڑی تھی - چنانچہ جب سے آپ کے خاندان نے آبائی وطن مُرسیہ کو چھوڑا تھا، آپ پہلی بار
وہاں پر لوٹ کر گئے، جس کا مقصد وہاں کی جائیداد کو ٹھکانے لگانا ہو سکتا ہے - البتہ رستے میں آپ نے مریہ کے مقام پر، جہاں
ابن عریف (مصنف محاسن المجالس) نے صوفیوں کے لئے تربیتی دائرہ قائم کر رکھا تھا، اپنی کتاب "مواقع النجوم" صرف گیارہ
روز کے اندر تصنیف کی (فتوحات مکیّہ - جلد اول - ص ۳۳۴) - یہ ۵۹۵ھ کی بات ہے - جس سال مُرسیہ کے مقام پر آپ کے
دل میں اللہ کی طرف سے یہ بات ڈالی گئی کہ میرے بندوں کو اس کرم کے بارے میں بتاؤ، جو میں نے تم پر کیا ہے (فتوحات
مکیّہ - جلد اول - ص ۸۰۰)

"الدّرۃ الفاخرہ" میں شیخ صالح العدوی کی سوانح حیات میں ابن عربیؒ لکھتے ہیں کہ شیخ نے آپ سے آپ کی بہنوں کے
بارے میں پوچھا، جن کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی - آپ نے بتایا کہ بڑی کی منگنی امیر ابو الاعلیٰ بن غاذون کے ساتھ ہو چکی ہے -
مگر شیخ نے کہا کہ امیر اور ابن عربیؒ کے والد دونوں اس شادی سے پہلے وفات پا جائیں گے اور ماں اور دونوں بہنوں کی کفالت
ان کے کندھوں پر آن پڑے گی - چنانچہ یہی ہوا اور ہر طرف سے ابن عربیؒ پر زور ڈالا جانے لگا کہ وہ ریاست کی ملازمت اختیار کر
لیں - بلکہ خود امیر المومنین کی طرف سے آپ کو یہی پیغام ملا، جس کے لانے والے قاضی القضاۃ یعقوب ابو القاسم بن تقی تھے
مگر آپ نے انکار کر دیا - آپ کو امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہونے کو کہا گیا - امیر نے آپ کی بہنوں کے بارے میں پوچھا
اور مناسب رشتہ تلاش کرکے خود ان کی شادی کرنے کی پیشکش کی، مگر ابن عربیؒ نے کہا کہ وہ یہ کام اپنے طور پر کرنا چاہتے ہیں،
امیر نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتے ہیں - غالباً اس طرح وہ ابن عربیؒ کے والد کی خدمات کا صلہ دینا چاہتے

تھے ۔جب ابن عربیؒ نے بات ماننے سے انکار کر دیا، تو امیر نے انہیں سوچ کر جواب دینے کو کہا اور اپنے دربان کو ہدایت کر دی کہ جب ان کی طرف سے جواب آئے، تو خواہ دن ہو یا رات اسکی اطلاع انہیں فوراً کر دی جائے ۔ابن عربیؒ وہاں سے رخصت ہو کر گھر لوٹے، تو امیر کا ایلچی امیر کا پیغام لے کر پہنچ گیا، جس میں امیر نے اپنی پیشکش کو دوہرایا تھا ۔آپ نے ایلچی کا شکریہ ادا کیا، اور اسی روز اپنے خاندان سمیت فاس کے لئے روانہ ہو گئے ۔امیر نے چند دنوں کے بعد آپ کے بارے میں پوچھا، تو بتایا گیا کہ آپ فاس کوچ کر گئے ہیں ۔دونوں بہنوں کی شادی آپ نے وہاں پر کر دی اور اس طرف سے فارغ ہو کر اپنی دیرینہ خواہش مکہ کی زیارت کے بارے میں سوچنے لگے ۔آپ کی والدہ کا غالباً انہی دنوں میں انتقال ہوا، کیونکہ آپ لکھتے ہیں کہ انہوں نے بیوگی کے سات سال دیکھے ۔آپ کا ارادہ عرصہ سے مشرق کی طرف کوچ کر جانے کا تھا، مگر ماں اور بہنوں کی ذمہ داری کے سبب اس کو ملتوی کرتے رہے ۔مغرب آپ جیسے عبقری انسان کے لئے بہت محدود تھا ۔اور آپ کو نظر آ رہا تھا کہ جب تک آپ کی پزیرائی مشرق میں نہیں ہو گی، اس وقت تک آپ کا مشن دنیائے اسلام کے اندر نہ پھیل سکے گا۔

مغرب میں یوں بھی صوفیا کے خلاف بہت کچھ زہر پھیل چکا تھا ۔ان کے سیاسیات میں حصہ لینے کے نتیجے میں حکومتیں ان کا قلع قمع کرنے کو پھرتی تھیں ۔ابن عربیؒ نے اشبیلیہ کو جس طرح خاموشی کے ساتھ چھوڑا تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حکمرانوں کے ساتھ تعلق توڑ چکے تھے ۔ایک اور واقعہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ۔" رُوحُ القدس " میں ابو محمد عبد اللہ بن ابراہیم المسلقی الفخار کے تذکرہ میں آپ بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ایک بار سلطان ابو الَعلٰی نے آپ کے لئے اور آپ کے ساتھیوں کے لئے دو روز تک کھانا بھجوایا تھا، جس میں سے آپ نے کچھ نہ کھایا، بلکہ جب پوچھا گیا، تو کہا کہ آپ اس کھانے کو جائز نہیں سمجھتے، کیونکہ وہ حرام کا کھانا ہے ۔یہ بات مقامی لوگوں نے بہت سنگین جانی اور صوفیا کو خطرہ پیدا ہوا کہ شاید سلطان ان کے خلاف کوئی اقدام اٹھائے گا ۔بعد میں آپ کو ابن الطریف نے کہا کہ ایسا سخت رد عمل نہ دکھایا جاتا، تو بہتر ہوتا آپ نے جواب دیا کہ یہ بات اتنی دیر تک ممکن ہے، جب تک انسان کا رأس المال، یعنی دین محفوظ رہے (فتوحات مکیّہ ۔جلد چہارم ۔ص ۵۴۰) ۔

قربت الٰہی کا مقام آپ کو ۵۹۷ھ کے ماہ محرم میں ایک سفر کے دوران ملا ۔جہاں ایک طرف آپ کو اس انعام کی خوشی تھی، وہاں پر دوسری طرف آپ اس مقام میں اپنی تنہائی کو دیکھ کر ڈر گئے ۔آپ کو یاد آیا کہ ابو یزید اس مقام میں مسکینی اور فقر کے ساتھ داخل ہوئے تھے اور کسی کو وہاں پر نہ پایا تھا ۔آپ نے سوچا کہ اس مقام کو اپنا وطن بنانا ہے، تو وحشت کیسی ۔ آخر وطن کے ساتھ ہر کسی کو محبت ہوتی ہے ۔اور وحشت تو بے وطنی سے مخصوص ہے ۔"جب میں اس مقام میں داخل ہو گیا اور اس میں اپنے آپ کو اکیلا پایا، اور میں نے سمجھ لیا کہ اگر کسی کو میرا اس میں ہونے کا پتہ چلے، تو وہ اس کو نہیں جان پائے گا تب میں نے اس کے پہلوؤں اور مخصوصیات کی دریافت شروع کی ۔اور اگرچہ میں اس میں تھا اور اللہ کے اس سے مخصوص کردہ انعامات کو دیکھتا تھا، مجھے پتا نہیں تھا کہ اس مقام کا نام کیا ہے ۔میں حق تعالیٰ کے اوامر کو اپنے پر تواتر سے نازل ہوتے ہوئے اور اس کے سفیروں کو اترتے اور مجھ سے مؤانست کرتے ہوئے دیکھتا تھا" ۔آپ اس حیرت کے عالم میں تھے کہ آپ کی ملاقات انحال کے مقام پر ایک صوفی سے ہوئی اور آپ نے عصر کی نماز جامع مسجد میں پڑھی، جہاں پر امیر ابو یحییٰ بن واجتن آن نکلے، جن کے ساتھ آپ کی دوستی تھی ۔انہوں نے آپ کو اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی ۔مگر آپ ان کے کاتب (سیکریٹری) کے ہاں ٹھہرے، جن کے ساتھ آپ کی مؤانست تھی ۔آپ نے ان کے سامنے اپنے اکلاپے کی شکایت کی ایک ایسے مقام پر ہوتے

دئے، جس میں آپ بہت خوش تھے۔ اور جب کہ وہ آپ کی ڈھارس بندھا رہے تھے، آپ نے ایک شخص کا سایہ دیکھا اور آپ
ن کی طرف اٹھے کہ شاید آپ کو اس کے ذریعے مسرت ملے۔ اس نے آپ سے معانقہ کیا۔ آپ نے غور سے دیکھا، تو وہ ابو عبد
لرحمان السلمی تھے، جن کی روح کو جسم دے کر اللہ نے آپ پر ترس کھاتے ہوئے آپ کی طرف بھیجا تھا۔ "میں نے کہا کہ میں
پ کو اس مقام میں دیکھ رہا ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے یہ مقام پایا اور اسی میں میری موت ہوئی۔ میں اس میں
ہوں اور اس میں رہوں گا۔ میں نے ان سے اس میں اپنی سراسیمگی اور دوستوں کی عدم موجودگی کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ
اجنبی پریشان ہو جاتا ہے۔ اب جب کہ اس مقام کو پانے میں تم پر عنایت الٰہی ہو چکی ہے، تمہیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اور
میرے بھائی، کس کو بھلا یہ مقام ملتا ہے۔ کیا تمہیں یہ بات نہیں بھاتی کہ اس مقام میں خضرؑ تمہارے ساتھی ہوں" (فتوحات
مکیہ۔ جلد دوم۔ ص ۲۱۱)۔

ابن عربیؒ عرش الٰہی کے بارے میں لکھتے ہوئے اپنے ایک کشف کا حال بیان کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں آپ کی
زندگی کا ایک نیا ورق الٹا گیا۔ "جان لو کہ اللہ نے عرش کو نورانی ستونوں پر، جن کی ماہیت کو میں نہیں جانتا، کھڑا کیا ہے۔
البتہ میں نے ان کو دیکھا ہے۔ اور ان کا نور بجلی سے مشابہ ہے۔ اور ساتھ ہی میں نے اسکا سایہ دیکھا، جس میں بے مقدار
راحت ہے۔ اور وہ سایہ اس عرش کے مقعر کا سایہ ہے، جو اس پر مستویٰ کے نور۔ یہی الرحمان ہے، کو چھپاتا ہے۔ اور میں نے
ایک خزانہ کو عرش کے نیچے دیکھا، جس میں سے یہ الفاظ نکلے: لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اور یہ خزانہ آدمؑ تھے، جن پر اللہ
کی صلوات ہوں۔ اور میں نے اس کے نیچے بہت سے دوسرے خزانے دیکھے، جن کو میں پہچانتا تھا۔ اور میں نے خوبصورت
پرندوں کو اس کے اطراف میں اڑتے ہوئے دیکھا۔ اس کے خوبصورت ترین پرندوں میں سے ایک کو میں نے دیکھا۔ اس نے
مجھے سلام کیا، جس سے مجھے کہا گیا کہ اس کو اپنا ساتھی بنا کر مشرقی ممالک کو جاؤں۔ جب مجھ پر یہ ساری بات کھولی گئی، اس
وقت میں مراکش کے شہر میں تھا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ کہا گیا کہ اس کا نام محمد الحصار ہے اور وہ فاس شہر میں ہے،
اس نے اللہ سے مشرقی بلاد کے سفر کی درخواست کی تھی، اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں نے کہا: حکم سر آنکھوں پر۔ میں نے
اس سے کہا کہ اللہ نے چاہا تو عین وہی پرندہ میرا ساتھی ہو گا۔ جب میں فاس شہر میں آیا، تو میں نے اس کے بارے میں پوچھ
بھیجا۔ وہ میرے پاس آیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا اس نے اللہ سے کسی چیز کے بارے میں درخواست کر رکھی تھی۔ اس نے کہا:
ہاں، میں نے کہا تھا کہ مجھے بلاد مشرق پہنچایا جائے۔ اس پر مجھے کہا گیا کہ فلاں شخص تمہیں ساتھ لے جائے گا، اور میں تمہارا اس
وقت سے انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اس کو ۵۹۷ھ میں اپنا ساتھی بنایا اور اسے دیار مصر تک لے کر گیا، جہاں پر اس نے وفات
پائی، اللہ اس پر رحم کرے" (فتوحات مکیہ۔ جلد دوم۔ ص ۴۳۶)

۵۹۷ھ کے ماہ رمضان میں ابن عربیؒ اپنے ساتھی محمد الحصار کی معیت میں بجایہ میں داخل ہوئے۔ اسی سال آپ کے شیخ
ابو النجا۔ المعروف بہ ابن مدینؒ نے، جو اس شہر کے باسی تھے، وفات پائی۔ "عنوان الدرایہ" میں ابن عربیؒ کے اپنے الفاظ میں
ایک خواب کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: "میں نے ایک رات دیکھا کہ میں نے آسمان کے تمام نجوم کے ساتھ نکاح کیا ہے، اور
ان میں سے کوئی ستارہ باقی نہ بچا، جس کے ساتھ میں نے بے حد لذت روحانی کے ساتھ نکاح نہ کیا ہو۔ جب میں اس سے فارغ
ہوا، تو مجھے حروف عطا کئے گئے۔ ان کے ساتھ بھی میں نے نکاح کیا۔ میں نے اپنی یہ رویا ایک شخص کو سنائی، جس نے اس کو
ایک ایسے شخص کے سامنے پیش کیا، جو رویا شناس اور ان کی تعبیر کا ماہر تھا۔ اور میں نے اس شخص سے کہہ دیا تھا، جس نے رویا

کو پیش کرتا تھا کہ میرا ذکر نہ کرے ۔ جب اس نے رویا کو پیش کیا، تو وہ بہت مرعوب ہوا۔ اس نے کہا کہ یہ ایسا سمندر ہے، جس کی گہرائی کو کوئی نہیں جان سکتا۔ اس رویا کے دیکھنے والے پر اوپر والے علوم کھولے گئے ہیں اور علوم اسرار اور ستاروں کے خواص ۔ جس میں اس کے زمانے کا کوئی شخص شریک نہیں ہے ۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے چپ رہا، پھر اس نے کہا کہ اگر وہ شخص اس شہر میں ہے، تو وہ نوجوان اندلسی ہی ہو سکتا ہے، جو یہاں پر آیا ہے (بحوالہ فتوحات مکیہ ۔ جلد چہارم ۔ ص ۵۵۹ ۔ سوانح حیات)۔

بجایہ سے آپ ۵۹۸ھ کو تونس پہنچے، جہاں پر آپ اپنے دوست ابو محمد عبد العزیز بن ابو بکر القریشی المہدوی کے ہاں ٹھہرے، وہاں پر آپ نے آٹھ سال پہلے اپنے قیام کے دوران دوست کی فرمائش پر اپنی کتاب "روح القدس" رقم کی تھی ۔ اس دفعہ بھی آپ نے وہاں پر ایک کتاب "انشاء الدوایر" لکھنی شروع کی، جو آگے سفر پر روانہ ہو جانے کے سبب مکمل نہ کی جا سکی ۔ اس کی تکمیل بعد میں مکہ میں ہوئی ۔ تونس کی یادگار ایک اور واقعہ بھی ہے، جس کا تعلق آپ کی روحانی ترقی سے ہے ۔ آپ لکھتے ہیں: "جب میں اس منزل (منزل زمین کشادہ) میں داخل ہوا، تو میں اس وقت تونس میں تھا ۔ مجھ سے ایسی چیخ نکلی، جس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ مجھ سے یہ امر وقوع میں آیا تھا ۔ سوائے اس کے کہ جس کسی نے وہ چیخ مجھ سے سنی، وہ سب گر کر بے ہوش ہو گئے اور پڑوس کی عورتیں، جو چھت کی سطح پر سے ہم کو دیکھ رہی تھیں، ان میں سے بعض گھر کے صحن میں گر گئیں اور باوجود بلندی کے ان میں سے کسی کو کوئی گزند نہیں پہونچا ۔ ان سب سے پہلے جو ہوش میں آیا، وہ میں ہی تھا ۔ اس وقت ہم ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے ۔ وہاں جس کسی کو میں نے دیکھا، وہ سب بے ہوش تھے ۔ کچھ دیر کے بعد وہ ہوش میں آئے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ تم لوگوں کو کیا ہوا تھا ۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو کیا ہوا تھا کہ آپ نے ایک ایسی چیخ ماری، جس کا اثر آپ اس جماعت میں دیکھ رہے ہیں ۔ میں نے کہا، خدا کی قسم مجھے اس بات کا کچھ پتہ نہیں ہے کہ میں نے ایسی چیخ ماری تھی"
(فتوحات مکیہ ۔ جلد اول ۔ ص ۱۷۳)

تونس سے آپ اپنے ساتھی محمد الحصار سمیت مصر پہنچے، جو وہاں پر وفات پا گئے ۔ آپ کی منزل مکہ تھی، جہاں پر آپ القدس (یروشلم) سے ہوتے ہوئے ۵۹۹ھ میں وارد ہوئے ۔ مکہ آپ کے نزدیک عالم الغیب اور عالم الشہود کا مقام اتصال ہے اور یہیں پر آپ نے اپنی کتاب "فتوحات مکیہ" کی تصنیف کی بنیاد ۵۹۹ھ میں رکھی، جس کی تکمیل ۶۲۷ھ میں جا کر ہوئی ۔ بلکہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے بعد بھی ۶۳۵ھ تک اس میں اضافہ کیا جاتا رہا، جب ابن عربیؒ نے اس کی دوسری نوشت اپنے ہاتھ سے تیار کی ۔ یہاں پر یہ امر ملحوظ رہے کہ لفظ فتح کے عربی زبان میں کئی معانی ہیں ۔ اردو میں عام طور سے اس لفظ سے جنگ میں جیتنا مراد لیا جاتا ہے جب کہ عربی میں فتح کے معنی کھولنے اور راز افشا کرنے کے بھی ہیں ۔ "فتوحات مکیہ"، جس کا پورا عنوان "فتوحات مکیہ فی معرفۃ الاسرار المالکیہ والملکیہ" ہے، سے مراد مکہ کو فتح کرنا نہیں ہے، بلکہ مکہ کے سربستہ رازوں پر سے پردہ اٹھانا اور اس کے روحانی خزائن تک رسائی حاصل کرنا ہے ۔ یہ کتاب ابن عربیؒ کا opus magnus ہے، جس کو آپ نے اپنے عزیز دوست اور تیئیس برسوں کے خادم عبد اللہ بدر حبشی یمنی کے نام معنون کیا ۔ یہ شخص، جو ابو الغنائم ابن ابو الفتوح الحرانی کا آزاد کردہ غلام تھا، کئی ایک مشہور صوفیا کا خادم رہ چکا تھا ۔ ابن عربیؒ اس کے بے حد مداح تھے اور آپ نے اس کا تذکرہ اپنی کتاب "روح القدس" میں علیحدہ طور پر بھی کیا ہے ۔

ابن عربیؒ بار بار اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اپنی تصانیف میں کچھ بھی اپنی طرف سے نہیں لکھتے، بلکہ وہ چیزیں آپ

کے دل میں الہامی طور پر ڈالی جاتی ہیں ۔ "فہرست المؤلفات" میں وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ میں نے دوسرے مصنفین کی طرح کوئی چیز نہیں لکھی ۔ اگر لکھتا ہوں تو محض اپنے آپ کو بچانے کے لئے اس لاوے سے ، جو مجھ پر اللہ کی طرف سے بہتا ہے اور قریب ہوتا ہے کہ مجھے بھون ڈالے ۔ "فتوحات مکیہ" کے ابواب کی ترتیب بھی الہامی ہے ۔ مگر وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ان کی کتاب قرآن کی طرح وحی الٰہی ہے ۔ البتہ اس کتاب کے مضامین اور اس میں بیان ہونے والے نکات مصنف کی غیر معمولی تخلیقی قوت کا پتہ دیتے ہیں ۔ ۵۶۰ ابواب میں تقسیم شدہ کتاب کے اندر زمین اور آسمان کے درمیان پائی جانے والی کون کون سی چیزیں نہیں بیان ہوئیں ، جن کی طرف شاید و باید ہی کسی دوسرے مصنف کی نظر گئی ہو ۔ قاری حیرت زدگی سے منہ کھولے ابن عربیؒ کی دنیا میں داخل ہوتا ہے ، جس میں حجر اسود باتیں کرتا ہے ، بلکہ ایک موقعہ پر کعبہ اوپر کو اٹھتا ہے اور ابن عربیؒ کو اپنی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں ۔ ان کا کلمہ شہادت ایک لڑی کی طرح پرو دیا جاتا ہے اور حجر اسود کے اندر جگہ پاتا ہے ، جس کے لئے ایک طاق پیدا ہو جاتا ہے ۔ پھر ابن عربیؒ کی ملاقات طواف کے دوران ایک فرشتہ سے ہوتی ہے ، جو نہ زندہ تھا ، نہ مردہ ، وہ بیک وقت مرکب اور بسیط اور محاط اور محیط تھا ۔ جو بغیر رمز کے کلام نہیں کرتا تھا ، جس کو فصحا کی فصاحت اور بلغا کی بلاغت نہیں پہنچ سکتی تھی ۔ ہر سوال کا جواب اس پر لکھا ہوا ملتا تھا ، کیونکہ وہ نہ متکلم تھا اور نہ کلیم ۔ اس کا علم اس سے علیحدہ نہیں تھا ، نہ ہی اس کی ذات اس کے اسماء سے غیر تھی ۔ وہ علم تھا اور معلوم اور علیم ۔ وہ ابن عربیؒ کو دعوت دیتا ہے اسکی پیدائش کے اسرار کو اخذ کر کے اپنی کتاب "فتوحات مکیہ" میں لکھنے کی ۔ یہ کتاب ایسی ہے کہ انسان اس کو عادی زمرہ بندی کے کسی بھی سسٹم میں نہیں لا سکتا ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج تک اس کے مضامین کا احاطہ نہیں کیا جا سکا ۔ عبد الوہاب الشعرانی (المتوفی ۹۷۳ ھ) نے "فتوحات مکیہ" کا خلاصہ "لواقح الانوار القدسیہ المنتقاۃ من الفتوحات المکیہ" کیا ۔ پھر اس خلاصہ کا خلاصہ بعنوان "الکبریت الاحمر من علوم الشیخ الاکبر" پیش کیا ۔

مکہ میں ابن عربیؒ کا پہلا قیام دو برس کا تھا ۔ جس کے دوران وہاں کے علمی اور مذہبی حلقوں میں آپ کی وجہ سے ایک غیر معمولی ہلچل پیدا ہوئی ۔ آپ کی تصنیفی سرگرمیوں کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے اس دوران میں اپنی کتاب "روح القدس" کے مسودے کو مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ تین دوسری کتابیں ("مشکوۃ الانوار" ، "حلیۃ الابدال" اور "تاج الرسائل") تحریر کیں ۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آپ نے "فتوحات مکیہ" پر کام شروع کیا ، جس کے ۵۶۰ ابواب کی فہرست ابتدائے کار میں ہی تیار کر لی گئی تھی ۔ مصنف کو اندازہ تھا کہ یہ کام ایک پوری عمر کا متقاضی تھا ۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ آپ کے لکھنے کی رفتار فی روز تین جزو تھی ۔ جس میں آپ سفر یا حضر میں کبھی ناغہ نہ کرتے تھے ۔ آپ نے اپنی مصنفات کی تعداد ۲۵۱ دی ہے ، جبکہ عثمان یحییٰ کی ببلیوگرافی میں آپ کی ۸۴۶ کتابوں کے عنوان درج کئے گئے ہیں ۔

آپ بلند پایہ کے شاعر بھی تھے ۔ مکہ میں آپ کی شاعری اپنے نقطہ عروج پر پہنچی ، جہاں پر آپ کا دوستانہ تعلق ابو شجاع ظاہر بن رستم بن ابو رجا الاصفہانی اور ان کے خاندان کے ساتھ تھا ، جس کی ایک نوخیز لڑکی نظام عین الشمس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ آپ کی شاعری کی روح بنی ۔ خود آپ نے اپنے دیوان "ترجمان الاشواق" میں نظام کا ذکر تعریفی رنگ میں کیا ہے ۔ مگر بعد میں جب آپ پر مخالفوں نے عاشقانہ شاعری کرنے کا الزام لگایا ، تو آپ نے اس کا رد کرنے کے لئے اس دیوان کی شرح ("ذخائر الاعلاق") لکھی ، جس میں ثابت کیا کہ آپ کے اشعار تصوف کے مروجہ طریق سے ذرہ بھر ہٹ کر نہیں ہیں ۔

ابن عربیؒ کو مکہ میں کشفی طور پر خاتم الاولیاء ہونے کی خوشخبری سنائی گئی ، جب کہ اس سے پہلے آپ کو ۵۹۴ ھ میں

فاش میں صرف اس مقام کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں: "میں نے اس قسم کا خواب خود دیکھا اور اسے اللہ کی طرف سے بشارت جانا، کیونکہ وہ حدیث نبوی سے مطابقت رکھتا تھا، جس میں رسول اللہ صلعم نے اپنی مثال دوسرے انبیاء سے دی تھی۔ حضور صلعم نے فرمایا میری مثال انبیاء میں ایسی ہے، جیسے کوئی شخص دیوار بنائے، مگر ایک اینٹ کی اس میں کسر چھوڑ دے۔ اور میں وہ اینٹ ہوں۔ چنانچہ میرے بعد کوئی رسول نہیں ہے اور نہ نبی۔ اس طرح حضور صلعم نے نبوت کو دیوار سے تشبیہ دی ہے اور انبیاء کو اینٹوں سے، جن سے وہ دیوار کھڑی کی جاتی ہے۔ اور یہ تشبیہ انتہائی خوبصورت ہے۔ کیونکہ یہاں پر دیوار مشار الیہ ہے، جس کا ظہور اینٹوں کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ حضور صلعم خاتم النبیین تھے۔ میں ۵۹۹ھ میں مکہ میں تھا، جب میں نے جیسے خواب میں کعبہ کو سونے اور چاندی کی اینٹوں سے بنا ہوا دیکھا، جس میں ایک ایک اینٹ سونے کی اور ایک ایک چاندی کی تھی۔ اور عمارت مکمل ہو چکی تھی اور کوئی کسر باقی نہ تھی۔ جب کہ میں اس کی طرف اور اس کے حسن کی طرف دیکھ رہا تھا، میں نے اپنے رخ کو رکن الیمانی اور الشامی کے درمیانی طرف موڑا، جب کہ رکن الشامی قریب تر تھا، تو میں نے دیکھا کہ دو اینٹیں، سونے اور چاندی کی، دیوار میں موجود نہ تھیں۔ ایک اوپر والی قطار میں سونے کی اینٹ نہ تھی اور اس کے ساتھ والی قطار میں چاندی کی اینٹ کم تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ مجھے ان دونوں اینٹوں کی جگہ پر لگا دیا گیا۔ اس طرح میں عین وہی دو اینٹیں تھا اور دیوار مکمل ہو گئی اور کعبہ میں کوئی نقص نہ رہ گیا۔ اور میں کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا اور مجھے علم تھا کہ میں کھڑا ہوں اور مجھے پتہ تھا کہ میں عین وہ دو اینٹیں ہوں۔ مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ دونوں عین میری ذات تھیں۔ اور میں بیدار ہو گیا اور میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اور میں نے سوچا کہ میں اپنی صنف کے اتباع میں رسول اللہ صلعم کی طرح ہوں، جیسے آپ انبیاء علیہم السلام میں تھے۔ اور ممکن ہے کہ میں وہ ہوں جس پر اللہ ولایت کو ختم کرے گا۔ اور یہ چیز اللہ پر مشکل نہیں ہے" (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۳۱۸۔۳۱۹)۔

ابن عربیؒ ۶۰۱ھ میں مکہ سے روانہ ہو کر بغداد، موصل اور دوسرے شہروں سے ہوتے ہوئے ۶۰۳ھ میں قاہرہ پہنچے، جہاں پر آپ پر ارتداد کا الزام لگایا گیا مگر ایوبی حاکم الملک العادل نے آپ کی جان بچائی۔ ۶۰۴ھ میں آپ پھر مکہ میں وارد ہوئے اور ایک سال تک وہاں پر قیام کیا۔ اس کے بعد آپ ایشیا کوچک چلے گئے، جہاں سے ۶۰۷ھ میں قونیا پہنچے۔ یہاں پر سلطان کیکاؤس نے آپ کا ولولے کے ساتھ استقبال کیا اور آپ کی رہائش کے لئے ایک مکان بنوایا، جسے آپ نے بعد میں ایک بھکاری کو دے دیا۔ قونیا میں آپ کی آمد مشرقی تصوف میں ایک انقلاب کا پیش خیمہ بنی۔ جس کا وسیلہ آپ کے شاگرد اور سوتیلے بیٹے صدر الدین قونوی بنے، جن کی ماں سے آپ کی شادی ہوئی۔ صدر الدین قونوی، جو آگے چل کر تصوف کے علامہ میں شمار ہوئے، مولانا جلال الدین رومی کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ آپ نے ابن عربیؒ کی کتاب "فصوص الحکم" پر شرح لکھی، جو آج تک حرف آخر سمجھی جاتی ہے۔ وہاں سے آپ بغداد تشریف لے گئے، وہاں پر یا جیسے دوسری روایات میں آتا ہے، مکہ میں آپ کی ملاقات شیخ شہاب الدین عمر بن محمد السہروردیؒ سے ہوئی۔ دونوں دیر تک بغیر کچھ کہنے کے ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے رہے، پھر جدا ہو گئے۔ جب بعد میں شیخ شہاب الدینؒ سے پوچھا گیا کہ آپ نے شیخ محی الدین کو کیسا پایا، تو انہوں نے کہا: "میں نے انہیں ایک سمندر کی طرح پایا، جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے"۔ ابن عربیؒ کی رائے شیخ شہاب الدینؒ کے بارہ یہ تھی: "میں نے انہیں ایک عبد صالح پایا" (مناقب ابن عربی۔ ص ۲۹)۔

اسی سال کی بات ہے کہ امیر اشبیلیہ نے بہت بڑی رقم مکہ بھیجی اور اپنے نمائندے کو ہدایت کی کہ اس مال کو سوائے

اس سرزمین کے رہنے والوں کے اور کسی کو نہ دیا جائے۔ اتفاق ایسا تھا کہ اس سال مکہ میں مشائخ، علماء، فقہاء اور ہر فن اور علم کے ماہرین جمع تھے، جیسا دیر دیر تک نہیں ہوتا تھا۔ سب نے ابن عربیؒ کے بارے میں اجماع کیا کہ ان کے سوا کوئی دوسرا مال تقسیم نہیں کرے گا۔ آپ جب اس سے فارغ ہوئے، تو فرمایا: اگر اجماع توڑنے کا خطرہ نہ ہوتا، تو میں اس چیز سے باز رہتا جب وجہ پوچھی گئی، تو جواب دیا: اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود نہ تھی، بلکہ تفاخر۔ صاحب مغرب نے میرے سامنے تمام ملوک پر فخر کرنا چاہا تھا، کیونکہ اسے علم تھا کہ میرے سوا کوئی دوسرا اس مال کو تقسیم نہیں کرے گا۔ یہ بات اشبیلیہ پہنچی تو امیر رو دیا۔ اس نے کہا: شیخ نے درست فرمایا، یہی میرا ارادہ تھا (مناقب ابن عربیؒ۔ ص ۳۳۔۳۴)۔

اگلے برسوں میں ابن عربیؒ نے متعدد سفر کئے۔ ۶۱۲ھ میں آپ مکہ میں تھے۔ اس دوران آپ کے تعلقات صلاح الدین ایوبی کے بیٹے الملک الظاہر کے ساتھ، جو حلب کا حاکم تھا، دوستانہ تھے۔ ایک واقعہ ہے، جس میں آپ اسے ایک شخص کی سزائے موت کو معاف کرنے کی سفارش کرتے۔ پتہ چلتا ہے کہ وہ آپ کی کس قدر عزت کرتا تھا (فتوحات مکیہ۔ جلد چہارم۔ ص ۵۳۹)۔ ۶۲۰ھ میں آپ نے دمشق کو اپنا وطن بنایا، جہاں کے حاکم الملک العادل نے آپکو وہاں پر آکر رہنے کو دعوت دی تھی۔ وہاں پر آپ نے ۲۸ ربیع الآخر ۶۳۸ھ مطابق ۱۲۴۰ء کو وفات پائی اور جبل قاسیون کے پہلو میں دفن کئے گئے، جو آج تک مرجع خواص و عام ہے۔ مجھے ۱۹۷۰ء میں وہاں پر حاضر ہو کر دعا کرنے کی اور ۱۹۸۹ء میں آپ کے مولد مُرسیہ جانے کی سعادت نصیب ہوئی، جہاں پر ابن عربیؒ کی کوئی یادگار نہیں پائی جاتی۔ صرف کھجوروں کا ایک جھنڈ عربوں کے زمانے کی یاد تازہ کرواتا ہے۔

کُتب اور عالمی ثقافت

پطرس بخاری / مرزا حامد بیگ

پطرس بخاری کا یہ مقالہ بہ عنوان "Books and World Culture" کولمبیا یونیورسٹی ، امریکہ کے زیر اہتمام منعقدہ دو روزہ کانفرنس بابت : "عمومی تعلیم میں مشرقی کلاسیک "(12 تا 13 ستمبر 1958ء) کے مندوبین کے اعزاز میں دیئے گئے عشائیہ کے موقع پر 12 ستمبر 1958 کی رات پڑھا گیا

ان دنوں پطرس بخاری ، اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات عامہ کے انڈر سیکرٹری تھے جہاں سے انہیں اپریل 1959ء میں سبکدوش ہو کر کولمبیا یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کا آغاز کرنا تھا ، لیکن 5 دسمبر 1958ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انہوں نے بہ مقام نیو یارک وفات پائی ، یعنی اس مقالہ کو وہ طبع شدہ صورت میں نہ دیکھ پائے۔ بعد میں یہ مقالہ ڈبلیو ایم - تھیوڈور ڈی بیری کی مرتب کردہ انتھالوجی "Approaches to the Oriental Classics" ، مطبوعہ کولمبیا یونیورسٹی پریس ، نیو یارک یونیورسٹی پریس ، نیو یارک ، طبع اول 1959 میں شامل کیا گیا۔ ترجمے کے لیے اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن بابت 1960 کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

پطرس بخاری کا یہ مقالہ ، اردو دنیا کے لئے ایک نادر و نایاب شے کی حیثیت رکھتا ہے ، جسے پہلی بار سامنے لاتے ہوئے ، میں حد درجہ خوشی محسوس کرتا ہوں۔

مرزا حامد بیگ

ان خیال انگیز مباحث کی روشنی میں ، جنہیں آج آپ نے دن بھر چھیڑے رکھا اور جو شاید کل بھی زیر بحث آئیں ، آپ مجھ سے یہ توقع نہ کریں کہ میں کانفرنس کے اس ہلکے پھلکے ماحول میں کوئی نئی یا مفید بات کروں گا۔ ایسے میں اگر کچھ کر سکنے کی توقع ہے تو وہ یہ کہ شاید میں ، کانفرنس کے موضوع سے متعلق اپنی ایک ذاتی رائے کا اضافہ کر سکوں جس کی تشریح اور توضیح آپ اپنے ممتاز تدبر سے کریں گے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ میں اپنی عاجزانہ حیثیت کے ساتھ ایک ایسی کانفرنس میں شریک ہوں ، جس کا تعلق بالخصوص کتب سے ہے۔ ہم کتابوں کے عہد میں زندہ ہیں یہ محض ایک نظری سچائی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ تاریخ میں کسی بھی دور کی نسبت ، آج ہر اس موضوع پر کتابیں موجود ہیں جن کا تصور اس دنیا میں ممکن ہے۔ دراصل ، مجھے کہنا چاہئے کہ ہم الفاظ کے عہد میں زندہ ہیں۔ اگر آپ شائع شدہ الفاظ سے درگزر کریں ، تو پیچھے بچتا کیا ہے؟ وہ لاکھوں الفاظ جو سیاستدانوں ، نشر و اشاعت سے متعلق لوگوں اور پہیلیاں گھڑنے والوں کے منہ سے نکل کر زمینی فضا سے ٹکرا رہے ہیں جنہیں لحظہ بھر کے لئے ہم نظر انداز کر سکتے ہیں۔ یوں میرے خیال میں ، ہم کوئی بہت اہم بات نظر انداز نہیں کر رہے

ہوں گے۔ سو ہمیں کتب کی جانب ملٹ جانا چاہئے۔

ہم میں سے وہ لوگ جو گزشتہ جنگ کے دوران اپنے یا کسی بھی کتب کے اہم ماخذ سے جدا ہو گئے، بہت ممکن ہے کہ وہ دنیا کے دور دراز خطوں میں رہتے ہوں۔ لیکن انہوں نے میرے ہم وطنوں سے قتل، لوٹ مار اور تباہی کے خوف کے ساتھ ساتھ کتابوں سے جدائی کے خوف میں بھی اشتراک محسوس کیا۔ تب کتب بہ کثرت دستیاب نہیں تھیں، طباعتیں محدود ہوتی تھیں اور فوری طور پر ختم ہو جاتی تھیں۔ میں بعض اصحاب کو جانتا ہوں جنھوں نے 1939ء تا 40ء کے ابتدائی پرخطر ایام میں، کتب تک رسائی کی خاطر دشوار گزار مسافرت طے کی۔

لیکن جہاں کتب کی کثرت ایک رحمت ہے، وہیں وہ ایک مشکل بھی پیدا کر دیتی ہے۔ مشکل یہ نہیں کہ کتب موجود ہیں، بلکہ افسوس کہ کتابوں کی بہتات ہے اور انتخاب کرنا ایک مایوس کن کام۔ سر ولیم ہیلے، مدیر لندن ٹائمز، جنھیں آپ بخوبی جانتے ہیں، سال ہا سال مانچسٹر گارڈین میں کتب کے مبصر رہے۔ وہ ان تبصرہ نگاروں میں سے ہیں، جنھوں نے تبصرہ کیا تو کتاب کو پڑھا بھی۔ انہوں نے اپنے ایک لیکچر میں کہا تھا کہ اگر وہ ایک سو صفحات فی گھنٹہ کی شرح سے پڑھیں، جو خیال رہے کہ ایک از حد مشکل کام ہے، اور اگر اسی شرح سے وہ روزانہ چار گھنٹے چالیس برس تک پڑھتے رہیں تب بھی، وہ چھ ہزار کتب پڑھنے کی امید نہیں کر سکتے۔ اس کا مطلب ہے کہ جس شخص نے دس ہزار کتب پڑھی ہوں، کوئی اکا دکا ہی ہو گا۔ یوں کئی لاکھ کتب میں سے محض چھ ہزار کا مطالعہ کرنا بھی ایک نہایت تکلیف دہ عمل انتخاب ہو گا۔

یہ کانفرنس دیگر معاملات کے علاوہ، کتب کے انتخاب کو کسی قدر آسان بنانے کی خواہاں ہے، اور یہ بھی بتانا چاہتی ہے کہ اچھی اور اہم کتب کون کون سی ہیں، جنھیں پڑھا جانا چاہئے۔ میں ہر اس تنظیم، ہر بحث اور دانشورانہ تعاون کا شکر گزار ہوں جو مجھے سونے کی پرکھ کرنا سکھائے، تاکہ کھوٹ سے بچ سکوں۔ اس دور میں، ایک استاد کی سب سے بڑی خدمت یہ ہو گی کہ وہ اپنے آپ کو ایسی کتب تجویز کرنے تک محدود رکھے، جنھیں طلبا کو لازماً پڑھنا چاہئے۔ اسی لیے میں اس نوع کی کانفرنس کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے مقاصد محدود ہیں، لیکن جب آپ اپنی ماہرانہ ترجیحات کو مدنظر رکھیں گے تو بڑے مقصد کا حصول بھی ممکن ہے۔

اب ایک مشترک پہلو بھی ہے ان کتب کا، جنھیں آپ نے قدر شناسی کے تحت منتخب کیا، اور جنھیں آپ لازمی طور پر اگلی نسل کو منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا ایک اخلاقی نقطہ نظر ہے۔ گزشتہ کی روداد میں اسی بات کی خواہش کی گئی، جو حد درجہ قابل قدر ہے۔ وہ جڑے ہوتے ہیں، نیکی اور بدی کے مسائل کے ساتھ، اور ان کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں، جیسا کہ میں بھی، کہ اخلاقی، جمالیاتی اور عظیم، جو ایک ہی بلندی کی مختلف جہات ہیں، یوں ایک کتاب اپنے اخلاقی نقطہ نظر سے انسان کو ہر طرح اوپر اٹھاتی ہے۔ ایسی کتب کا، انسانی رویوں کی جانچ پرکھ کے معاملے سے گہرا تعلق ہے۔ وہ رویے کئی سطحوں پر ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ وہ ان کلاسیک سے ناموافق ہو سکتے ہیں جن کا تعلق دوسری سرزمینوں اور ادوار سے ہے، لیکن ان تمام معاملات میں جواب اہم نہیں ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ وہ سب کے سب وہی ایک اہم سوال اٹھاتے ہیں۔

اچھی بات یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو یاد دلائیں کہ وہی سوال ایک دائمی سوال ہے، جس کا ہر انسان اپنی روح کی تنہائی کے مقدس دائرے میں رہ کر، یا دیگر انسانوں سے ممکنہ مدد لے کر، جواب ضرور تلاش کرے۔ ہمارے عہد اور وقت میں کئی قوتیں ہیں، اور خیال کی کئی لہریں ہیں جو اپنے اثرات میں قدریہ اور جبریہ ہیں، اور ان کا اثر شخصی رویوں کے

تعین اور اعلیٰ اقدار کو قدرے مدہم بنا دیتا ہے۔
میں آپ کے سامنے ایک تجربہ کرنے کی تجویز رکھتا ہوں ' جو میں نے اپنے چند شاگردوں اور دیگر طلبا پر کیا۔ اگر آپ ایک اوسط درجہ کے نوجوان مرد یا عورت سے کہیں کہ وہ مرد یا عورت ذرا سوچ کر چھ انتہائی اہم شخصی اوصاف کا نام لے ' تو آپ کو واضح اور فوری جواب نہیں ملے گا۔ یوں بہت ممکن ہے آپ ان کے لئے گہری الجھن کا سبب بن جائیں۔ سب سے پہلے تو لفظ "وصف" سماعت کے لئے اجنبی ہو گا۔ یہ ایسا لفظ ہے جو رفتہ رفتہ استعمال سے باہر ہو رہا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ ایک اوسط درجے کا طالب علم ' جو ہمارے ماحول میں پل کر جوان ہوا ہو ' وہ اس نوع کے اخلاقی اوصاف ' جیسے شفقت ' محبت ' برداشت کو ذہن میں لانے یا ان کا نام لینے سے پہلے ایک طویل وقت لے گا۔ وہ دوسری بہت سی چیزوں کے بارے میں سوچے گا ' لیکن مجمل طور پر وہ ذہنی الجھاؤ کا شکار ہو کر خیال کرے گا کہ انسانی رویوں کی وہ کونسی خصوصیات ہیں جو اس کو ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔
مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ اخلاقی نقطہ نظر رکھنے والی کتب کو ' بشمول ہم سب کے ' ہر ایک کے سامنے لانے کی شدید ضرورت ہے ' اس حقیقت کے باوجود کہ ان کتب نے پہلے ہی لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی صدیوں تک رہنمائی کی ہے۔ مدت مدید سے مشرق کے ان پڑھ اور جاہل لوگ کتاب کو ایک اہم شے خیال کرتے آئے ہیں۔ میرے بچپن کے آبائی شہر میں ' اور مجھے کہنے دیجئے کہ اب بھی ' آپ ایک ایسے شخص کو ڈھونڈ نکالیں گے جو ان پڑھ ہے۔ ایک کاغذ کے ٹکڑے کو گلی میں پڑا دیکھ کر ' یہ نہ جانتے ہوئے بھی کہ اس پر کیا لکھا ہے ' وہ اس کو احتیاط سے اٹھائے گا اور اس وقت تک اٹھائے رکھے گا ' جب تک کہ کسی دیوار کی درز کو دیکھ کر اس کاغذ کے ٹکڑے کو احتیاط کے ساتھ اس میں ٹھونس نہ دے ' اس لیے کہ اگر کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھا ہوا ہے تو یقیناً تقدیس کا حامل ہو گا اور اسے پاؤں تلے نہیں کچلا جانا چاہئے۔ یہ ہے وہ رویہ جسے وہ کتابوں کے بارے میں روا رکھتا ہے ' اور میرے خیال میں یہی رویہ ہے جسے ہمیں خود اپنے اندر اور اپنے شاگردوں میں اجاگر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مشرق کا کلاسیکی ادب آپ کا مددگار ثابت ہو گا ' اسی طرح دیگر علاقوں کی کتب ہیں۔ میں یہ تاثر نہیں دینا چاہتا کہ اس قسم کا ادب محض مشرق تک محدود ہے۔
آج کی دنیا میں اک دوجے کو سمجھنے کی شدید ضرورت ہے۔ جیسا کہ آج صبح آپ نے ایک فاضل استاد فادر بیری سے سنا کہ ہم ایک مختلف النوع ثقافتوں والی دنیا میں جی رہے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم بیک وقت ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جہاں بہت سی ثقافتوں کا ساتھ ہے ' اس لیے کہ اس قسم کا بیان بے معنی ہے۔ کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا ' جب دنیا میں ایک سے زائد ثقافتیں نہیں تھیں۔ اس لیے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم مختلف النوع ثقافتوں والی دنیا میں جی رہے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہے؟
کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آج ہم میں سے ہر ایک کو آج تو بہت سی ثقافتوں کا سامنا ہے ' جبکہ ایسا پہلے کبھی نہیں تھا۔ درحقیقت ' رواں صدی کے نصف اول میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ' انہوں نے اس قربت کو اتنا سہل بنا دیا کہ اب اس سے فرار ممکن نہیں۔ طباعت کی ترقی ' رنگین فوٹو گرافی کی ترقی (جس نے ان لوگوں کو بھی پینٹنگز مہیا کر دی ہیں ' جو ان کو دیکھ سکنے کی امید نہیں رکھتے تھے) ; اور سب سے بڑھ کر ' سائنٹیفک علم الانسان کی ترقی ' جس نے دیگر ثقافتوں کو کچھ اس طرح ہم سے قریب کر دیا ہے کہ ہم ان کا مطالعہ عاجزی کے ساتھ یا کم از کم کھلے ذہن سے کر سکتے ہیں اور جس

نے ہمیں سکھلایا کہ ثقافتیں، محض اس لیے کہ بدیسی ہیں اور درآمد شدہ بھی، انہیں رد کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ ذہنی بگاڑ پیدا کرتی ہیں۔ ان علما سے کچھ نے اس عمل کو بڑھاوا دیا۔ یوں ہم مختلف النوع ثقافتوں والی دنیا میں بستے ہیں۔ ہم اس کرہ ارض کی ثقافتی یلغار کے ذہنوں پر اثرات سے بچ نہیں سکتے۔ دراصل، کوئی بھی شخص جناب آندرے مالرو کے الفاظ مستعار لے سکتا ہے، جنہوں نے "خیالی عجائب گھر" کی بات کی ہے، جس میں آج کا فن کار بستا ہے۔ آج کا فنکار لیونارڈو داونچی کی نسبت مصوری کے جہان فن سے زیادہ آگاہ ہے۔ جو بات فن کار کے بارے میں سچ ہے، وہ دانشور کے بارے میں بھی سچ ہے، اور جو دانشور کے لئے سچ ہے، وہ عام آدمی کے لئے بھی سچ ہے، لیکن مختلف درجات کی سطح پر یہ حد درجہ اہم ہے، اور ایک کھلا راز، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا سامنا کیسے کیا جائے۔ اس لیے اگر دوسری ثقافتوں کو سمجھنے کی کوشش نہ کی گئی تو ہم یقیناً ایک غفلت کی زندگی گزار رہے ہوں گے۔

میں یہ نہیں مانتا کہ مغرب والے اگر مشرق کا ادب پڑھیں یا مشرق والے مغرب کا، تو زمین پر جھٹ پٹ امن کا دور دورہ ہو جائے گا۔ زمین پر امن کا دور، دل کا معاملہ ہے، نہ کہ دماغ کا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بہت سی غلطیوں سے بچا جا سکتا ہے اور وہ یوں کہ آدمی محرکات سے باخبر ہو، یعنی دوسری اقوام کے اخلاقی اور ذہنی پس منظر سے آگہی رکھتا ہو۔

ان سیاسی مسائل کو لیں، جنہیں آج اسلامی تحاریک نے چھیڑا ہے۔ میرے خیال میں، یہ ممکن نہیں ہو گا کہ کسی طور پر مسلمانوں کی خواہشات اور جذبات کو یا محض عربوں ہی کے جذبات کو قرآن کے مطالعہ کے بغیر سمجھا جا سکے، جس نے نہ صرف ایک مذہب بلکہ ایک نئے سماجی ڈھانچے کے تقاضوں کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں کو سمجھنے کے لئے آدمی کو چار و ناچار اس کتاب کا مطالعہ کرنا ہی پڑتا ہے، جس سے اسلامی معاشرے کا تصور جڑ پکڑتا ہے۔

یقیناً بعض اصحاب ایسے بھی ہوں گے، جو اس امید پر اس نوع کے مطالعے کرتے رہے ہیں کہ کسی طور پر وہ اپنی سمجھ بوجھ ان لوگوں تک پہنچانے کے ذرائع پا لیں، جو عمل کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ جو باعمل ہیں، ان کے پاس سوچنے کا وقت نہیں اور جو سوچتے ہیں وہ عمل کرنے کی سکت نہیں رکھتے، اور یوں ہمیشہ سے یہ مسئلہ رہا ہے کہ صاحب مطالعہ اور تفکر کرنے والوں کے تدبر کو، جو اس گروہ میں واضح طور پر موجود ہے، ان لوگوں تک کیسے پہنچایا جائے جو کہ باعمل ہیں۔ ان کے مابین راہداری اور خلیج کبھی بھی آسان نہیں رہی۔ ہر سکندر اعظم کو ایک ارسطو کیوں کر فراہم کیا جائے؟ اور کیا وہ، ارسطو کی بات پر کان بھی دھرے گا، جب شان و شوکت کے عروج پر ہو گا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ میں مانتا ہوں کہ آپ کے اپنے حلقے میں آپ کی کوششیں ان لوگوں کی بہتر تربیت کر سکتی ہیں، جو عمل کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں اور دنیا میں امن کی بحالی پر قادر ہیں، اگرچہ جنگ کا مکمل خاتمہ ان کے اختیار میں بھی نہیں۔

اگر ہم، ایک قابل عمل اور سیاسی سطح پر بین الاقوامی نظریہ اپنائیں تو دوسری اقوام کی بابت جانکاری، ایک قوم کے لئے عظیم اثاثہ ہو گا۔ میں نہیں مانتا کہ کرہ ارض کی آوارہ خرامی میں امریکیوں سے بڑھ کر کوئی اور ہے۔ کسی حد تک وہ ایسا اس لیے بھی کرتے ہیں کہ ان کے پاس مال و منال بہت ہے۔ لیکن قطع نظر اس کے، میرے خیال میں انہیں آوارہ گردی کا شوق بھی ہے۔ اس کے علاوہ، ان کے نئے فرائض اور دنیا میں ان کا مقام انہیں مجبور کر دے گا کہ وہ دھرتی کے چاروں کھونٹ نظر دوڑائیں اور نہ صرف ہر مقام پر بلکہ ہزاروں گوشوں میں دوسروں سے پہلے پہنچیں۔ یوں، اس قوم کی نوجوان نسل کے لئے کسی بھی دوسری قوم کی نسبت یہ انتہائی اہم معاملہ ہے کہ وہ اس نوع کی باہمی جان پہچان کے لئے بنیادی نوعیت کا کام کرتے ہوئے اپنی آوارہ گردی کی خواہش کو سودمند بھی بنا دے۔

اس قسم کے مطالعے کا ایک اور مقصد بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے فادر بیری کا مقالہ دیکھا ہے، جسے انہوں نے آج صبح پڑھا۔ بہت سے دانشور انہی جیسا نقطہ نظر رکھتے ہیں (اور غالباً اس معاملے میں میرا تعلق ایک غیر نمایاں اقلیت سے ہے) کہ کوئی عالمی ثقافت نہیں ہے، اور یہ کہ عالمی ثقافت ایک خواب نہیں بلکہ ایک سراب ہے۔ جبکہ میرے نزدیک یہ ایک خواب ہے نہ کہ سراب۔ فادر بیری شد و مد سے یہ نقطہ نظر رکھتے ہیں ـــــ اور اسی طرح دوسرے نمایاں مفکرین بھی ـــــ کہ دوسری ثقافتوں کے مطالعے کا بہترین ساز و سامان یہ ہے کہ آدمی اپنی ثقافت میں مضبوط جڑیں رکھتا ہو۔

میرا خیال ہے کہ اس مسئلے پر اختلاف رائے کی اجازت ہونی چاہئے۔ آپ ایک عالم کے بارے میں تصور کیجئے (عالم سے میری مراد ہے تحقیق کرنے والا، کوئی بھی محقق، ایک طالب العلم، ایک استاد) آپ یا تو اس کے بارے میں سوچیں گے، ذن کے عاشق کا تصور کر کے، جو ایک پرکار سے مشابہہ ہے، جس کی ایک ٹانگ مضبوطی سے مرکزے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اور دوسری ٹانگ باہر کی سمت حرکت کرتی ہوئی اور جب ضرورت پڑے تو اپنے مرکز کی جانب پلٹتی ہوئی۔ یا پھر آپ اس کا خیال ایک گنبد کا تصور ابھار کر کر سکتے ہیں، جس میں بہت سی رنگین کھڑکیاں ہوں۔ میں اس کا یہی دوسرا تصور رکھتا ہوں۔ اس میں سبز، نیلی اور زرد کھڑکیاں ہیں، جن میں سے روشنی جب اندر آتی ہے تو شیشے ہی کی رنگت اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن ذہن میں یہ رنگ علیحدہ علیحدہ سطح پر محفوظ نہیں رہتے۔ وہ باہم مل کر ایک نئے، قیمتی اور سبک رنگ میں ڈھل جاتے ہیں، جو میرے عالمی ثقافت کے خواب کی نمائندگی کرتا ہے۔

کیا اس کا حصول ممکن ہے؟ جی ہاں، لیکن یہ اب تک ایک خطرناک اور مشکل کام رہا ہے۔ جو محقق پر ایک عظیم رسالت اور عظیم تنہائی مسلط کرتا ہے۔ اس کام کا کاربند شخص اپنی امت کے افراد کو ہمیشہ اپنے اردگرد نہیں پائے گا بلکہ سات سمندر پار کے براعظموں میں محسوس کرے گا۔ میرے خیال میں یہ اشرافیہ (میں ڈرتے ڈرتے یہ لفظ ایک جمہوری ملک میں استعمال کر رہا ہوں) ہی وہ اشرافیہ ہے جو بالآخر دنیا کے کچھ بدترین مسائل حل کرے گی۔ یہ وہ اشرافیہ نہیں، جس کے اندر ایک شخص کو پیدا ہونا ہے بلکہ کسی کو بھی اس میں داخل کیا جا سکتا ہے، اور اسی لیے مجھے امید ہے کہ جو اعتراضات اس لفظ کو پہلی بار سن کر آپ کے ذہن میں ابھرے ہوں گے وہ بالآخر دب جائیں گے۔ یہ وہ اشرافیہ ہے جس کے ساتھ ہر شخص اپنی سوجھ بوجھ کے حوالے سے جڑا ہوا ہے۔ آج کی دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ جنہیں اگر آپ بین الاقوامی شخصیت کہنا پسند کریں ـــــ جو اندھیرے میں اک دوجے کو اشارت سے بلاتے ہیں ـــــ جب تاریکی چھا جائے ـــــ اور ایک دوسرے سے اخلاقی حمایت حاصل کرتے ہیں۔

اس کا مطلب کسی طور پر بھی وفاداریوں کی فضول خرچی نہیں۔ ہمارے عہد کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وفاداریوں کا از سر نو جائزہ لیا جا رہا ہے۔ دوست داریوں کی حیثیت قدرے کم ہو رہی ہے لیکن تاحال، جیسا کہ جناب ای ایم فورسٹر ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ دانتے، بروٹس کو دوست سے بے وفائی کرنے کے سبب و اصل جہنم کر دیتا ہے۔ اب نئی وفاداریاں، پرانی وفاداریوں کی جگہ لے رہی ہیں اور غالباً ہم سے بہت سے لوگ بے یقینی اور گومگو کی حالت میں ہیں۔ لیکن میں وفاداریوں کی فضول خرچی کا مطالبہ نہیں کر رہا۔ میں تو آگے بڑھنے کی صورت میں، بلند سے بلند وفاداریوں کا طالب ہوں۔

اس سے ہم پر کپکپاہٹ طاری نہیں ہونی چاہئے۔ جیسا کہ جناب جسٹس فرینک فرٹر نے کہا ہے کہ "ایک مہذب انسان کی صحیح پہچان یہ ہے کہ اسے جستجو کرنے والے ذہن سے حاصل کردہ یقین اور طاقت پر اعتماد ہو۔" یہ ہے وہ مضبوط

حصار، جس کے اندر آپ کا قیام ہوگا، نہ کہ یکی اور بے وقعت، سستی وفاداری کی قلعہ بندی، جس کی ہمیں تبلیغ کی گئی۔

یہاں مجھے جناب کلارک کر کا ایک حوالہ بھی یاد آ رہا ہے، جو کہ کیلی فورنیا یونیورسٹی کے ممتاز چانسلر تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ "مشکل اور خطرہ یہ نہیں کہ آج کے دور میں وفاداریاں تقسیم ہوگئیں۔ خطرہ تو یہ ہے کہ شاید آنے والے کل میں وفاداریاں تقسیم ہی نہ ہوں۔ میں ہر فرد واحد پہ زور دوں گا کہ وہ کسی بھی تنظیم میں کلی شمولیت سے بچے۔ "ان کے لفظ "تنظیم" کے متبادل کے طور پہ میں "ثقافت" کا لفظ برتوں گا۔ میں ہر فرد پہ زور دوں گا کہ وہ کسی بھی ثقافت میں کلی شمولیت سے بچے، اور اپنے گرد و پیش کو آزادی سے دیکھے، اس لیے کہ آدم زاد لائق مطالعہ ہے، شاید پانسوں بھرنے کے قابل اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا جنم کہاں سے ہے۔ یہ ہے وہ مقام، جہاں تک ہم لے جانا چاہتے ہیں؟ سیکھنے کے لیے آمادگی، اور گرم جوشی، جو کہ بنیادی عنصر ہے۔

آپ کو یاد دلاتا چلوں کہ آپ کی کارگزاری کوئی جداگانہ منصوبہ نہیں ہے۔ گزشتہ روز، مجھے معلوم ہوا کہ امریکہ میں عام شہریوں کی چھ سو انجمنیں ہیں، جو ایشیائی ممالک سے عملی تعاون کر رہی ہیں۔ چھ سو، بہت بڑی تعداد ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی بھی ملک، غیر ملکی ثقافتوں کا مطالعہ کرنے میں اس کی برابری کر سکتا ہے اور دانشورانہ تعاون بھی ان لوگوں کے ساتھ، جو ان کے ہم وطن نہیں ہیں۔ یہ وہ کامیابی ہے جس پہ آپ ٹھیک ٹھاک فخر کر سکتے ہیں۔ اس لیے آپ نے جو پروگرام ترتیب دیا ہے، وہ جہالت اور ثقافتی بعد کو ختم کرنے کے سلسلے میں حد درجہ اہم ہے۔

ایک بات اور، اسی کے ساتھ میں بات ختم کرتا ہوں۔ ایک سبب یہ بھی ہے، میری جانب سے اس کانفرنس کو خوش آمدید کہنے کا کہ آپ نے مشرقی کلاسیک پہ توجہ مبذول کی۔ آپ کے تعاون، نیز آپ کی کوششوں سے مجوب ہوتے ہونے اور آپ کے چیلنج سے متاثر ہو کر ہم مشرقی لوگوں میں سے چند ایک ـــــ خاص کر میں خود ـــــ توقع کرتا ہوں کہ اپنے ہی کلاسیکی ادب کا مزید مطالعہ کرلیں۔

ادب اور عمرانیات کا تعلق

لالہ رخ لالہ

ادب کی کوئی ایک نہیں بلکہ سینکڑوں تعریفیں ہو چکی ہیں۔کسی نے سیدھے سادے انداز میں تعریف تحریر کی اور کسی نے رنگین پیرایۂ بیان اختیار کیا۔ادب کی جامع تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ ادب وہ ہے جسے لکھتے وقت لکھاری اور پڑھتے وقت قاری مسرت محسوس کرے۔ادب کو اپنے ماحول اور عمرانی اقدار سے جدا کرنا ایسا ہے جیسے بدن سے نفس الگ کر دیا جائے ہم سب جانتے ہیں کہ خارجی ماحول ہمیشہ فن پارے پر اثر انداز ہوتا ہے۔مختلف موسم، تہوار، واقعات اور ایام میں ادب کا رنگ بھی بدلتا جاتا ہے ادیب جس فضا میں سانس لیتا ہے اُسے پوری توانائیوں سے اپنے جسم و جان میں جذب کر لیتا ہے۔وہ گردوپیش کے حالات سے باخبر ہوتے ہوئے بے نیاز رہ ہی نہیں سکتا۔اس کا حسی تجربہ اور خرد کی بصارت زیادہ گہرائی رکھتے ہیں اس لیے اُس کا اظہار سامعتوں کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ادب میں خیالات کے اظہار یا سانچے پر پابندی لگانا وقت طلب ہے۔اکثر اوقات ادیب سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے خیالات اخلاقی جرأت اور ایمانداری سے سپردِ قرطاس کرے۔جناب رضی عابدی فرماتے ہیں:[1]

> "ادب میں کمٹ منٹ سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ ادیب حالات کو صرف پیش ہی نہ کرے بلکہ انھیں مثبت رُخ دینے کی کوشش کرے جس طرح سائنس اور ٹیکنالوجی انسان کے حالات بدلنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح ادب کو بھی حالات بدلنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ادیب کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تحریریں بہت بااثر ہوتی ہیں اور پڑھنے والے پر کوئی نہ کوئی تاثر ضرور پیدا کرتی ہیں۔"

یہ بات درست ہے کہ ادیب جب اپنے گردوپیش نظر ڈالتا ہے تو اُسے ہر طرف "سب ٹھیک" کا بورڈ نظر نہیں آتا بلکہ اکثر منفی رجحانات زیادہ نظر آتے ہیں۔اُس کے عہد کی جڑیں اس کی تخلیقات میں پختہ تر ہوتی چلی جاتی ہیں اس لئے مخلص ادیب اپنے عہد کی عکاسی فطری طور پر خود بخود کرنے لگتا ہے۔اخلاص ادبی تحریر رقم کرنے کی پہلی شرط ہے۔یہاں ڈاکٹر سلام سندیلوی کی کتاب "ادب کا تنقیدی مطالعہ" سے ایک اقتباس باعث دلچسپی ہوگا:[2]

> "اس سلسلے میں رسکن نے ایک بہت اہم اور دلچسپ بات کہی ہے۔اس کا قول ہے کہ ادب میں جس چیز کو لوگ جدت (NEWNESS) کہتے ہیں...... اور اس کو پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل صداقت GENUINENESS ہے۔تحریر میں صداقت پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مصنف وہی بات لکھے جو اس کی نظروں کے سامنے ہو یا اس کے تجربات کے اندر ہو۔"

---

[1] "تیسری دنیا کا ادب" صفحہ نمبر ۱۲۵

[2] "ادب کا تنقیدی مطالعہ" صفحہ نمبر ۱۸-۱۹

بعض لوگ "صداقت" کے لفظ سے بدک جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ادب کو مقصدیت کی آگ میں جھونکا جا رہا ہے یا ادب کو مذہب کے بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے حالانکہ ادیب کے سمعی و بصری مشاہدات و تجربات بھی صداقت سے عبارت ہوتے ہیں۔ پھر ادب کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ضرور ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ادب کا مقصد حصولِ حسن و مسرت ہے تو یہ تسکین و سرشاری بجائے خود ایک مقصد بن جائے گی۔ گویا ایک شاہکار تصویر، ایک لافانی نغمہ، ایک روح افزا رقص، ایک لاجواب نمونۂ سنگ تراشی یا ایک دلربا مجسمۂ حسن سے کشید کی جانے والی مسرت اور اہتزاز بھی مقصد ہی کی صف میں شامل ہیں تو بھی لفظ یا مقصد یا مقصدیت کو مخصوص شعبوں ہی سے کیوں منسلک سمجھا جائے بقول ڈاکٹر سید عبداللہ[1]

> "رسکن کہتا ہے کہ فنون محض تفریح و تفنن کے لئے نہیں، ان کا ایک سنجیدہ مقصد بھی ہے اس لئے فنکار اور فن شناس یا تو ان سے دست کش ہو جائیں یا پھر ان سے صحیح واسطہ رکھیں۔ ان کی ماہیت اور حدود کو سمجھ کر ان کی روح تک پہنچیں۔ فنون بذاتِ خود اہم ہیں اور خود ہی اپنا مقصد ہیں، اُن کو کسی اور مقصد کا ذیلی وسیلہ نہیں بنایا جا سکتا ـــــ ہاں ایک اور سطح پر اور ایک دوسرے لحاظ سے یہ زندگی کے لئے مفید ہیں اور اس کے خادم بھی ہیں۔"

بعض اوقات یہ بھی فرض کر لیا جاتا ہے کہ اپنے عہد کے بارے میں تخلیق کئے جانے والے ادب میں محدودیت پیدا ہو جاتی ہے جبکہ تخلیق کو زمان و مکان کی قید سے آزاد رکھنا ضروری ہے۔ "جذبہ" ہر عہد کے انسان میں متحرک رہا ہے اور جذبے کی کارفرمائی سے آتشیں احساسات نے جنم لیا ہے۔ ہومر نے اپنے عہد کی عکاسی کی ہے۔ جہاں تک "ایلیڈ" میں دیوتاؤں اور غیر مرئی مخلوق کا تذکرہ ہے وہ عملاً ختم ہو چکا ہے مگر دلکش امثال بن کر اب پاروں میں اب بھی زندہ ہے۔ البتہ وہ جذبہ، وہ حسن و جمال، وہ خیر و شر کی کشمکش، نفرت و حقارت کے شعلے، سپردگی و بے خودی کے چشمے، بغض و حسد کے زہرناک تیر، عشوہ و غمزہ کا حسن دل افروز، آج بھی اپنے اندر ابدی و آفاقی کشش لئے ہوئے ہے۔ اسی طرح عہدِ جدید "الف لیلیٰ و لیلہ" کے جن، پریاں، بھوت پریت، باندیاں، غلام، شہنشاہیت، قتال و جدال کی اہمیت باقی نہیں نہیں مگر اس امر سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انسانی ذہن کی تخیل آرائی یا تمثال آفرینی کے باعث آج بھی اس کا حسن و جمال ترغیب آور معلوم ہوتا ہے۔ انسان جب تک زندہ ہے ہر عہد میں اس کے جذبے (خواہ کسی بھی شکل میں ہوں) ساتھ ساتھ زندہ ہیں۔ ادیب مثبت جذبوں کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ انسان کی ذہنی ارتقائی حالت میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ منفی جذبوں کی نفی کر دے۔ یہ تو مکمل طور پر ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ نور کے ساتھ ظلمت، اماوس کے ساتھ پونم، رات کے ساتھ دن اور وحشت کے ساتھ انسانیت متوازی شاہراہوں پر گامزن ہیں مگر اپنے اپنے عہد کی ضرورتوں کے مطابق ادیب فیصلہ کر سکتا ہے۔ فاخر حسین کہتے ہیں[2]:

> "ادیب کو چاہیئے کہ اپنے عہد کے لئے لکھے۔ عظیم آدمیوں نے یہی کہا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادیب خود کو اپنے عہد میں مقید کر لے۔ اپنے عہد کے لئے لکھنے کا مطلب عہد کی انفعالی طور پر عکاسی کرنا نہیں بلکہ اس کے برخلاف اُسے بدل دینے کی شعوری کوشش ہے۔ یوں ادیب اپنے عہد سے آگے مستقبل کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ اپنے عہد کے بدل دینے کی کوششیں ہماری جڑیں اپنے عہد میں مضبوط کر دیتی ہیں اس لئے کہ "عہد متحرک ہے"۔ اس کو مردہ آلات یا رسوم بنا کر منجمد نہیں کیا جا سکتا۔"

ہر عہد گزر جانے والا ہے اور ادب کو تاریخ بن جاتا ہے۔ اس عمل کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ڈارون نے نوعی جبر کی بات کی، جبکہ یُنگ نے نفسیاتی جبر کی کارفرمائی کو واشگاف کیا، فرائڈ نے نفسیات کو ادب پاروں میں تلاش کر لیا، مارکس اور فریڈرک اینگلز نے تاریخی و اقتصادی جبر کی نشاندہی کی۔ انیسویں صدی میں ادیب جبر کی مہیب زنجیروں سے آگاہ ہوا تو کراہ اٹھا لیکن اُس نے بھی فراکاداستہ

---

[1] "اشارات تنقید" صفحہ نمبر ۱۰۲

[2] "ادب اور ادیب" ترجمہ و تالیف فاخر حسین، صفحہ نمبر ۲۹

اختیار کیا۔ فرار ہمیشہ ادب برائے ادب کو جنم دیتا ہے بعض اوقات اوٹ پٹانگ نظریات کا مجموعہ بن کے رہ جاتا ہے۔ ادب برائے ادب کا نعرہ لگانے والے ادیب حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ وہ اپنے عمرانی ماحول سے فرار حاصل کرتے ہیں۔ غم روزگار، غم جاناں اور غم حیات کے عفریت قوی الجثہ نظر آنے لگتے ہیں۔ ایسے میں کوتاہ ہمتی جنم لیتی ہے جس کے جلو میں عالم تخیل آباد ہو جاتا ہے۔ تخیل کی یہی جلوہ افروزی لفظوں میں متشکل ہو کر عام قاری کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ ادیب عجیب و غریب توجیہات کرنے لگتے ہیں۔ بعض ادیب مذہبی تخلیقات میں پناہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ ہمارے عہد میں ادب اسی خوف کا شکار ہیں۔ ناسازعہ حالات کی وجہ سے وہ کھل کر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے۔ معاشرت کی من و عن تصویر پیش نہیں کر سکتے تو کم از کم علامتوں کا نقاب تو اوڑھ ہی سکتے ہیں۔ آج کا سچا ادیب زیر زمین جا چکا ہے۔ المناک فضاؤں کا مقابلہ کرنا ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتا۔

ہر عہد کا ادب ذہنی ارتقاء کی کڑیاں محفوظ کئے رکھتا ہے۔ جوں جوں انکشافات و انقلابات کی راہیں ہموار ہوتی ہیں، ادبا کے زاویہ ہائے نگاہ بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پتھر کے زمانے میں صرف تصاویر کا کھوج ملتا ہے جو کہ محض نقل ہیں اور اگر افلاطون کے فلسفہ اعیان سے اعتناء کر لیا جائے تو نقل کی نقل ہیں مگر ان تصاویر سے اُس عہد کا انسان، اُس عہد کے جانور، اُس عہد کے شکار کرنے کے مناظر، مروجہ رسوم و رواج کی عکاسی ہوتی ہے جبکہ زرعی انقلاب کے بعد تمدن کا بتدریج ارتقاء ہمیں تحریروں کے ذریعے نظر آتا ہے۔ مذہبی اعتقادات، انسانی رشتے، مختلف جذبے، فنون لطیفہ کے پیمانے، طبقاتی تقسیم، مفادات کے لئے خونریزی، ملوکیت کے ڈھنگ، سمیری، اشوری، فنیقی اور عبرانی تحریروں میں محفوظ ہو گئے۔ پھر صنعتی انقلاب برپا ہوا تو تہذیب کی ترقی کے نئے نئے باب کھل گئے۔

"کسی تہذیب کے ارتقاء اور اس کے کمال پر پہنچنے کا اندازہ تین باتوں سے ہوتا ہے۔ ایک فکر کی پختگی، دوسرے زبان کی صلاحیت اور تیسرے شعور کی پختگی۔"[۱]

ہر عہد کا ادب ان خصوصیات سے بہت حد تک آراستہ نظر آتا ہے۔ یہاں مذہبی اعتقادات سے صرف نظر کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ مذہب نے ہر دور کے ادیب و فن کار پر گہرے نقوش مرتب کئے ہیں۔ ہر مذہب بنیادی طور پر رواداری، بھائی چارہ، امن، محبت، صداقت، خیر، غریب پروری اور عدل و انصاف کا درس دیتا رہا ہے اس لئے یہ بنیادی اکائیاں ہر کہیں اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ اب جبکہ علوم نقلیہ کی پرچھائیاں دھندلی پڑتی جا رہی ہیں، تب بھی اعلیٰ انسانی اقدار ہی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ سچ بولنا بری بات ہے یا عدل پر ذہنی غلامی کو فوقیت دینا چاہیئے یا کمزور کو قتل کر دینا چاہیئے۔

معدودے چند افراد نے یہی طرز فکر اپنایا ہے چنانچہ موجودہ عہد میں محنت کشوں اور کسانوں کی جدوجہد کے گن گائے جا رہے ہیں۔ ہر خطہ ارض کا باشندہ جانتا ہے کہ زندگی کی بنیادی ضروریات کیا ہیں اور ان کی زیست میں کیا اہمیت ہے اور اگر یہ ہر انسان کو میسر نہیں تو اس کی کیا وجہ ہے اور انھیں کیونکر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ادیب اپنے ماحول اور اپنی عمرانی فضا سے ہٹ کر سوچ بھی نہیں سکتا۔ آج کشمیر میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں کشمیری ادیب عشق و محبت کی داستانیں کیسے رقم کر سکتا ہے۔ آج فلسطینی دربدر پھر رہے ہیں۔ فلسطینی ادیب کا قلم انگارے برسا رہا ہے تو تعجب کیسا۔ بوسنیائی ادیب کے قلم جنگی ترانے لکھ رہے ہیں تو یہ عین فطرت ہے۔ ایک ہی ملک کے مختلف طبقے مختلف ماحول کی وجہ سے جدا جدا طرز فکر رکھتے ہیں۔ ادب ہر طبقے کے افکار اپنے وسیع دامن میں سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ تاریخی جبر کی مثالیں بھی ادب میں مل جاتی ہیں۔ مثلاً سونا ہر عہد میں انسانی آنکھ میں چکاچوند پیدا کرتا رہا ہے۔ حریصوں کے لئے قابل قدر

---

[۱] تیسری دنیا کا ادب" (رضی عابدی) صفحہ نمبر ۱۶۲

اور درویشوں کی بے بسی کے باعث قابلِ مذمت رہا ہے۔ شیکسپیئر نے "ٹائمون آف ایتھنز" میں اسی سونے سے مخاطب ہو کر کہا:

> "سونا، تو خدا کا جلوہ ہے۔ پیلا چمکیلا قیمتی سونا تیری کثرت سیاہ کو سفید، ناجائز کو جائز، غلط کو صحیح، ذلیل کو شریف، بوڑھے کو جوان، بزدل کو بہادر بنا دیتی ہے۔ مذہبوں کو جوڑا اور توڑ دیتی ہے، مردود کو محبوب بنا دیتی ہے۔ کوڑھی کو پوجا کراتی ہے۔ چوروں کو عزت خطاب اور مرتبہ بخشتی ہے۔ آ، او لعنتی مٹی! بنی نوع انسان کی مشترکہ بیسوا! جو قوموں کے راستے میں روڑے اٹکاتی ہے، میں تجھے تیری حقیقی فطرت پر چلاؤں گا۔"

درج بالا سطور میں صرف ایک ادیب کی تخیل آرائی ہی نہیں بلکہ اس کے معاصر معاشرے کی جھلک بھی موجود ہے۔ عام لوگوں کے رجحانات کشش وجذب کی عکاسی بھی موجود ہے اور پھر ایک ادیب کا احساس بھی جو غلط رویوں کے خلاف عزم جہاد کا ارادہ باندھتا دکھائی دیتا ہے۔ ادب کو محض تفریح و تفنن کا ذریعہ سمجھ لینا قرینِ دانش نہیں ہے۔ رسکن نے ادب اور دیگر فنون کو "سنجیدہ مقصد" سے تعبیر کیا تھا۔ محض دل لگی کے طور پر ادب کا استعمال فن اور قاری، دونوں کے ساتھ سنگین مذاق ہے۔

> "مشرقِ وسطیٰ اور دیگر بیرونی ممالک میں مقیم پاکستانی جو روپیہ اندرونِ ملک بھیجتے ہیں اس سے زرِ مبادلہ کے ذخائر کتنے بڑھتے ہیں اور افراطِ زر میں کتنا اضافہ ہوتا ہے اس کا اندازہ تو وزیرِ خزانہ کی بجٹ تقریر سے ہو جاتا ہے مگر اس کے نتیجے میں ہمارے اخلاقی اور سماجی ڈھانچے اور قدروں کو جس طوفان کا سامنا ہے، اس کی خبر ہمارا افسانہ دے رہا ہے۔"[1]

افسانہ نگار، ناول نگار، شاعر اور دیگر فنکار معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ سے عام قاری کو آگاہ رکھنے کی کوششیں جاری رکھتے ہیں چنانچہ عمرانی اقدار ادب کے رگ و ریشے میں لہو کی طرح رواں دواں نظر آتی ہیں۔ عہدِ جدید میں سہولیات کی فراہمی نے کرۂ ارض کو باہم ایک لڑی میں پرو دیا ہے اس لئے موجودہ عہد کے ادب میں بین الاقوامی سطح کی عمرانی اقدار بھی جھلکتی نظر آ جاتی ہیں۔ یہ اقدار سفرناموں کی صورت میں یا مجموعہ ہائے خطوط کی شکل میں زیادہ واضح ہو گئی ہیں۔ ہمارے عہد کے ادیب کا منصب یہی ہے کہ وہ عمرانی اقدار کی ناہمواریوں کی عکاسی کرتے ہوئے اذہان میں بہتری کے اشارے فراہم کرے۔ جب تک معاشرہ صاف ستھرا نہ ہو، اعلیٰ اقدار کی برتری نہ ہو، اس وقت تک ادباء اپنے فرض سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔

---

[1] اردو افسانہ، تحقیق و تنقید۔ ڈاکٹر انوار احمد

مخمور جالندھری — ایک بھرپور شخصیت

بلراج کومل

مخمور جالندھری، کرنل رنجیت، زور آور سنگھ اور دوسرے کئی قلمی نام ایک ایسے شخص کے تھے جس کا اصل نام گوربخش سنگھ تھا اور جو جسمانی ساخت اور ذہنی، جذباتی اور فکری کشادگی اور کثیر الجہتی کے اعتبار سے اتنا ہی بڑا تھا جتنا بڑا تمام ترکیفیاتِ توازن و عدم توازن، تضاد و عدم تضاد کے ساتھ کوئی بھی مظہرِ حیات ہو سکتا ہے۔ یکم جنوری ۱۹۷۹ء کو جب مخمور جالندھری کی وفات ہوئی تو ان کے گھر کے لوگوں کے بیان کے مطابق ان کی عمر کم و بیش ۶۴ برس تھی۔ کسی ٹھوس ثبوت کی عدم موجودگی میں ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔

مخمور جالندھری سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۷ء کے اواخر میں جالندھر چھاؤنی میں ہوئی۔ اس وقت میری عمر ۱۹ برس تھی اور میں فیروز پور کے ایک کالج میں بی۔ اے کے آخری سال کا طالب علم تھا اور ریاضی اور سائنس کے نصابی جبر کے باوجود میں چونکہ تخلیقی طور پر طلسمِ شعر و ادب میں گرفتار ہو چکا تھا اس لئے اپنا ابتدائی ذخیرۂ منظومات کسی مشہور و مستند ادبی شخصیت پر 'نازل' کرنے کے لئے بے قرار تھا۔ خط و کتابت کے ذریعے اب تک میں نے جو رابطہ احمد ندیم قاسمی اور فکر تونسوی کے ساتھ قائم کیا تھا وہ ملک کی تقسیم کے بعد کچھ غیر یقینی سا ہو چلا تھا۔ اس صورتِ حال کے باعث میں نے مخمور جالندھری کو ایک خط لکھا اور ان سے ملنے کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ان کی جانب سے حوصلہ افزا جواب پاتے ہی میں ایک شام اپنے گھر سے فرار ہو گیا اور فیروز پور سے جالندھر پہنچ گیا۔ مخمور جالندھری ان دنوں لال کرتی بازار جالندھر چھاؤنی میں رہتے تھے اور اپنے گھر کے قریب ہی ایک بیکری چلاتے تھے جہاں تیار کی ہوئی ڈبل روٹیاں اور دیگر لذائذ وہ عام ذرائع سے فروخت کرنے کے علاوہ فوج کو بھی سپلائی کیا کرتے تھے۔ میں جب لال کرتی بازار کی اس بیکری میں پہنچا اور ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے معروفِ کاروبار لوگوں کے سامنے (جن میں مخمور جالندھری اور فکر تونسوی بھی شامل تھے) اپنے نام کا اعلان کیا تو ایک دانشگاف قہقہے نے میرا خیر مقدم کیا اور پھر میرے پہلے 'جامِ اضطراب' نے۔ میں اپنی پُر جوش نظم خوانی اور شدید ردِ عمل سے جو متاعِ گراں قدر بہ حفاظت لے کر فیروز پور لوٹا ان میں بہتر ادبی بصیرت کے علاوہ میری وہ چند اولین ادبی کاوشیں تھیں جن میں میری وہ نظم سرِ فہرست تھی جو ۱۹۴۸ء میں "سنگِ میل" پشاور میں "اپیل" کے عنوان سے شائع ہوئی۔

مخمور جالندھری سے اس پہلی ملاقات کے طفیل ملاقاتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ۱۹۴۸ء سے لے کر ان کے دمِ آخر تک جاری رہا۔ ملاقاتوں کے اس سفر میں مخمور جالندھری نے جالندھر سے دہلی منتقل ہونے کے بعد ایک ایسے انتہائی محرک انگیز باب کا اضافہ کیا جو آج تک میرے لیے اور میرے بہت سے دوستوں کے لیے منبعِ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس باب میں مخمور جالندھری کی اوائل عمری اور جوانی کی مہمات کے علاوہ وہ ادبی مہمات بھی شامل تھیں جن کا تعلق اردو ادب، عالمی ادب، حلقۂ اربابِ ذوق، ترقی پسند تحریک اور ان تخلیقی سرگرمیوں کے ساتھ تھا جو تقسیم سے پہلے کی دو تین دہائیوں اور تقسیم کے آس پاس کے برسوں کے اردو زبان کے تخلیقی اور ادبی منظر نامے کا حصہ تھیں۔

مخمور جالندھری نے اپنی سب سے پہلی نظم 'مچھلی والی' ۵ اپریل ۱۹۲۷ء کو لکھی تھی۔ ابتدا میں دل شاہ جہاں پوری اور بعد ازاں سیماب اکبر آبادی سے مشورۂ سخن بھی لیتے رہے تھے۔ میراجی، قیوم نظر، یوسف ظفر اور حلقۂ ارباب ذوق کے ساتھ ان کا برسوں تک گہرا رابطہ رہا تھا۔ تقسیم سے قبل اردو زبان کا کوئی ادبی جریدہ اور حلقۂ ارباب ذوق کا کوئی شعری انتخاب ایسا نہیں تھا جس میں مخمور جالندھری کی نظم شامل نہ ہوئی ہو۔ نظم کے شاعر کے طور پر تو وہ مسلّمہ حیثیت کے مالک تھے ہی لیکن آج کے عہد کے بہت کم قارئین غالباً اس بات سے واقف ہوں گے کہ وہ غزل بھی کہتے تھے اور گیت، مختصر نظم، سانیٹ میں طبع آزمائی کرنے کے علاوہ خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کے 'پھلجھڑیاں' نام کے ایک مجموعے کے بھی مصنف تھے۔ یہی نہیں، ان کا ادبی دائرۂ عمل صرف 'شعر' تک ہی محدود نہیں تھا۔ انہوں نے اردو زبان کے قارئین کو تراجم کے ذریعے مغربی ادب کے ان شاہکار ناولوں سے بھی متعارف کرایا جن میں شولوخوف کا 'ڈان بہتا رہا'، اور کزنتزاکی کا 'زوربادی گریک' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جب ریڈیو کے اسکرپٹ لکھنے پر آتے تو اتنے صفحات پر مشتمل اتنے اسکرپٹ، نظم و نثر دونوں، قلم برداشتہ لکھ ڈالے کہ اگر ان کے وزن کا تخمینہ لگایا جاتے تو منوں میں نکلے گا۔ کرنل رنجیت، زور آور سنگھ اور دیگر مختلف ناموں سے لکھے گئے ان کے 'تھرلرز' کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر ہفتے ایک ناول مکمل کرنے پر مجبور تھے۔ روزنامہ "ملاپ" میں اپنی صحافتی ذمہ داریاں بھی نبھاتے تھے۔ امورِ خانہ داری کا بھی خیال رکھتے تھے۔ کاروبارِ شام، کی باقاعدگی میں خلل نہیں آنے دیتے تھے۔ مہمان نوازی کی حدود کو وسیع تر کرتے جاتے تھے۔ اور کل ملا کر دن اور رات کے ۲۴ گھنٹوں میں سے کم و بیش ۱۸ گھنٹے قلم کی نذر کرتے تھے۔

مخمور جالندھری کے کلام کے سارے کے سارے مجموعے تقسیم سے قبل شائع ہوئے۔ 'جلوہ گاہ'، 'تلاطم'، 'مختصر نظمیں'، 'پھلجھڑیاں' ان کے کلام کے مختلف مجموعے ہیں۔ غزلیں اور متفرقات بیاضوں میں محفوظ ہیں۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے آس پاس کے برسوں میں مخمور جالندھری کا شمار اردو زبان کے ان شاعروں میں ہوتا تھا جنہوں نے اردو نظم کو تجرباتی تخلیقی تازہ کاری کی ایک ایسی جہت اور خصوصیت سے روشناس کرایا جو اردو زبان کی شعری روایت کے تعلق سے منفرد حیثیت رکھتی تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے یہ سب ہوتے ہوئے یہ حادثہ کیسے ہو گیا کہ مخمور جالندھری کو اردو کے ناقدانِ ادب اور قارئینِ ادب نے فراموش کر دیا۔ ان کا ذکر تک ادبی بحثوں، تذکروں اور ناقدانہ مطالعوں سے غائب ہو گیا۔ ان کی کتابیں ذاتی، مکتبی اور سرکاری کتب خانوں سے غائب ہوتی گئیں اور وہ شاعر جس کا اولیں مجموعۂ کلام 'جلوہ گاہ' ایک سے زیادہ طباعتوں سے سرفراز ہوا تھا ایک بھولی بسری داستان بن کر رہ گیا۔ میں نے اس سوال پر کئی بار غور کیا ہے۔ جب مخمور جالندھری حیات تھے تو دو ایک بار ان سے بھی اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی جسارت کی۔ میری دانست میں فراموش کاری کی جو بھی وجوہات ہوں، شعر و ادب اس رعنائیِ دل و جاں کی طرح ہیں جو کل وقتی اور مسلسل اور متواتر وابستگی اور وفاداری اور وفاشعاری کی عدم موجودگی میں اکثر و بیشتر ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔

مخمور جالندھری کی رعنائیِ دل و جاں تو دمِ آخر تک ان کی شخصیت کا حصہ بنی رہی لیکن عملی اظہار سے محروم ہو گئی اس لیے رفتہ رفتہ "داستانِ پارینہ" بنتی گئی۔ اور چونکہ مخمور جالندھری بہ نفسِ نفیس "کاروبارِ دیگر" میں پھنستے چلے گئے، لاتعلق ہوتے گئے۔ کاغذ قلم کے کھلونے بناتے گئے اس لیے اپنا سب کچھ تج کر درویشانہ انداز میں کمال فراخدلی سے اپنی ہی فراموش گاری کے شاہد و ناظر بن گئے۔ وہ عام زندگی میں بھی اپنا سب کچھ دوسروں کی نذر کرنے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ اپنی شاعری کے تعلق سے وہ اعلیٰ تر بے نیازی کی منزل پر پہنچ گئے۔

شعر و ادب کی عصری شناخت اور قدر و قیمت اپنے آپ میں ایک مسئلہ ہے۔ فراموش گاری دوسرا مسئلہ ہے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ زمان و مکاں کے تناظر میں اور تناظر سے ماورا کسی ادبی شخصیت، ادبی فنکار یا فن پارے کی کیا اہمیت، قدر و قیمت اور وقعت ہے۔ بعض اوقات جو آج زندہ اور اہم ہے اپنے عہد میں ہی فراموش کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات رفتہ رفتہ نذرِ فراموش کاری

ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ جسے آج غیر اہم سمجھا گیا ہے وقت گزرنے کے ساتھ اہمیت اور وقعت سے سرفراز ہوتا جاتا ہے اور بالآخر انجامِ بازیافت سے اپنا حقیقی مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔

میں مخمور جالندھری سے اپنی ذاتی اور ادبی وابستگی کو اپنی خوش بختی کی دلیل سمجھتا ہوں۔ میں نے ان کی شاعری کا مطالعہ پچھلی پانچ دہائیوں میں کئی بار کیا ہے۔ میں ان چند ناقدانہ تحریروں سے بھی فیض یاب ہوا ہوں جو مخمور جالندھری کے سلسلے میں عصری بے توجہی کی کوفت کو کسی حد تک کم کرنے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔ کنہیا لال کپور، مظہر امام، عتیق اللہ، عنوان چشتی، علی جواد زیدی نے نہ صرف اپنی تحریروں میں ان کا ذکرِ خیر کیا ہے بلکہ ان کی شاعری کے خد و خال کے بارے میں قابلِ قدر توجہ انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے کسی ایسے شاعر یا ادیب کی ادبی بازیافت کا مسئلہ جسے فراموش کر دیا گیا ہو، ہرگز نجی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ایک ادبی فریضہ ہے جسے بہر حال سرانجام پانا ہی ہے۔ یہ ایک ثقافتی سعادت ہے۔

مخمور جالندھری کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے جو خصوصیات فوری طور پر متوجہ کرتی ہیں ان میں سے کچھ تو متعلقہ عہد کے تعلق سے عصری نوعیت کی ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کا تعلق خالصتاً مخمور جالندھری کے ساتھ ایک فنکار کے طور پر ہے۔ تقسیم سے پہلے کا عہد اقبال، جوش، حلقۂ اربابِ ذوق، ترقی پسند تحریک اور تیسری اور چوتھی دہائیوں میں میراجی، راشد، تصدق حسین خالد، مختار صدیقی، مجید امجد، فیض، اختر الایمان کی ترقی افزوں اہمیت کا عہد ہے۔ مخمور جالندھری نے آغازِ سفر اقبال، جوش، سیماب اکبر آبادی اور اس دور کے دیگر شعراء کے اثرات کے تحت کیا۔ اپنی ۱۹۲۷ء میں لکھی گئی پہلی نظم 'مچھلی والی' سے لے کر 'جلوہ گاہ' کی بیشتر نظموں میں اور بعد کی کچھ نظموں میں بیانیہ انداز میں مثنوی طرز کے اشعار کا ساختی اہتمام کرتے رہے۔ غزلوں میں غزل کے روایتی کلاسیکی تکنیکی تقاضے تو پورے کرتے رہے لیکن کوئی انفرادی رنگ نہیں پیدا کر سکے۔ غالباً اسی وجہ سے انہوں نے اپنے غزلوں کو مجموعے کی صورت میں پیش کرنے سے احتراز کیا۔ مخمور جالندھری کی حقیقی شناخت اس وقت ابھر کر سامنے آئی جب انہوں نے موضوعاتی اور طریقِ کار کی سطح پر انحراف اور نجی دریافت کے راستے تلاش کرنے شروع کیے۔ مشاہدے کی جزئیات و تفصیلات، تصویر کشی، منظر نگاری، کردار نگاری، سماجی اور معاشرتی رویوں کے دوغلے پن اور اخلاقی ریاکاری سے نفرت بلاشبہ ان کی پوری شاعری کا حصہ ہیں لیکن ان کا اصل نقطۂ انحراف وہ منزلِ فکر ہے جب وہ اشیا کو بغیر کسی رنگین عینک کے دیکھنے لگے اور اپنے ردِ عمل کو ایسی زمینی کھردری زبان میں دائرۂ اظہار میں لانے لگے جو عام طور پر شاعری کی زبان نہیں سمجھی جاتی تھی۔ موضوعاتی اور تکنیکی طریقِ کار کے انحراف کے پہلو اگرچہ مخمور جالندھری کی نظموں میں ۱۹۴۰ کے بعد واضح طور پر ابھر کر سامنے آنے لگے تھے لیکن ان کے بیشتر ادبی رویوں کی تجسیم اگر ہمیں ان کی کسی ایک تخلیق میں ملتی ہے تو وہ ان کی نظم 'کم نگاہی' ہے جو ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی اور حلقۂ اربابِ ذوق کے اس سال کے شعری انتخاب میں شامل کی گئی:

مڑ کے دیکھتا ہوں میں

زندگی کی رزم گاہ سرد اور بجھی ہوئی
جیسے ایک بیسوا رات کی تھکی ہوئی
ہو پلنگ پر اداس، نیم جاں پڑی ہوئی
کوئی کشمکش نہیں، کوئی جستجو نہیں
اب تو دور دور تک حشر ہاؤ ہو نہیں
چار سو نگاہ میں، سوکھے سوکھے جسم ہیں

موت کی جبیں پہ ہیں یا کریہہ تیوریاں
چار سو نگاہ میں ہڈیوں کے ڈھیر ہیں
آج بھی جھلکتے ہیں جن سے بھوک کے نشاں
زندگی گراں رہی موت رائیگاں گئی
سیر ہو کے جا رہے ہیں گدھوں کے کارواں
میرے ہم سفر تمام سادگی شعار تھے
رنج کے شکار تھے، غم سے دل فگار تھے
پھر بھی مطمئن جیئے، کتنے وضع دار تھے
وہ پڑی ہے ناظمہ، وہ مری رفیقِ کار
وہ مری شریکِ غم، زیست کی شگفتگی
سچ کہ غم زدہ رہی، فاقہ کش رہی مگر
بھیڑیوں کے واسطے، تر نوالہ ہی رہی
اس کا جسم ڈھانپ دوں ہر برہنگی یہاں
اس فریب زار میں ناپسند کی گئی
حالتِ ستم نصیب، دیکھتا نہیں کوئی
کیوں ہوا کوئی غریب، دیکھتا نہیں کوئی
اور حقائقِ مہیب دیکھتا نہیں کوئی
باغ دیکھتے ہیں سب، راغ دیکھتے نہیں
چاند دیکھتے ہیں سب، داغ دیکھتے نہیں

(کم نگاہی)

محمور جالندھری کے فکری اور تکنیکی انحراف کے بیشتر پہلو یا اُس سے متعلق بیشتر اشارے اس نظم میں موجود ہیں۔ بلاشبہ اس نظم میں تصویر کشی اور بیانیہ منظر کشی کے وہ سب پہلو موجود ہیں جن کا آغاز جوش کے انداز میں 'مچھلی والی' سے ہوا تھا۔ فرق یہ پڑا نظم میں 'باغ' کے ساتھ 'راغ' اور 'چاند' کے ساتھ داغ بھی شامل ہو گئے۔ شاعر نہ صرف 'حقائقِ مہیب' دیکھنے لگا ہے بلکہ 'حقائقِ مہیب' کے جملہ متعلقات کو ناقدانہ بصیرت سے دیکھنے کی استعداد سے سرفراز ہو گیا ہے۔ اس کے منظر نامے میں وہ ناظمہ بطور کردار شامل ہو گئی ہے جو غم زدہ، فاقہ کش اور برہنہ تن رہی اور سماجی بھیڑیوں کے لیے تر نوالہ رہی۔ شاعر کے ہم عصر اور رفیقِ کار معاشرے کے فریب زار میں بڑے اطمینان اور وضع داری سے جیئے۔ انہیں نہ تو بھوک سے، ہڈیوں کے ڈھیر سے، ناظمہ سے کوئی واسطہ تھا اور نہ ہی سیر ہو کے جاتے ہوئے گدھوں کے کارواں سے۔ شاہد اور ناظر شاعر چونکہ راوی ہے اس لئے وہ سب خبریات و تفصیلات معروضیت سے پیش کرتا ہے لیکن اب چونکہ وہ ناقدانہ تخلیقی بصیرت سے منور ہو گیا ہے اس لئے وہ مثبت عمل کا کفیل ہونے کا بھی آرزو مند ہے، اگرچہ ایک معکوس محدود انداز میں۔ معاشرے کے جس فریب زار کا ذکر محمور نے اپنی نظم 'کم نگاہی' میں کیا ہے وہ ان کی پوری شاعری کا میدانِ کارزار ہے۔

اس میں پیٹ کی بھوک، جنسی گھٹن اور بھوک، ریاکاری، دوہرے اخلاقی معیار، مختلف اشتہاؤں کے شکار مرد عورتیں بچے، اقتصادی ناہمواری، انوکھا بیوپاری، جیوتشی، ببل، کلدیپ انل دت، بنجن، سعید، حمیدہ، رضیہ، صنیعت، کریم اللہ، جگت سنگھ، کندن، آفتاب، نجمہ، گلاب، سلمیٰ، ناظمہ، چمبیلی، شمشاد اور دیگر مختلف اور متنوع باہم دگر عناصر اور کردار شامل ہوگئے ہیں۔ مخمور جالندھری اپنے ہی بنائے ہوئے میدانِ کارزار میں کسی سُورما کی طرح نہیں اُترے۔ وہ خود اس ہجوم میں شامل ہیں صرف اپنی بصیرت کے باعث کسی حد تک اس منظرنامے پر قدرے الگ انداز میں نظر ڈالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ اگرچہ "جلوہ گاہ" کا انتساب بھوکی جوانیوں کے نام اور "تلاطم" کا انتساب اقبال کے ابلیس کے نام کرتے ہیں؛ اور میراثِ عصیاں سے اور ابلیسی بغاوت سے منزلِ عرفان تک پہنچنا چاہتے ہیں لیکن حق بات یہ ہے کہ وہ سرے سے کسی فلسفیانہ نہج کے شاعر نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مخمور جالندھری شاعر ہیں لیکن ان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی کچھ کم توجہ انگیز نہیں کہ ان کی اکثر و بیشتر نظموں میں افسانوں اور کہانیوں کا سا بیانیہ انداز، اور تجربات و تفصیلات کی گہما گہمی اور مرد عورت کرداروں کی خوب اچھی چہل پہل ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق نے جن ادبی رجحانات کو فروغ دیا ان میں موضوعاتی دائرۂ انتخاب کے علاوہ وہ تکنیکی لسانی، انحرافی رویہ تھا جن کے باعث اردو نظم کی حانئی صورتیں ابھر کر سامنے آئیں جن کے میراجی، راشد، قیوم نظر، مختار صدیقی اور دیگر بہت سے شاعر نمائندہ شاعر کے طور پر تسلیم کئے گئے۔ مخمور جالندھری مثنوی کے سے انداز کی نظموں سے نکل کر پہلے تو پابند نظموں میں جزوی انحراف کی سطح پر آئے۔ پھر رفتہ رفتہ نظم معرا کی جانب راغب ہوئے اور آزاد نظم اور مختصر نظم کے تجربات سے گزرتے ہوئے بہت سی شعری جہات کے کامیاب فنکار بن گئے۔ مکالمہ، خود کلامی اور ڈرامائی طریقِ کار کا ذکر عصری شعری منظرنامے کے تعلق سے پچھلی دو تین دہائیوں میں اکثر ہوا ہے۔ کردار نگاری، طویل نظم اور مختصر نظم کا ذکر بھی کچھ کم نہیں ہوا۔ لیکن مجھے مظہر امام کی اس رائے سے مکمل اتفاق ہے کہ "تمام اردو شاعری میں مکالموں کا، مخمور جالندھری سے بہتر استعمال شاید ہی مل سکے" "کم درسے نفظ کا شاعرانہ استعمال ہمارے دور کے کئی شعرا (جن میں اختر الایمان، مجید امجد، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[1]) کا وصف ہے لیکن مخمور جالندھری کے یہاں کم درسے نفظ کا شاعرانہ استعمال امتیازی وصف ہے۔ کردار مثنویوں، قصیدوں، مرثیوں میں بافراط موجود ہیں لیکن جدید نظم کے تعلق سے کردار نگاری کا وصف مخمور جالندھری کی سطح پر ہمارے دور کے کسی شاعر میں نہیں ہے۔ طویل نظم میں بیانیہ طرزِ اظہار، ڈرامائی طریقِ کار اور کرداروں کی شمولیت کے بغیر سارا معاملہ غیر دلچسپ ہو کر رہ جاتا ہے اور ایڈگر ایلن پو کے مطابق محض مختصر نظموں کے ڈھیلے ڈھالے مجموعے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مخمور جالندھری نے بیانیہ، ڈرامائی طریقِ کار اور کرداروں کی نقل و حرکت سے اپنی طویل نظموں کو وہ وقار، تسلسل اور وحدت عطا کی ہے جو صرف کامیاب طویل مختصر افسانے یا ناول کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ "بیس پہرے" اور "اشتعال"، اس طریقِ کار کی بہترین مثالیں ہیں۔

حلقۂ اربابِ ذوق نے جن دیگر رجحانات کو فروغ دیا ان میں سے ایک قابلِ ذکر رجحان بالواسطہ طرزِ اظہار یعنی علامتی طریقِ کار کا تھا۔ نظم محض الفاظ کے لغوی معانی کی میزان نہیں ہے۔ کوئی بھی مجموعۂ الفاظ اس وقت تک شعر کی سطح تک نہیں پہنچتا جب تک وہ اشعارات، رموز کے توسط سے معنوی ماورائیت سے نہیں گزرتا۔ مخمور جالندھری کی بیشتر نظمیں چونکہ بیانیہ طرز کی ہیں (ان میں وہ نظمیں (مثال کے طور پر "تعاقب") بھی شامل ہیں جن کا تجزیہ میراجی نے اپنی کتاب "اس نظم میں" شامل کیا یا جنہیں کرشن چندر نے نئے زاویے کی دونوں جلدوں میں شامل کیا) اس لئے اردو زبان کے ناقدین مخمور جالندھری کو عام طور پر محدود بصری تصاویر کا شاعر سمجھتے ہیں۔ تقسیم کے کچھ برس

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محترم مقالہ نگار کی نظر سے تنویر سپرا کا مجموعۂ کلام "لفظ کم درسے" نہیں گزرا ورنہ یہاں ان کا ذکر ناگزیر تھا ——— ادارہ

قبول کی اور تقسیم کے بعد ترقی پسند تحریک کے عروج کے دور کی ان کی کچھ نظموں کی روشنی میں بعض لوگ انہیں سماجی طور پر باشعور اور بامقصد شاعر بھی قرار دیتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مخمور جالندھری "زندگی کو زندگی سے بہتر نہ دکھانے" (الفاظ کنہیا لال کپور کے ہیں) کے عاموی رویے کے باوجود، شعری پرواز کی اس جمالیاتی کشش کا بھی اظہار کرنے کے کفیل تھے جو صرف زندگی کے بھرپور تجربے حاصل ہوتی ہے 'تلاش'، 'پاگل'، 'تالاب'، 'سوکھے ہوئے پتے'، 'تکشلا کے کھنڈر'، 'نیا مکان'، 'مگر مچھ کے آنسو'، استعاراتی پرواز کی وہ نظمیں ہیں جو کسی بھی شاعر کے لیے باعثِ افتخار ہو سکتی ہیں۔ ان میں مخمور جالندھری کی مخصوص تصویر سازی بھی ہے اور وہ لسانی دروبست بھی جو شعر کو منزلِ تخیل پر جسمانی حدود سے ماورا لے جاتا ہے:

جانے کیوں یاد دلاتے ہیں یہ سوکھے پتے
مجھے ماضی کے صحیفے کے مصوّر اوراق
نقش ہیں ذہن و تصوّر پہ مرے، جن کے حروف
جن کی دم توڑتی، کجلائی ہوئی تابانی
اب بھی تنہائی کی راتوں میں بھڑک اٹھتی ہے
کبھی تنہائی کی راتیں بھی تھیں شاداب و جمیل
جن میں اب رنگ و ضیا کا نہیں پرتو کوئی
آج ماضی کی ہر اک تابشں و رنگینی پر
وقت کے ہاتھ ہیں اک عرصے سے مصروفِ ستم
چند سال اور ہی بس کاٹے گا مشکل سے شباب
اب مری شاخِ تمنا میں ہیں سوکھے پتے
جن کے جھرمٹ میں نہیں خرمنِ ہستی محفوظ
جانے کیوں پھر بھی ہے لپٹا ہوا ماضی مجھ سے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ فلک سیر نگاہ
آج کیوں بوڑھے سے اک پیڑ پہ ستاتی ہے

(سوکھے ہوئے پتے)

ریت پر ڈھونڈنے آیا ہوں وہ قدموں کے نشاں
میرے اور تیرے حسیں سایوں نے چھ سال ہوئے
ساحلِ بحر کے سینے پہ بنایا تھا جنہیں
ڈھونڈنے آیا ہوں ان گیتوں کی میٹھی تانیں
ہم نے مل جل کے بڑے شوق سے گایا تھا جنہیں

انہی قدموں کے نشانوں سے ذرا بچ کے چلیں

چاہتا ہوں کہ مری طرح اگر کوئی غریب
یہ حسیں نقش، یہ مٹتی ہوئی الفت کے نشاں
ڈھونڈنے آئے تو ناکام نہ واپس جائے

(تلاش)

یہ عمارات، یہ قلعے، یہ محل، اور یہ چمن
ذہن اور دل کے حجابوں سے نکل آئے ہیں
جنہیں کل آدم و حوا کی نئی اولادیں
اپنی تہذیبِ گزشتہ کا نشاں سمجھیں گی
جس طرح آج مرا دیدۂ اصنام پرست
رنگِ حسرت کے تلاطم کو جلو میں لے کر
اپنی تہذیبِ گزشتہ کے کھنڈر دیکھتا ہے

(ٹیکسلا کے کھنڈر)

مخمور جالندھری وقت گزرنے کے ساتھ ایک ایسے صاحبِ عمل (کرم یوگی) بن گئے تھے جو صرف عمل کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ نتائج کے ساتھ نہیں۔ لفظوں کی مصنوعات سے انہوں نے ریڈیو، صحافت تراجم اور ناول نگاری سے جو کچھ کمایا وہ سب اپنے عزیزوں اور اپنی فراخدلی اور دریا دلی کے امیدوار لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ ۱۹۷۵ء میں جب میں ایک خطرناک حادثے سے بچ کر اس کے اثرات سے آزاد ہونے کے بعد صحت یاب ہو گیا تو مجھے اپنے سامنے بٹھا کر میرا جشنِ صحت سب سے پہلے انہوں نے منایا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب وہ علالت کے باعث اپنے ہاتھ سے لکھنے کے قابل نہ رہے تو وہ تاجور سامری کے بھائی سنیل شرما کو گھر بلا کر، بول کر ناول لکھوانے لگے۔ نظم ہو یا افسانہ یا ڈرامہ یا ناول یا تنقید، وہ ایسی گہری ناقدانہ بصیرت رکھتے تھے کہ ایک لمحے میں کسی بھی تحریر کے حسن و قبح کے تمام نکات کی نشان دہی کر کے رکھ دیتے تھے ان کی تخلیقی برجستگی کا یہ عالم تھا کہ وہ قلم برداشتہ جو بھی چاہتے تھے لکھ کر مکمل کر دیتے تھے۔

مخمور جالندھری کو دمِ آخر تک اس بات کا احساس رہا کہ انہوں نے اپنی شعری صلاحیتوں کو فوری ضرورتوں پر قربان کر دیا۔ لیکن چونکہ وہ عمل اور صرف عمل کے آدمی تھے اس لئے انہوں نے تاسف کو کبھی اپنی زندگی کا حصہ نہیں بننے دیا بلکہ اس جذبے کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے:

عرصۂ زیست کا جانباز سپاہی ہوں میں
میں نے ہر ہر قدم اک دادِ شجاعت دی ہے
وقت کے افسرِ جابر نے مجھے خوش ہو کر
چند لمحوں کے لیے مہلتِ عشرت دی ہے
میری یہ فرصتِ کم عمر نہ غارت ہو جائے
مجھ پہ ظاہر نہ ہو یہ بات کہ میری ہی طرح

دل گرفتہ ہو، سیہ بخت ہو، برباد ہو تم
ساز کی گونج سے اور رقص کے عالم سے مجھے
شک نہ ہونے دو کہ نغمہ نہیں فریاد ہو تم
جانے پھر کب مجھے فرصت ہو، فراغت ہو مجھے
تازہ دم ہو کے مجھے جانا ہے ان راہوں میں
جن میں اُلجھا ہوا مشکل سے کوئی نوٹتا ہے
جیسے تدبیر مشیت کی کڑی باہوں میں

جب کبھی پھر ملی فرصت تو ضرور آؤں گا
اس طرب گاہ سے دو چار ہی قدموں پہ تو ہے
عرصۂ زیست سے دو چار ہی قدموں پہ تو ہے
عرصۂ زیست ۔ مری رزم گہِ کرب و بلا
سنگِ در سے میں گزرتے ہی پہنچ جاؤں گا
رقص کرتے رہو، گاتے رہو، یونہی میں چلا

(پھر اسی طوفان میں)

ہم سب مخمور کے دوست ان کو پیار سے "زوربا دی گریک" (کزنتزاکی کے ناول زوربا دی گریک کا مرکزی کردار) کہا کرتے تھے۔ مخمور جالندھری اپنی آزاد روی اور کشادہ ہمدردیوں کے طفیل واقعتاً زوربا دی گریک ہی تھے!

شبنم شکیل کی شاعری

منصورہ احمد

بہت دنوں سے میں ایک بات سوچ کر حیران ہوتی تھی کہ شاعری میں آخر خواتین کو زنانہ ڈبے میں کیوں بند کر دیا جاتا ہے جیسے ایک محدود سے رقبے پر زمین آسمان تک قید ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کہ عورت کی شاعری میں عورت کے گرد و پیش کا حوالہ ضرور آئے گا، اسی طرح جیسے مرد کی شاعری میں مرد کا ماحول جھلکتا ہے۔ گلاب کی پتی کو دیکھ کر میر کو بھی کسی کے لبوں کی نازکی ہی یاد آتی ہے۔ ادھر ہمارے مرد ناقدین نے خواتین کی شاعری کے اس حصے کو بہت نمایاں کیا جس میں وہ اپنا عورت پن EXPLOIT کرتی ہے۔ دھیرے دھیرے MALE شاونزم میں نے ولی دکنی سے لے کر اب تک کی "مردانہ" شاعری میں عورت کی تصویر بنانے کی کوشش کی تو اکا دکا مثالوں کو نکال کر مجھے کہیں عورت کی مکمل تصویر دکھائی نہیں دی۔ بس عورت کا ظاہری عکس ہی جھلک دکھاتا رہا۔ عورت جو ایک مکمل فرد ہے، ایک سوچتا ہوا ذہن اور دھیرے دھیرے پگھلتا ہوا احساس، اسے محض ایک VISUAL PLEASURE کے طور پر REDUCE کیا جاتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ اب شاعرہ اور عورت دونوں کو اپنے TOTAL SELF کی رہائی کے لیے جہاد کرنا چاہیئے۔ "اضطراب" اس عورت کی اکائی کی بہت خوبصورت ترجمان ہے جو بیٹی، بیوی اور محبوبہ بھی ہے اور ایک الگ بھرپور INDIVIDUAL بھی۔ شبنم کے ہاں عورت اطاعت اور نسائیت کے روایتی تصور کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اس سے انحراف بھی کرتی ہے۔ اپنے ماحول سے اختلاف بھی کرتی ہے۔ چیزوں کی ظاہری صورت اور اصلیت کے درمیان جو صحرائے اعظم ہے۔ شبنم اس پر مسلسل سفر میں ہے:

راج سنگھاسن ہے یہ میرا	یا سولی پر چڑھی ہوئی ہوں
آدھی ریت سے باہر ہوں میں	آدھی ریت میں گڑی ہوئی ہوں

کھلی بغاوت کرنا بھی بہت آسان ہے اور مکمل سپردگی بھی۔ ایک صورت میں نعرہ وجود کا بوجھ کم کر دیتا ہے اور دوسری صورت مستقل نیند کی ہے جہاں رفتہ رفتہ بیداری کے تقاضے ہی مرنے لگتے ہیں۔ مشکل تو ہے زندگی کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش میں ستی ہوتے چلے جانا اور ستی ہوتے ہوئے بھی موت قبول کرنے سے انکار کرنا۔ یہ بہت باریک جسی تجربہ ہے اور اسے لفظوں کا پیرہن دینا باریک تر لیکن "اضطراب" میں بار بار یہ واردات ظہور کرتی ہے۔ شبنم کہتی ہے:

اسی طائر سے پوچھو آشیاں کی عافیت کیا ہے
جسے اک مستقل اندیشۂ ہجرت میں رہنا ہے۔

اپنی نظم "ورثہ" میں وہ اس اندیشۂ ہجرت کے آئندہ سفر سے وحشت زدہ ہے اور بیٹی کو اپنی ذاتی سوچ رکھنے سے منع کرتی ہے۔ تاکہ ماحول سے مختلف ہونے کی جو قیمت اس نے دی ہے وہ اگلی نسل کا تاوان نہ بن سکے، اور اس کی طرح اسے کو اپنے آج، کل

ے یے گردی نہ رکھنا پڑیں۔

مگر تو شبنم کے انحراف کا صرف ایک پہلو ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں وہ بار بار اس عمل سے گزرتی ہے:

یہ سراب روشنی ہے، روشنی کیسے کہوں
ایک خواب زندگی کو زندگی کیسے کہوں

بے معنویت کے احساس نے اس کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم جن چیزوں کی تمنا میں ہم سرپٹ بھاگ رہے ہوتے ہیں، ان کے حصول تک ہمارے دل خواہش کی حدت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ عموماً یہ حادثہ بھی ہوتا ہے کہ ہمارے جسم شہروں کی بھیڑ میں بھاگتے ہتے ہیں اور روحیں کہیں یخ بستہ پہاڑوں پر ٹھٹھرتی رہتی ہیں۔ یہ کتنی عجیب جلاوطنی ہے جس میں جلاوطنی کے باوجود ہجرتیں ہی ہجرتیں ہیں۔ وہ کہتی ہے:

چلے جاتے ہیں، پہنچ پاتے نہیں، پھر بھی کہیں
اور اسے زیست سے تعبیر کیے جاتے ہیں

ایک بھی گہنا پاس نہیں تھا جب یہ چہرہ کندن تھا
سونا تن پر تب پہنچا جب چاندی اُتری بالوں میں

کبھی کبھی یہ بے معنویت اسے فنی سفر کے حوالے سے بھی پریشان کرتی ہے۔ ایک لا متناہی "کیوں" اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس مسافر کی طرح۔ جو ایک لمبے سفر کے بعد منزل پر حیرت زدہ ہو کر سوچے کہ کیا میں نے اس مقام تک آنے کے لیے اتنی آبلہ پائی برداشت کی؟

ان میں وقت ہی ضائع ہوگا
جن باتوں میں پڑی ہوئی ہوں

اپنا آپ مٹا ڈالا ہے اس بیکار سی خواہش میں
میرا ذکر کتابوں میں ہو، میرا نام رسالوں میں ہو

"انسانی رشتے" شبنم کا خاص موضوع ہیں۔ ان میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ اور تعمیر دونوں کو وہ بہت شائستگی سے نباہتی ہے۔ اس کے مزاج کا دھیما پن کسی مرحلے پر اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ "عشق" کے اتنے سخت مقامات سے وہ اتنی آہستگی سے گزر گئی ہے کہ بعض اوقات تو رفتار کا احساس بھی نہیں ہوا:

مری شناخت الگ ہے، تری شناخت الگ
یہ زعم دونوں کو، اپنا مثیل کوئی نہیں

لا حاصلی کا عشق ہیں چرچا نہیں کیا
دنیا جو چاہتی تھی تماشا نہیں کیا

منظر سے ہٹ کے کر دیا آساں جدائی کو
اس فیصلے میں بھی اسے تنہا نہیں کیا

میں نے شبنم کی شاعری میں سہل ممتنع کے کمالات دیکھے۔ اتنے آسان لفظوں میں زندگی کے اتنے مشکل حقائق کو سمو دینا اسی کا حصہ ہے۔ اب تک میں نے جو اشعار درج کیے ان میں آپ کو جا بجا اس سلاست کی جھلکی ملی ہو گی۔ ایک جگہ کہتی ہے:

مجھے تنہائیوں کی دھوپ لا دو
کسی کے سائے میں مرجھا گئی ہوں

یہ مر جاتی ہے اپنی موت خود بھی
محبت کا کوئی دشمن نہیں ہے

رشتوں کی پے در پے موت اور بے معنویت کے دائرہ نما سفر کے باوجود شبنم کبھی ہاری نہیں کبھی سپر انداز نہیں ہوئی کبھی تھک کر بیٹھی بھی تو سفر دوبارہ شروع کرنے کے لیے۔ اسے خود پر اعتماد ہے۔ خود اسی کے لفظوں میں:

مجھ کو گرانا سہل نہیں ہے
اپنے سہارے کھڑی ہوئی ہوں

وہ اس دعوے میں حق بجانب ہے کہ "اضطراب" میں جا بجا اس دعوے کی گواہیاں موجود ہیں۔ اردو شاعری کا دیانت دار مورخ شبنم کا ذکر کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکے گا۔

ضیا جالندھری

شوریدہ

وہ لفظ پھول، لفظ برگ سے
ہوا میں صوت و رنگ اُچھالتا رہا
وہ جوششِ نوا کو پالتا رہا
وہ اپنا بے پناہ اضطراب
لمحہ لمحہ حرف کی نمو میں ڈھالتا رہا

وہ بولتا رہا
وہ حبسِ جاں گسل میں دل دریچے کھولتا رہا

وہ پے بہ پے سوال پوچھتا رہا
گمان و وہم کی گہرائیوں تلے نیم جاں، نڈھال پوچھتا رہا
وہ حال کے حوالے سے مآل پوچھتا رہا

جواب اک طویل خامشی
مہیب مجسموں کی سرد سنگدل فصیل خامشی
ثقیل خامشی

وہ پھر بھی شورشِ نوا کو پالتا چلا گیا
خموشیوں میں رخنے ڈالتا چلا گیا

سو دائمی سکون کے لیے
ازالۂ خروش کر دیا گیا
وہ جس کے شور سے فضاؤں میں فتور تھا
اُسے خموش کر دیا گیا

وہ چُپ ہُوا تو پھول پھول پات پات
اُس کے بول بولنے لگا
سکوں کا تخت ڈولنے لگا

زہرا نگاہ

سُنا ہے

سُنا ہے، جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
سُنا ہے شیر کا جب پیٹ بھر جائے تو وہ حملہ نہیں کرتا
سُنا ہے، جب کسی ندی کے پانی میں
بیئے کے گھونسلے کا گندمی سایہ لرزتا ہے
تو ندی کی روپہلی مچھلیاں اس کو پڑوسی مان لیتی ہیں
ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو ہلاتے ہیں
تو مینا اپنے گھر کو بھول کر، کوے کے انڈوں کو پروں سے تھام لیتی ہے
سُنا ہے گھونسلے سے کوئی بچہ گر پڑے تو سارا جنگل جاگ جاتا ہے
ندی میں باڑھ آجائے
کوئی پل ٹوٹ جائے تو
کسی لکڑی کے تختے پر
گلہری، سانپ، چیتا اور بکری ساتھ ہوتے ہیں
سُنا ہے، جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
خُداوندا! جلیل و معتبر! دانا و بینا! منصف و اکبر!
ہمارے شہر میں اب جنگلوں ہی کا کوئی دستور نافذ کر

شبنم رومانی

ہائیکو

یوں بھی ہوتا ہے
پتھر سے سر ٹکرا کر
جھرنا روتا ہے

آگ ہوئی ٹھنڈی
کس کا رستہ تکتی ہے
کنواری پگڈنڈی

بچپن ہار گیا
تتلی کے پیچھے پیچھے
سرحد پار گیا

گرمی خوب گئی
اوڑھ کے بارش کی چادر
بستی ڈوب گئی

قوموں کا نوحہ
چڑیا پر بلی جھپٹی
بلی پر کتا

عکس ہے قیدی اس کا
آئینے سے لڑتی ہے
بیچاری چڑیا!

دشمن جیت گیا
اپنے آپ سے لڑنے میں
جیون بیت گیا

رخصت سال ہوا
لیکن گھر گھر سے پوچھو
کیا احوال ہوا!

حسن عابدی

درِ زنداں پر ایک شام

چہرہ جیسے جلی ہوئی مٹی کا ایک خرابہ
جس میں سوکھی نہروں کا اک جال بچھا ہے
عمر کے بوجھ سے سر ہلتا ہے
سینے میں بھونچال آیا ہے
پھولی پھولی سی شریانیں
جیسے بوڑھی گردن میں
سانس کی ڈوری لٹک رہی ہے
آنکھیں جیسے کنویں کی تہہ میں
گیلی مٹی چمک رہی ہے
اجلی پگڑی دُھلتے دُھلتے پیلی ہو گئی
پاؤں میں جوتی گھستے گھستے ڈھیلی ہو گئی
بابا اپنے بیٹے سے ملنے آیا ہے

بیٹی کے کانوں کی بالی، چاندی کی پازیب
میلے نوٹوں کی اک گڈی، ایک پرانی اجرک
جیسے برسوں کا آسیب
بابا اپنی گٹھری میں

ایک خزانہ لایا ہے
"مجھ سے میری سانس کی ڈوری
میری آنکھیں لے لو
مجھ کو میرا بیٹا دے دو"

فرعونوں کی بستی میں
اک بوڑھا یعقوب
اپنے بیٹے یوسف کا
سودا کرنے آیا ہے
"بابا — جان کی قیمت کیا ہے
ایک جوان کی قیمت کیا ہے
جو بھی دے ناکافی ہے
اس کے بعد معافی ہے"

سینے یونہی شق ہوتے ہیں، آنکھیں گھائل ہو جاتی ہیں
ویرانے میں سوکھی نہریں، پل میں جل تھل ہو جاتی ہیں

شہزاد احمد

اُترے مری خاک پر ستارہ

اُترے مری خاک پر ستارہ
جو دُور فلک پہ مسکرا کر
اپنی جانب بُلا رہا ہے
تصویرِ ابد دکھا رہا ہے
ہم روزِ ازل سے پا بہ گِل ہیں
تھک ہار چکے ہیں، مضمحل ہیں
پہچان بھی اپنی کھو چکے ہیں
ہم کتنے عجیب ہو چکے ہیں
اے دُور سے دیکھتے ستارے!
کیسے لگتے ہیں گھر ہمارے
کیا تو ہمیں دیکھتا نہیں ہے
کیا تو ہمیں جانتا نہیں ہے
کیا ہم تری آنکھ سے نہاں ہیں
کیوں اتنی طویل دُوریاں ہیں
اے مالکِ کائنات! تُونے
یہ کیسا جہاں بنا دیا ہے
کیوں فاصلے رکھ دیے ہیں
ہر شے کو مٹا مٹا دیا ہے
ذرّے نظر آتے ہیں ستارے
بادل بھی نہیں فلک ہمارے
سوچیں تو خیال بھی نہیں ہم
گردِ مہ و سال بھی نہیں ہم
اس پر بھی کمال چاہتے ہیں
ہم اس سے وصال چاہتے ہیں
موجود بھی جو نہیں ہے شاید
نابود بھی جو نہیں ہے شاید
تارا بھی نہیں کہ دیکھ لیں ہم
اس کے دامن میں جا چھپیں ہم
شاید یہ فلک کہیں نہیں ہے
آنکھوں ہی میں کوئی سرزمیں ہے
ہم ایک ہی خواب دیکھتے ہیں
عالم کو خراب دیکھتے ہیں
ہر چیز جہاں کی جل رہی ہے
یہ آگ ہے یا کہ آگہی ہے

ایوب خاور

دُوسرا آسماں

(تارکینِ وطن کے لیے ایک نظم)

کہاں کے پھول تھے ہم
کس جگہ کھلے آ کر
دہک رہی ہے جو خوشبو ہمارے سینوں میں
نہ اُس کی صبحِ تمنّا
نہ اُس کی شامِ جمال
بس ایک رنگِ قفس حلقۂ ملال میں ہے
نہ جانے کون کہاں کس رُخِ خیال میں ہے
عذابِ جاں ہے مگر انگلیوں کے جال میں ہے
لہو کی گرم تہوں میں جمے ہوئے ہیں جو خواب
انھیں کے بیچ کہیں
اگرچہ دوڑتی پھرتی ہیں ان کی تعبیریں
مگر یہ پاؤں کا چکر عجیب چکر ہے
کہ آب و دانہ و مال منال کا جادو
کسی کو ایک جگہ پر ٹھہرنے دیتا نہیں
گھروں سے دُور دِلوں کے سوادِ برزخ میں
بھٹک رہے ہیں سرِ دشتِ لازوال کہ اب
زمین پاؤں کے نیچے رہی نہیں اپنی
اِک آسمان کا سایہ اُتر گیا سر سے
دیارِ غیر کو، پھر کچھ نکل گئے گھر سے

ایک نظم

کوئی خواب ہے کہ سراب ہے
کہیں روز و شب کے مدار میں
کہیں رتجگوں کے شمار میں
کہیں تتلیوں کے غبار میں
کہیں چشمِ نم کے کنار میں
کوئی خواب ہے کہ سراب ہے
جو دل و نگاہ کے درمیاں مری آگہی کا
نصاب ہے

کوئی خواب ہے کہ سراب ہے
جو دل و نگاہ کی زد میں آ کے بھی دُور ہے
جو مرے طلسمِ خیال میں
جو مرے عروج و زوال میں
کبھی اَن کہی کا ظہور ہے
کہیں دُور ہے
کوئی خواب ہے کہ سراب ہے
جو دل و نگاہ کے درمیاں مری آگہی کا نصاب ہے

خورشید رضوی

سال گرہ

جیسے اک سانپ ہے۔ ڈستا ہے مجھے سال بہ سال
جب پلٹ کر وہی موسم، وہی دن آتا ہے
پھُولنے لگتا ہے مجھ میں وہی مسموم خمیر
اُس کا بوسہ مری پوروں میں مہک اُٹھتا ہے
اور وہ اپنی ہی خوشبو کی کشش سے بے چین
میں کہیں بھی ہوں ـــــ مری سمت چلا آتا ہے
در و دیوار اُسے راستہ دے دیتے ہیں
اور میں اُس کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا ہوں

نیل بڑھتے چلے جاتے ہیں مگر چارہ نہیں
ہے مری زیست کی تصدیق یہی زہر کی مُہر
جس سے انکار کی قیمت ہے مرا اپنا وجود

ارشد لطیف

وہ جو دِل میں رہتا ہے

وہ جو دل میں رہتا ہے
اس سے کتنی دُوری ہے
اس دُنیا میں
مایوسی کے دو ہی حل ہیں
ایک محبّت
دوسرا موت
پہلا عین ضروری ہے
دُوسرا تو مجبوری ہے

معذرت

کہا اس نے مجھ سے
مجھے بخش دینا
کہ "میں نے تمھیں اور تمھاری محبّت کو
دھوکا دیا ہے
کہ میں زندگی میں
سہاروں سے بہتر محبّت کی قائل نہیں ہوں"

(لندن)

حسن ناصر

جب ہوائیں روتی ہیں

ظلم ماتھے پہ اُبھری ہوئی سلوٹیں ہیں
خلیجیں ہیں اور فاصلے ہیں
مرے دوستو!
ظلم کشمیر یا ہو سراجیو میں، ظلم ہے
موت کا رقص ہے
موت کا رقص جب
زندگی کے مفاہیم کو
تیز ریزر سے یوں کاٹ دیتا ہے
جیسے ازل سے فقط موت کا رقص ہے
تب دھویں
بستیوں کو لپیٹے ہوئے
روشنی کو اندھیروں میں تبدیل کرتے ہیں
الفاظ اپنے گلے پھاڑ کر چیختے ہیں
مگر ان کی آواز اذنِ سماعت سے پہلے ہی
دم توڑ دیتی ہے
دریا سمندر کی جانب سے
اونچائی کی سمت رُخ موڑ لیتے ہیں
صحراؤں پر برف گرتی ہے
پھر سب ہوائیں
کثافت سے بھرپور ہو کر برستی ہیں
روتی ہیں

جب اپنے چہرے کی بھیک مانگو

(افغانستان کے حوالے سے)

یہ سر پھری جستجو تمھاری
سلگتے تیروں پہ تازہ پھولوں کو بھیجنے کی نئی روایت
مری ہُوئی نیکیوں کی خاطر لہو بہانا
تمھارے حق میں نہیں رہے گا
تمام شکلیں محبّتوں کی
دھویں کی کڑواہٹوں میں لپٹی
تمھاری آنکھوں سے گر رہی ہیں
تمھارے ہونٹوں پہ گرتے ٹکڑے جو لفظ ہیں
وہ سبھی ملا کر تمھارا چہرہ نہیں بناتے
جب اپنے چہرے کی بھیک مانگو
تو دھیان رکھنا
یہی نہیں کہ لہو کے سکّے تمھارے کشکول میں نہیں ہیں
کسی کے کشکول میں نہیں ہیں
سبھی خزانوں میں پیاس ہے جو
مری ہوئی نیکیوں کی خاطر
بہے لہو سے کہیں زیادہ کی منتظر ہے

صفدر صدیق رضی (کراچی)

کراچی

وہی شہر اجتماعی خودکشی پر آج کل آمادہ ہے
جس کے رگ و پے میں
عظیم المرتبت اجداد کی تاریخ کا رنگ
ارفع و اعلیٰ نسب بزرگوں کا آہنگ
اور عظیم الشان تہذیب و تمدن کا لہو
اک عمر سے اب تک رواں ہے
یہ عجیب الخلق قریہ زندگی کا چیستاں ہے
زندہ رہنے کی تمنا بھی یہاں ہے
رزق ہے، آب و ہوا و ابر و ساحل ہے
سمندر ہے

یہاں سب کچھ میسر ہے
یہاں پر حسن ہے، خوشبو ہے، موسیقی ہے، علم و فن ہے
شہرت ہے

روایت اور جدت ہے
محبت اور جرأت ہے
نزاکت ہے، نفاست ہے
فراست ہے، سلاست ہے
ذہانت ہے، فطانت ہے
معیشت ہے، نظامت ہے
مگر یہ شہر محروم عدالت ہے

کشمیر

وادیٔ کشمیر پر میں نظم لکھنا چاہتا ہوں
اس کی آزادی کے متوالوں پہ
جن کے جسم ریزہ ریزہ ہیں
جو آج بھی ثابت قدم ہیں
ہر رو پہلی صبح اعزازِ شہادت کے
جہاں پر پھول کھلتے ہیں
جو ہر محرابِ شاخِ سبز پر مصلوب ہو جاتے ہیں
ہر شب قتل گاہوں سے جہاں اُٹھتی ہوئی لاشیں
شمارِ اوّل و آخر کی حد سے ماورا ہیں

وادیٔ کشمیر پر میں نظم لکھنا چاہتا ہوں
لیکن اب تک لکھ نہیں پایا
کہ میں جس شہر کا آزاد باسی ہوں
وہاں روزانہ اتنے ہی جنازے اُٹھ رہے ہیں
قتل اتنے ہی رقم ہوتے ہیں
دن بھر نو شگفتہ پھول اتنے ہی قلم ہوتے ہیں
اتنے ہی بدن ہر شب زمین کا رزق بنتے ہیں
مگر اے وادیٔ کشمیر!
تجھ پر تیرا دشمن حکمراں ہے
اور مجھ پر اختیارِ دوستاں ہے

شاہین مفتی

دل نے پھر رختِ سفر باندھا ہے

اشک بن بن کے بہے
گردِ سفر بن کے اُڑے
اپنی ہی آگ میں
جل جل کے بجھے
بجھ کے جلے
خوابِ خوش رنگ کی انگلی تھامے
رات بھر نیند کا رستہ دیکھے
آنکھ میں داغِ تماشائے کرم
دن چڑھے شہر کی گلیوں میں پھرے
کسی دیوار کے سائے میں رُکے
کیا خبر کون سی چوکھٹ پہ جھکے
یا یونہی پاؤں کی ٹھوکر پہ رہے
دل نے پھر رختِ سفر باندھا ہے
دیکھیے کون سے رستے پہ چلے

کنارے تو نہیں ہیں ہم

کنارے تو نہیں ہیں ہم
مگر اِک بحرِ خاموشی
ہمارے بیچ بہتا ہے
مگر جب اجنبی جھونکے
وجودِ بحر کو چھو کر گزرتے ہیں
تو لگتا ہے
کسی نے گفتگو کی ہے
مگر ہم جان لیتے ہیں
ہواؤں کے تکلم کے کوئی معنی نہیں ہوتے
یہ بس گرداب بنتی ہیں
اور اس میں ڈوب جاتی ہیں

ڈاکٹر صابر آفاقی

چار مختصر نظمیں

کیا اچھا ہے؟

تاجکستان کی جنگ کے حوالے سے

دانشمندو
سوچو تو
وہ تم سب کا
انکارِ خدا
اور
عزت کرنا
جان بچانا
پھول کھلانا
اچھا تھا؟
یا تم سب کا
اقرارِ خدا
اور شور مچانا
شہر جلانا
خون بہانا
اچھا ہے؟

سوال

مٹی کی خوشبو ایک سی ہے ہر جگہ
پھولوں کی رنگت ایک سی ہر باغ میں
تتلی کے پَر ہیں ایک سے
چڑیوں کی سنگت ایک سی ہر ملک میں
پھر آدمی کیونکر نہیں ہیں ایک سے؟

بچّہ

میں پھول ہوں
یا دھول ہوں
یا بھول ہوں
میں پھول ہوں تو کیوں سکھاتے ہو مجھے
میں دھول ہوں تو کیوں اڑاتے ہو مجھے
میں بھول ہوں تو بھول جاتے کیوں نہیں
کچھ تو کہو میں کون ہوں
اور میرا مستقبل ہے کیا

آلودگی

اوجِ سماء میں
یعنی فضا میں
اور خلاء میں
لفظوں کی آلودگی ہے
اور چیخوں کی آلودگی ہے
اور آہوں کی آلودگی ہے
آلودگیوں کا سوچنے والو
اس آلودگی پر بھی غور کرو

فرزانہ رضوی

پانچ مختصر نظمیں

پو پھٹے

مضطرب تھا سناٹا
کانپتی تھی خاموشی
پُرسکون دل لرزا
محو ہو گئے منظر
بے پناہ لذت کے
بحرِ بیکراں میں گم
میں تھی اور خیال اُس کا

انتشار

شام سے ڈھونڈ رہی ہوں ہر سُو
کھو گیا تھا وہ یہیں
دن کی وحشت بھری خبروں میں کہیں
دل میں آیا تھا جو پَل بھر کے لئے
ایک نازک سا خیال

آج کا دن

آج کا دن عجیب تھا
صبح سے لے کے شام تک
ہنستی رہی کسی کی یاد
روتی رہی اک آرزو

سنگیت ۱

نغمہ و رقص کے نام پر
ایک ہنگامۂ ساز و آواز برپا تھا جب
مہرباں ہو کے
مجھ سے بہت دیر تک
خموشی مخاطب رہی، زیرِ لب

سنگیت ۲

دھرتی، امبر، ندیا، پربت
پھل، پھلواری، برکھا، بادل
سب کچھ لاگے سپن سمان
ٹوٹا جائے جگ سے ناتا
کس نے چھیڑا شدھ کلیان!

نجیب احمد

محفوظ رستوں کا خوف

مجھے محفوظ رستوں سے ہمیشہ خوف آتا ہے
اگر کوئی تمھیں تم سے زیادہ پیار کرتا ہو
تو اُس دل کی ہتھیلی پر کھنچی قوسِ تمنا دھیان میں رکھنا
کہ اے جاناں! خطِ عکسِ جمالِ آرزو بھی آئنے کی قید سے باہر نہیں ہوتا

سرِ قرطاس، لفظوں کے الاؤ، مت جلاؤ
زندگی تاریخ کا پہلا ورق پڑھنے کو اُٹھی ہے
اگر لٹنے کا اندیشہ کفِ دل میں دھڑکتا ہو
کسی کی کھوج کا شعلہ درونِ جاں بھڑکتا ہو
تو اہلِ غم بہت محتاط قدموں سے سفر آغاز کرتے ہیں
ہوا کا ہاتھ دشمن کے لیے تلوار بنتے ہی
حفاظت کا منقش شامیانہ سر پہ تنتے ہی
سفیرِ غم متاعِ ذات کی پروا بھی کرنا چھوڑ دیتے ہیں

زیادہ دن نہیں گزرے
شبِ غفلت نے پہرے دار کو موقع فراہم کر دیا تھا
بلندی پر قدم دھرنے کی خواہش
اَن گنت مٹی کے ذرّے کھائیوں میں پھینک دیتی ہے
سو اہلِ غم
اطاعت کی زمیں پر سر جھکاتے چل رہے ہیں
زیرِ لب نادیدہ لفظوں کے الاؤ جل رہے ہیں
مجھے محفوظ رستوں سے
ہمیشہ خوف آتا ہے

ناہید قاسمی

اے میرے شہرِ سخن!

میری دُعا ہے
شاد رہے، آباد رہے، اے میرے پیارے
شہرِ سخن!

بیشک میرا جذبہ زندہ اور احساس بھی جاگ رہا تھا
پھر میں اک فن کار کی مانند
روشن سوچ اور اچھے دل اور واضح لہجے کی مالک تھی
لیکن مجھ کو اس سچائی سے انکار نہیں ہے
ایک مکمل شاعرہ تو میں کبھی نہیں تھی!
پھر بھی تو نے مجھ کو اپنے اندر رہنے بسنے کی تو
سہولت دے رکھی تھی!!

لیکن سُن
اے میرے اچھے سامع!
مجھ کو اپنی آرزوؤں کی کلیاں
پھر سے دیواروں میں چنوا دینا ہوں گی
اپنے زندہ جذبوں، جاگتے احساسات کو اور چمکتے لہجے کو
تاریکی کے غاروں میں چپ کی لوری دے دے کر سلوانا ہوگا
اور بناوٹ کی گہری قبروں میں سچائی کو بھی دفنانا ہوگا
جب ایسا ہے
میرا ذرا سا بھی یہ حق نہیں بنتا
میں اپنے گھائل اور بکھرے وجود کے ساتھ
کوئی بیساکھی تھامے
تیرے کسی کونے کھدرے میں چھپ کر بیٹھ سکوں

سو اے میرے آنسو پونچھنے والے!
صبر و ہمت کی تھپکی سے حوصلہ دینے والے پیارے شہرِ سخن!
اب رخصت دے
اب تجھ سے بچھڑ کر میں انجانی منزل کی جانب جاتی ہوں
تیرا بھلا ہو
مجھے دُعا دے!

منصورہ احمد

لفظ و معنی

یہی شہرِ ہزیمت تھا
جہاں ہم نے خود اپنی قبر کھودی تھی،
جہاں ہم نے یہ جانا تھا
کہ اپنے عہد نامے کی سبھی شرطیں اُدھوری ہیں،
کہیں نقطوں سے، قوسوں، دائروں سے
کوئی شے ایسے پھسلتی ہے
کہ لفظوں سے معانی چھین لیتی ہے،
رسیلی سی چاندنی میں چلتے چلتے
اندھیرا یوں ہماری سمت آتا ہے
کہ سائے کٹنے لگتے ہیں،
ہمیں ادراک ہے
اس کارگاہِ بود و ہستی میں
سُروں کے وصل سے ہی راگنی تخلیق ہوتی ہے

برستی بوندیاں مٹی سے ملتی ہیں
تو دھرتی پر نمو کی سیج سجتی ہے،
دھنک بھی سات رنگوں سے بنی ہے،
ہمارا قرب لیکن صرف دُوری میں پنپتا ہے،
ہمارے ساتھ کے لمحوں کو دیمک چاٹ لیتی ہے،
ہمارے لمس کی کونپل کئی آکاس بیلوں میں چھپی ہے،
مگر پھر بھی ہمارے لفظ کہتے ہیں
کہ ہم اِک دُوسرے کی روشنی ہیں
اور قوّت ہیں،
ہمارے لفظ کب تکذیب کی سُولی سے اُتریں گے ؟

منصورہ احمد

سیمیا

میں اکثر خواب میں چلنے لگی ہوں،
قدم اُس سمت اُٹھتے ہیں
جہاں پگڈنڈیاں دم توڑ دیتی ہیں،
کوئی جھلمل سی ہوتی ہے
تو قدموں سے لپٹتے راستے چنگاریاں بن کر لپکتے ہیں،
یقیں سارے گماں میں ڈھلنے لگتے ہیں،
بدن کی بانسری بجتی ہے
تو سب انترے استھائیاں باہم اُلجھتے ہیں،
لہو کے رقص کی سب ماترائیں جلتے بجھتے جگنوؤں سی ہیں
کسی آہٹ کا دھڑکن سے کوئی بے نام رشتہ ہے
مگر پہچان کی حد تک نہیں آتا،
کسی پرچھائیں سا، یہ ساتھ کیسا ہے
جسے محسوس کر سکتی ہوں لیکن چھو نہیں سکتی،
بہت مانوس سی اک چاپ
دل کی سرزمیں پر پاؤں دھرتی ہے
تو صدیاں سنسناتی ہیں،
یہ کس کی چاپ ہے
جو کائناتوں میں دھڑکتی ہے،
یہ کیسا روشنی کا دائرہ ہے
جس کے پیچھے میں یُگوں سے بھاگتی ہوں؟
یہ کس کی جستجو مجھ کو لئے پھرتی ہے
اَن دیکھے زمانوں میں؟
ہر اک قلزم کو طے کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے
کہ یہ لہریں مجھے اُن ساحلوں تک لے ہی جائیں گی
جہاں اُس چاپ کا پیکر — مری نیلم پری بسرام کرتی ہے
مگر ہر بار لہریں بس ذرا سے فاصلے پر ہی
کسی منجدھار سے ٹکرا کے رستہ بھول جاتی ہیں،
یہ کیسی ہجرتوں سے ہجرتوں تک کی مسافت
میرے قدموں سے بندھی ہے؟
یہ کیسی خواب سی وادی سے مجھ کو
فاصلے آواز دیتے ہیں؟
مجھے جانا کہاں ہے؟
کوئی مجھ کو مری اس سیمیا کے پار تک رستہ دکھائے گا؟

ابرار احمد

برسوں بعد

آنکھوں میں آ رُکا ہے
اک خواب بے وطن سا
آنگن میں چاند اترا
بیتی ہوئی شبوں کا
دل میں دہک اٹھا ہے
سویا شرر لہو کا
تُو ہم کو مل گیا ہے
اس بے اماں نگر میں
جوں امن کا جزیرہ
سیلابِ شور و شر میں

اک گوشۂ تسلّی
نفرت کے بام و در میں
اک فرصتِ نظر ہے
جو ہم کو ہے میسّر
تُو ہے تو ہم کو تھوڑی
راحت بھی ہے میسّر
کچھ پھول کھل اٹھے ہیں
اس سونی رہگذر میں
کچھ دن گذر سکیں گے
اسبابِ چشمِ تر میں
یہ کب رہا تھا ممکن
اس نیند کے سفر میں — !

جاوید انور

لاعلمی کی طاقت

لاعلمی کی طاقت ہے جو
فولادی دیواریں چاٹتے ہونٹوں کو فولاد بنا دیتی ہے
اکثر دھارے
پتھر پتھر سر ٹکراتے اکثر دھارے، دریا بننے سے
پہلے ہی مٹی ہو جاتے ہیں
مٹی ہو جاتے ہیں سمندر
اوّل اوّل جو ہر آنکھ میں جھلمل کرتے ہیں — جو
جھلمل کرتے ہیں تو ذرے سورج بن جاتے ہیں!

اِن ذرّوں کو
فولادی دیواریں چاٹتے ان ہونٹوں کو
پتھر کاٹتے اِن دھاروں کو اگر خبر ہو
دیواروں کے اُس جانب بھی چاند نہیں ہے
کہساروں کے اُس جانب بھی اُن کا سمندر مٹی ہے تو
دیواریں کیسے ٹوٹیں - اور
مٹی کیسے پھول بنے!

قسم ہے ڈوبتے دِن کی

قسم ہے ڈوبتے دن کی
خسارہ ہی خسارہ ہے
ترے جُوڑے کی کلیاں، پاؤں کی مٹی
مرا کالر دھوئیں کا استعارہ ہے
تنی گردن
کُھلا سینہ
کسی جُھلسی ہوئی ٹہنی کی صورت گھر کو لوٹے ہیں
تو لگتا ہے
کہ ہم نے دن نہیں، جیسے
ہمیں دن نے گزارا ہے
کہ وہ مطلع ہمارا تھا نہ یہ مقطع ہمارا ہے
قسم ہے ڈوبتے دن کی
خسارہ ہی خسارہ ہے!

ریحانہ روحی

کراچی کے لیے دو نظمیں

سروائول

ہر کا موسم ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے
ی خطرے کی حد سے اُوپر جانے کی فکر میں ہے
ہوائیں قابو سے باہر ہو جانے والی ہیں
ور زمین پیروں کے نیچے سے سرکتی جاتی ہے
شاید
وئی بہت بڑا طوفان ہماری چوکھٹ تک آ پہنچا ہے
دھر
ہمارے دریاؤں کے بند بہت بوسیدہ ہیں
اور ہمارے قلعے کے دروازے بہت شکستہ ہیں
ایسے وقت میں جانے اس بستی کے محافظ کدھر گئے ؟
اور امیرِ شہر کہاں روپوش ہوا
حاکمِ وقت کا ہونا اور نہ ہونا خیر سے دونوں ہی اک جیسے ہیں
اس پہ غضب ہے
اُوپر والا بھی خاموشی اوڑھ کے منظر سے غائب ہے
کسے پکاریں !!
کسے بلائیں !!
کوئی نہیں ہے
کوئی نہیں تو آؤ پھر ہم خود ہی
اس بستی کو بچانے کی اک آخری کوشش کر لیں
دشمن کی سرکار میں چل کر رحم کی یہ درخواست گزاریں
" دشمن بھائی !
کیا تم ہم بے بس لوگوں کے پھولوں سے معصوم
اور سہمے بچوں کو
اپنے بچوں کے صدقے میں
امن کا کوئی لمحہ بھیک میں دے سکتے ہو ؟"

ریحانہ روحی

پتھر لوگ

اس جیتی جاگتی بستی میں
جہاں پھول کھلیں تو خوشبو سے محروم رہیں
چاندنی راتیں چودھویں شب سے خالی ہوں
آئینوں میں عکس ہوں، خدوخال نہ ہوں
دریاؤں میں سطحیں ہوں، پاتال نہ ہوں
جہاں آپس کی پہچان کہاوت لگتی ہو
جہاں تھوڑی سی مسکان سخاوت لگتی ہو
جہاں پنجروں کے دروازے بند نہ ہوں تو پھر بھی
ان میں پرندے قید رہیں
آنکھیں عینی شاہد ہوں پر وقتِ شہادت
اندھی گواہی بن جائیں
آوازوں کا شور سماعت قتل کرے
گھر بھی عقوبت خانوں میں تبدیل ہو جائیں
جبری چندہ لینے والے غنڈے شہر میں پھرتے ہوں
اور عبادت گاہوں کے محراب و منبر گرتے ہوں
جہاں بچوں کے اسکول سے واپس آنے کا امکان نہ ہو
جہاں لوگوں کا گھر لوٹنا غیر یقینی ہو
جہاں سب کچھ غیر زمینی ہو
جب آنکھوں میں کوئی خواب نہ ہو
جب حرفِ دعا شاداب نہ ہو
تو اس موسم میں
کون کسی کو ہنس کر رخصت کر سکتا ہے ؟؟

یونس متین

کالی یُگ

اگر ہم سانس لیتے ہیں
برہما کے کلپ میں
تو منوانتر میں پہلے چتر یگ کی شاخ پر کھلتے ہوئے چاروں
یُگوں میں یہ رواں یُگ آخری یگ ہے
یہ کلجگ — کالی یُگ ہے
شودروں کا، قاتلوں کا، بے وفاؤں، انتشارِ امن کا
مذہب کے بِکنے کا
کہ مذہب تین ٹانگیں کھو کے مرگِ ناگہاں کی زد میں رہتا ہے
اِسی یُگ میں، مری سیما!
مری جاں! تم بھی زندہ ہو
تمھاری چاند کرنوں ایسی صورت بھی
مہکتی، خوبرو، خوشبو بھری باتیں بھی، پاکیزہ محبت بھی
تمھاری پھول سی معصوم آنکھیں بھی
کہ جن میں ہر کرت یگ کا ستارہ جگمگاتا ہے
کرت یگ اوّلیں یُگ ہے
کسی مفروضے کی بنیاد میں رکھے ہوئے سب علم کی روشن شعاعوں سے
فزوں تر ہیں
ترے ہاتھوں کی شمعوں کی ضیائیں
جو ابد تک میری آنکھوں کے لیے رستے کی صورت ہیں
محبت انت ہے، لامنتہا کا استعارہ ہے
مری سیما!
تمھارے پارسا سینے کی سچائی
کسی منطق کی سچائی سے پہلے کا زمانہ ہے
کہ ہم انسان پہلے اور شودر بعد میں ہوں گے

میں پہلی جنگ میں ہارا
تو دنیا میں چلا آیا
اِسی دنیا میں رہ کر دوسری بھی جنگ لڑنا ہے
ابھی میں امن کے عرصے میں ہوں کہ ایک جنگ اور دوسری
کے درمیاں کو امن کہتے ہیں
ہبوطِ آدم و دنیا کی اِن جنگوں کے بہتے درمیاں میں
تم بھی زندہ، میں بھی زندہ ہوں
وہ جیسے اک خزاں سے دوسری کے درمیاں میں پھول کھلتے
اور بہاروں کی مہکتی اپسرائیں مسکراتی ہیں
اگر ہم شانتی کے پھول ہیں اور امن کے عرصے میں رہتے ہیں
تو پھر یہ کالی یُگ کیا ہے — !
برہما کا کلپ کیسا — ؟

صفی حسن

یہی تو سچ ہے

شعوبِ اہلِ نظر سے اک دن
چھپی ہوئی کچھ حقیقتوں کا
سوال ہونا ہی چاہیئے تھا
اگر میں تہذیبِ آب و گِل کا ہی اِک ثمر تھا
تو مجھ کو آخر
زوال ہونا ہی چاہیئے تھا
مگر محبت کے سب صحیفوں میں یہ لکھا ہے
کہ میری تخلیق دستِ قدرت کی آیتوں میں عظیم تر ہے
اگر یہ سچ ہے!
(یہی تو سچ ہے)
تو میرے دستورِ آگہی کی نہایتوں میں
کمال ہونا ہی چاہیئے تھا

مراجعت

میں منتظر ہوں اُسی ایک صبحِ فردا کا
کہ جس کے رُوئے درخشاں کی تابنا کی سے
زمیں کی مانگ سجے
آسماں گواہی دے
کہ ہر وہ قطرۂ خوں جو گلوئے بسمل سے
ٹپک کے شہرِ ستمگر میں صرفِ خاک ہُوا
اُسی غبارِ پریشاں سے دستِ قاتل میں
ثباتِ عدل کی زنجیر ڈال آیا ہے

(برمنگھم)

اسلم طارق

بَن باس کا ایک اور موسم

وہیں سے پھر سفر آغاز کرتے ہیں
جہاں پر ہم اندھیرے سے مخاطب تھے
ہمارے ہاتھ سے جب لفظ گر کر کرچیاں ٹھہرے
تو ہم یہ کہہ رہے تھے
لفظ مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے
یہ ساری کرچیاں خود آئنے ہیں
ایک لمبی چُپ
اندھیرا معتبر تھا
اور گھروں کو لوٹ کر جانا بھی لازم تھا
ٹپکتی چھت کے نیچے حوصلے بس خواب ہوتے ہیں
کہ گیلے فرش پر پاؤں نہیں جمتے
وہیں سے خواب کو پھر جوڑتے ہیں
جس جگہ پر ہم اندھیرے سے مخاطب تھے
بہت اُونچی پتنگیں آسماں پر تھیں
پرندوں کے ٹھکانے اُونچے پیڑوں کی فصیلوں پر بنے تھے
گھونسلوں میں پَر نہیں تھے، چھوٹے بچوں کی دعائیں تھیں
ستارے جگنوؤں کے ساتھ مل کر کھیلتے تھے
ایک لمبی چُپ
اندھیرا معتبر تھا
اور گھروں کی چار دیواری میں سارے خواب قیدی تھے
بتاتے ہیں، ہوا کو خوف کی دیواریں چُننے کی سازش ہو چکی تھی
آؤ پھر سے آئنے کو جوڑ لیتے ہیں
حفظِ ما تقدم کی تنسیخ پر راضی نہیں ہوتا
ہمیں جنگل بُلاتے ہیں

سید مبارک شاہ

ڈیفنس کلب کراچی

مبادیاتِ وحدت الوجود زیرِ بحث تھیں
مِرے سوا کوئی نہ تھا
سکاٹ لینڈ کی سیاہ مارکہ شراب کا بھی دُوسرا ہی دَور تھا
کہ آئینے کا در کھلا
جہاں سے میرے تین چار عکس آ کے شاملِ سخن ہوئے
مباحثہ تو نا تمام مرحلے میں تھا، مگر
سکاٹ لینڈ کی شراب تیسرے ہی دَور میں تمام تھی
کسی نے میز سے کلب کا مینیو اُٹھا لیا تھا
روسٹڈ چکن تھا یا بُھنا ہُوا مٹن تھا
خیر، جو بھی تھا سو کھا لیا
اور اُس کے بعد بحث پھر سے چھڑ گئی
میں گفتگو کے واسطے جو لفظ تولنے لگا
نہ جانے کس کا ماس
میری عقل کی دراڑ دار داڑھ سے اُلجھ کے بولنے لگا
سکوت چھیڑنے لگا
میں اپنے ناخنوں سے اپنا منہ اُدھیڑنے لگا
تو کیف قے کی کیفیت میں ڈھل گیا
مرا لہو مری زباں پہ ناخنوں نے مل دیا
نہ جانے کس کا ماس تھا
نہ جانے کس کا خون تھا
مبادیاتِ وحدت الوجود زیرِ بحث تھیں !

بے عنوان

سوالیہ نشان کی قطار میں کھڑے ہوئے مفکّرو !
جواب دو
وہ کون، کیسا، کس لیے، کہاں پہ ہے، کب سے، کب تلک
سوالِ شش جہات کا جواب کوئی اب تلک
جو مِل گیا تو کھل سکے نہ کیوں کسی کے لب تلک

"مگر یہاں کشادِ چشم و لب کسی کے بس میں ہے
سوال تک رسائیاں محال ہوں
تو ہمتِ جواب کس کے بس میں ہے
وہ کس کی دسترس میں ہے
جو معرفت کے لب کھُلے
تو تبصروں کی بارشوں میں سولیاں لہولہان ہو گئیں
اگر کسی پیمبرِ عظیم کی نظر اُٹھی
نگاہِ بازگشتِ نامراد کی شکستگی کے وار سے
بصیرتوں کے زعم میں بصارتیں بھی جل گئیں"
تو ٹھیک ہے
تمھیں کشادِ چشم و لب کی لذّتوں کی کیا خبر
سو تم ہنوز برزخِ تذبذب و گماں میں پڑے رہو
مُفکّرو !
سوالیہ نشان کی قطار میں کھڑے رہو

افتخار مغل (آزاد کشمیر)

ایک اور دیس کی کہانی

[وسطی امریکہ کے ایک حریت پسند شاعر فرنینڈو گارڈیو سَر دانتیس کی نظم "ایک دیس کی کہانی" کے حوالے سے۔ فرنینڈو کو بغاوت کے الزام میں گولی مار دی گئی تھی۔]

فرنینڈو
تو سچ کہتا تھا
دیس بھی بیچے اور خریدے جاتے رہے ہیں دُنیا میں
اور یہ قوموں کے سوداگر
مشرق، مغرب سب دیسوں میں
ایک ہی جیسے ہوتے ہیں
اک تھیلی کے چٹے بٹے، اک مسلک کے بندے ہیں
سکوں کی قیمت میں فرق تو ہو سکتا ہے
مظلوموں کے سروں کی قیمت
دنیا کی ہر اک منڈی میں
لگ بھگ ایک ہی جیسی ہے
یوں قیمت بے قیمت بکنا
ہر کمزور کی قسمت ہے
تو نے کہا تھا

وہ کہتے ہیں، دیس کے بیٹے پیدا ہوئے ہیں گانے کو
جنگ بھی تو اک میٹھا نغمہ ہوتا ہے
موت سے بڑھ کر کوئی سُریلا گیت نہیں،
تو رو دیا تھا دیس کے بیچے اور خریدے جانے
تیرے اُس رونے سے پہلے
کوہ ہمالہ کے دامن میں
پھول پھول اک دیس بکا تھا
جس کے بیٹے جنم جنم سے
اُس مہنگے، سستے سودے کا مول چکاتے آئے ہیں
پل پل موت کے میٹھے، کڑوے
نغمے گاتے آئے ہیں
ڈیڑھ صدی ہونے کو آئی
مول چکا نہیں پائے اب تک
نغمہ گا نہیں پائے اب تک

افتخار مُغل

تین سو پینسٹھ

(کشمیر میں انسانیت کے قتل کا چھٹا سال شروع ہونے پر)

تین سو پینسٹھ دن — اور راتیں
شہر کی دیواروں پر بیٹھی دُھول کے بوجھ سے قتل ہوئی ہیں
تین سو پینسٹھ شِکرِ دوپہریں!
تار کول کی لِش لِش کرتی کالی چکنی سڑکوں اُوپر
اِک اِک کر کے ذبح ہوئی ہیں
تب صدیوں کے گہرے اور کالے کشکول میں ایک نیا سکّہ کھنکا ہے
کچّی نیندیں پکّے رستے اِک چھلنی سے چھن جاتے ہیں
لیکن دُوجا پلڑا بھاری جس پلڑے میں اِک آنسو ہے
پیر پنجال سے ٹوٹنے والا۔ ڈل کی ڈال پہ پُھوٹنے والا
اِک آنسو جو جاگ رہا ہے

٭

ایک برس کِتنا ہوتا ہے ؟
بارہ ماہ کے نیچّے جِتنا ؟
پہلے پیار کی پہلی سالگرہ سے کم — یا زیادہ ؟
[وادی میں اِک کاتک سے اگلا کاتک
جس کے بیچ کے خالی پن کو دشمن فوج کی آنکھیں بھر دیں]

٭

اُن صدیوں کِس درجہ سکھ تھا
جن صدیوں کے لوگ برس کو
تنگ دہانے والے برتن کی گردن سے گرنے والی
ذرّہ ذرّہ ریت کے جگمگ ڈھیر سے ناپا کرتے تھے
اِن صدیوں میں کِتنا دُکھ ہے
ہریاول وادی کے باسی [جن کا اپنا کوئی معیاری وقت نہیں ہے
اور ساری گھڑیوں کی سُوئیاں نصف صدی سے ایک سوال
پہ رُکی ہوئی ہیں]
اپنے سال کو اپنے پیاروں کی قبروں سے ناپ رہے ہیں
شہرِ شہیداں کے دامن میں کتبہ کتبہ، قبروں قبروں
اب کے کِتنے پُھول کِھلے ہیں —
جانے والے سال نے کِتنے زخم دیے ہیں —
لیکن اِن زخموں کے مُنہ تیکھے تیکھے، چِکنے چِکنے ہیں
شاید آنے والے سال کا ماتھا اور بھی روشن ہو گا
سالِ گذشتہ اللہ رکھا!

اعجاز رضوی

تین مختصر نظمیں

آخری سفر میں آخری خواہش

چاند گاڑی سے کیسی نظر آ رہی ہے زمیں
دیکھنے دے
عین ممکن ہے اس مرتبہ چاند سے واپسی خواب ہو
عین ممکن ہے اس مرتبہ واپسی ہو بھی جائے تو ہم
اس زمیں پر نہ اتریں
اور اگر اتفاقاً کہیں کچھ زمیں مل بھی جائے تو ہم
خوف کی وردیوں میں کسے
بے یقینی کے پرچم اٹھائے
اُسی چاند گاڑی میں بیٹھے ہوئے دُوربینیں لگائے
کسی اپنے جیسے بشر کی جھلک دیکھنے کی تمنا کریں
عین ممکن ہے اس ٹُور کے بعد یہ چاند گاڑی نہ ہو
اور ہم اُن خلاؤں میں یوں ڈولتے پھر رہے ہوں کہ جیسے
کوئی بے ثمر شے زمیں پر پڑی اپنی قسمت پہ روئے
چاند گاڑی کی رفتار یوں مت بڑھا
اتنی جلدی ہے کیا،
دیکھنے دے، مجھے اپنے جیسے بشر دیکھنے دے
آخری بار مجھ کو زمیں دیکھنے دے
مجھے اپنا گھر دیکھنے دے

نابینا

دنیا! تیری چمک دمک نے اندھا کر ڈالا
رستا چلتے
باتیں کرتے
ہر انسان کو مردہ کر ڈالا
دُنیا! تیری چمک دمک نے ....
دُنیا تیری چاہت نے تو دل سے دھڑکن، آنکھ سے آنسو
لب سے حرف دلار
اور لہو سے پیار کے ذرے سب کچھ چھین لیا
دُنیا! تیری چمک دمک نے کیسا ظلم کیا!
کیسا ظلم کیا!!

التجا

جب تک ان آنکھوں میں سُورج ڈھل نہیں جاتا
اپنی آنکھیں کھول نہ دینا
یوں نہ کہیں ہو
ایک ہی لمحے ڈھلتے سُورج ... اور
اُبھرتے چاند کا منظر دیکھ کے دُنیا
حیراں بھی ہو
اور دونوں سے منکر بھی

داؤد رضوان

تنہائی میں ایک مکالمہ

ابھی تو رفاقت کا آغاز بھی ٹھیک سے کب ہوا تھا
ابھی تو محبت کے رنگوں میں ناپختگی تھی
ابھی تو بدن کے ہر اک انگ میں
تجھ کو خوشیوں کی کلیاں بھی مہکانی تھیں
دوستی رُوح کے آنگنوں میں
گلابوں کی صُورت تھی کھلنی
ابھی تو بہاروں نے
دروازے پر دستکیں دینی سیکھی نہیں تھیں

وہ خوشیوں کی کلیاں
مہکنے سے پہلے ہی مُرجھا گئی ہیں
گلابوں کے کھلنے کی نوبت نہیں آسکی ہے
ابھی سے بہاریں
خزاں کی عداوت کا
کیونکر نشانہ بنی ہیں

ابھی سے مری جان، یہ کس طرح ہو گیا
اعتبارِ محبت کے ناپختہ رنگوں کو
بے اعتمادی کی بارش
بہالے گئی ہے

ابھی سے مری جان! بے اعتباری
دراڑوں کی صورت دلوں میں
در آئی تو کیسے؟
دُکھوں سے اگر
رُوح چھلنی ہوتی ہے — تو کیونکر؟

اسرار ایوّب

صدی لُٹ جاتی ہے

جب خُون بہے دریاؤں میں
اور تیرا بدن بے رنگ رہے
جب درد بچھا ہو چار طرف
تو محوِ رباب و چنگ رہے
جب شور مچا ہو دُنیا میں
تُو ساکت و بے آہنگ رہے
برپا ہو جنگ آزادی
تیری تلوار پہ زنگ رہے
جب ایسی ساعت آتی ہے
اِک پَل میں صدی لُٹ جاتی ہے

جب ہوس کا نام محبّت ہو
دولت معیارِ فضیلت ہو
مذہب اسبابِ تجارت ہو
ایماں صرف ایک روایت ہو
انصاف کی بات بغاوت ہو
رشوت قانون ضرورت ہو
جب علم پہ جہل کو فتح ملے
جب حق کی جگہ حکایت ہو
جب ایسی ساعت آتی ہے
اِک پَل میں صدی لُٹ جاتی ہے

رخشندہ نوید

گڑیا کی گڑیا

ننھی جھولی
مرے ماتھے کی شکنوں
ہانپتی سانسوں
ہتھیلی تر بہ تر بوندوں سے
پاؤں کی تھکن، تشنہ دہن
فہرستِ خوابِ خواہشِ دُنیا بھی تہہ مٹھی میں
جلتے شوق کے بجھتے الاؤ نے یہ دکھلایا
میں جب بازار سے لوٹی
کوئی بھی چیز کم قیمت نہیں آئی
سجائیں روبرو اشیائ تو دُکھ پایا
کہ میرے ہاتھ کوئی چیز بڑھیا بھی نہیں آئی
اٹھایا سَر تو، چھلنی ہو گئی اس کی نظر کے ننھے تیر
کہ پھر اس بار میری ننھی سی گڑیا کی گڑیا بھی نہیں آئی

شمیم سہگل

تمنا کا دوسرا سرا

فصیلوں پر کمندیں ڈالنے کا حوصلہ تم میں نہیں تھا
نہ مجھ میں جراتِ اظہار ایسی تھی
کہ درِ زنداں کے کھُلتے
نہ اتری آسمانوں سے سنہری پالکی جس میں
حسیں خوابوں کا تحفہ تھا
میں آنکھوں میں سجائے خواب اُس کے
بدلتی رہ گئی زنداں خانے
چلے آؤ مرے بزدل!
کہ اب تو شام سی ہونے لگی ہے
سنہری دھوپ اب جانے لگی ہے
فصیلوں پر اترتی شام کے گمبھیر سائے
بشارت دے رہے ہیں
"درِ زنداں کھلے گا"
"قفس بے معنیٔ اجسام ہوگا"
چلے آؤ مرے بزدل!
یہ منظر ہے وداعِ شام کا
ناند تمھیں اچھا لگے گا ——!

ایک نظم صرف تمھارے لیے

کیا کبھی ایسا ہُوا ہے تیرے ساتھ
درد ہو مجھ کو تو
تو شدت سے اُس کی، رو پڑے!
ایسی ہی اک کیفیت مجھ پر قیامت ڈھا گئی
میں نے جب دیکھا کہ تُو نے
آخری بازی بھی آخر ہار دی
میرے ہی نقشِ قدم پر چل کے تو بھی آخرش
زیست کے اُس موڑ پر پہنچا جہاں
سامنے دریا تھا، پیچھے آگ تھی
کیا خبر تجھ کو کہ میں نے اُس گھڑی
کس قدر چاہا، پکارا تھا تجھے ——!
آ! کہ اب روئیں گلے مِل کر
سنائیں بیٹھ کر
اپنے اپنے انتقاموں کی بھیانک داستاں
جن کی زد پر ہم نے خود رکھا تھا اپنی ذات کو!

منظر حسین اختر

یہ کیسی ریت پر بہنے لگا ہوں

حدودِ روز و شب کی زرد مٹی چاٹ دیا
ہوا کے ساتھ بہتا ہے
ہوا کی بات سنتا ہے
درونِ جاں بھٹک جانے کا اندیشہ بہت آہستگی سے سر اٹھاتا ہے

یہ دل درویش کا گھر تھا
ترے کردار کے مانند سچا اور ترے رخ کی طرح روشن
خود اپنی رات کا مالک، خود اپنی دھوپ کا مختار یہ دل تھا
کسی کو کیا بتائیں، کس قدر سرشار یہ دل تھا

یہ کیسی ریت پر بہنے لگا ہوں
یہ نوکِ خار کی مانند تیکھے ریت کے ذرے
رگ و پے میں نہ بھر جائیں
خود اپنی ذات سے باہر اچھلتے تیز دریا کو
کہیں صحرا نہ کر جائیں
مری آنکھوں سے چل کر تیرے گھر تک آنے والی
رہگذر تاروں سے خالی ہے

کفِ دریا پہ کیسے دلدلی گرداب پڑتے ہیں
ستارہ دیکھتی آنکھیں تہِ آبِ رواں اندھے کی لاٹھی مانگتی ہیں
کوئی جگنو کوئی تارا کہیں روشن نہیں ہے
کناروں سے بندھا دریا
ہوا کے رُخ پہ بہتا ہے!
ہوا کی بات سنتا ہے!

زمینِ دل میں نمی بہت ہے

زمینِ دل میں نمی بہت ہے
وہ ہجر لمحہ
کہ جس کی چوکھٹ پہ وصل کی آب دار خوشبو سحر نما ہے
شکستہ لمحوں کی ہمرہی میں سفر بپا ہے
یہ اشک آنکھوں سے بہہ رہے ہیں کہ لہر کوئی دکھوں
کے صحرا میں گر رہی ہے
ورق ورق پر یہ کس کے غم نظم ہو رہے ہیں
سخن گرفتہ قلم ورق سے پھسل نہ جائے
زمینِ دل میں نمی بہت ہے!

آمیر حسین جعفری

ہُنر

شام کا تو نے جب کیا وعدہ
میں نے ہر شام تیری راہ تکی
کتنی شامیں اُجاڑ کر رکھ دیں

چار سُو چھا رہا ہے سنّاٹا
ایسا محسوس ہو رہا ہے مجھے
آخرکار اِس کہانی میں
اِک نہ اِک روز موڑ آنا ہے
تارا تارا جو خواب چمکے تھے
لمحہ لمحہ انھیں بجھانا ہے

بسترِ گُل بنامِ شامِ وصال
ہجر کی سیج پر بچھانا ہے
اب مجھے اِس ہنر تک آنا ہے

ساتھ

آ بسا کون میرے پہلو میں
ایک تصویرِ رنگ ہے جس سے
ہو رہے ہیں مکالمے میرے!

میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں میں
تیرے ہاتھوں کی کپکپاہٹ ہے
اور تو کہہ رہی ہے یہ مجھ سے
—"ہر طرف بے بصر اندھیرا ہے
کون جانے کہ صبح ہونے تک
آسماں بھی رہے رہے نہ رہے
میری پلکوں پہ جو ستارے ہیں
اسی خدشے کے استعارے ہیں —"

آ بسا کون میرے پہلو میں
ایک تصویرِ رنگ ہے جس سے
ہو رہے ہیں مکالمے میرے!

احمد ندیم قاسمی

حواسِ خمسہ

مجھے ایک طفل کے ہاتھ
مٹی میں سَن کے بھی
کبھی پھول
اور کبھی نجوم دکھائی دیں

مجھے سیدھی سادی سی، بھولی بھالی سی صُورتیں
نظر آئیں خالقِ حسنِ فن کا کمالِ فن

لبِ مقتدر کے حروفِ نرم کے اُس طرف
مجھے کتنی چیخیں سنائی دیں

مرے ہاتھ
کتنی کروڑ آہیں
شبِ خموش کے دامنوں سے نچوڑ لیں

میں گلاب سونگھ کے
اس کو ڈھونڈنے چل پڑوں
جو زمیں کا عطر نکال کر
کسی خس کدے میں — نڈھال
اپنے خدا سے رزقِ حلال مانگتے مانگتے
پڑھے اپنے ہاتھوں کی مٹتی مٹتی عبارتیں

مجھے شہد تلخ لگے
کہ جیسے میں چور ہوں
میں وہ پھل چراتا ہوں
جس میں کتنی مشقتوں کی مٹھاس ہے

میں کسی بدن کو ہوس کے جبر سے مس کروں
تو مثالِ شعلہ بھڑک اُٹھوں
کہ امانتوں میں خیانتوں کی ندامتوں کا خیال
ایک الاؤ ہے
جو کسی طرح بھی تپش کی حد کو نہ کم کرے
جو ضمیر تک کو بھسم کرے

یہ اسی صدی کا قصّہ ہے

امِّ عمارہ

"کہتے ہیں کہ دو خوبصورت انسان مل کر خوبصورتیاں جنم دیں تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں سمجھی جاتی۔ عموماً یہی خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی گود میں بدصورتی نہیں کھیل سکتی ـــــ کیوں بشریٰ؟" ڈاکٹر راحیل نے اسٹیتھکوپ ایک طرف رکھتے ہوئے اپنی بنتِ عم سے کہا۔ جو اس کی بنتِ عم کے علاوہ بھی بہت کچھ تھی۔ وہ دونوں ایک ڈوری میں بندھے ہوئے تھے۔

"مگر راحیل کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہو جاتا ہے۔"

"ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو خوبصورت، تندرست و توانا لوگ بدصورتی تو ایک طرف، زمین کے بوجھ کو جنم دے ڈالتے ہیں۔ آئی میری بات سمجھ میں حضور والا؟" ڈاکٹر راحیل نے اوورآل اتار کے کرسی کی بیک پر ڈالتے ہوئے کہا۔

کیسی باتیں کرتے ہو راحیل۔ ہم یہاں حسن و قبح کا پرچار یا مقابلہ کرنے کے لئے نہیں اکٹھے ہوتے۔ اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے یہاں آتے ہیں۔ پھر ہم کہاں اتنے خوبصورت ہیں کہ بدصورتی ـــــ میرا مطلب ہے کہ ایسی باتوں کا فائدہ؟ میری بات سمجھ میں آئی آپ کے ڈاکٹر راحیل؟ یہ باتیں کچھ غیر متعلق سی تو نہیں ہیں؟" ـــــ ڈاکٹر بشریٰ نے فلاسک سے کافی پیالوں میں ڈالتے ہوئے راحیل کو غور سے دیکھا۔

ادھر وہ بہت دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ راحیل کچھ الجھی الجھی گفتگو کرتا ہے اور گھوم گھام کر کبھی بدصورتی، کبھی خوبصورتی کبھی خاندانی بیماریاں کبھی جینٹک مسئلے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اس وقت بھی گفتگو خوبصورت جوڑے سے بدصورت اولاد اور جینٹک بیماریوں تک آگئی۔

"راحیل آپ کو کیا الجھن ہے؟ آپ مجھ سے تو ہر طرح کی بات کر سکتے ہیں کہ میں تو آپ کی قریب ترین ساتھی ہوں اور اس سے بھی زیادہ قربت ـــــ"

"ہاں یہ تو ہے اور سب کچھ ہونے کے علاوہ تم میری بنتِ عم بھی ہو۔ ہمارا خون، ہمارا سب کچھ۔ ہم نے عربوں ہی کی روایت اپنائی ہے ـــــ لیکن یہ جو ـــــ تم اور ہم یعنی کہ ہم اور تم ہیں ـــــ بات یہ ہے بشریٰ کہ تم سچ مچ مجھے بہت پسند ہو۔ میری اپنی ہو۔ بغیر کسی رکاوٹ کے ساور ہم ایک دوسرے کو سمجھتے بھی بہت ہیں۔ خاندان والوں نے ہمارے لئے دعائے خیر بھی کر دی ہے اور ہم ایک ہی ہسپتال میں بھی کام کرتے ہیں۔"

"صحیح ہے۔"

"لیکن یار پھر بھی بڑی رکاوٹ ہے۔"

"ہاں یہ ہے۔ جب مزاج ہی نہیں ملتے تو ـــــ"

"کیسی باتیں کرتی ہو، تم سے زیادہ کون میرا مزاج شناس ہوگا۔ ہم بچپن کے ساتھی ہیں ـــ ہیں نا؟"
"ہاں ہاں بالکل ہیں مگر کوئی ضروری تو نہیں کہ بچپن کے ساتھی ہمیشہ بھی رہیں ـــ"
"ہاں بالکل یہی بات ہے بشریٰ۔ ہم قطعی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ ویسے ہم دونوں خوبصورت بھی ہیں۔"
"خوبصورت خیر ایسے بھی نہیں ہیں۔ بے شک آپ ہوں گے۔ ہمارا کیا ہے۔" بشریٰ نے ٹھنڈی یخ کافی منہ میں انڈیل لی۔
"بھئی تمہارے پاس بہت حُسن ہے جو مجھے صاف نظر آتا ہے، وہ تمہیں کیسے نظر آئے گا۔ تم بہت خوبصورت ہو۔ بھی ٹھیک ٹھاک ہوں ـ ـ پھر دونوں ہی ڈاکٹر ہیں، دونوں عقلمند ہیں ـــ اور دونوں ہی کے جسم میں ایک ہی ن رواں دواں ہے ـــ کیوں بشریٰ میں کوئی غلط کہہ رہا ہوں؟"
"ہاں ہاں بالکل صحیح کہہ رہے ہو ـــ" بشریٰ نے کافی کا گھونٹ بھرا۔
"دراصل بشریٰ، سارا فساد اسی خون کا ہے جو ہماری اور تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔"
"کیا مطلب ہے تمہارا؟" بشریٰ نے پیالی میز پر رکھ کے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
"میرا مطلب ہے جانم۔ کہ یہ خون ـــ یہ نسل یعنی ہمارا مشترکہ خاندان ـــ میرا مطلب ہے بشریٰ کہ مجھے جینیٹک ماریوں سے بہت ڈر لگتا ہے ـــ"
"جینیٹک بیماریاں ـــ ہاں ان سے تو میں بھی خوفزدہ ہوں ـــ مگر یہاں ان کا کیا ذکر ـــ"
"بھئی یہ ذکر بڑا ضروری ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارے بچے اس زمین کا بوجھ بنیں۔"
"یہ کیا بات ہوئی؟ قبل از مرگ واویلا ـــ تمہیں کیا ہوا ہے راحیل؟"
"نہیں بھئی۔ یہ قبل از مرگ واویلا نہیں ہے۔ ہمارا تمہارا جو رشتہ ہے اس کے پس منظر میں کوئی بات بھی بے وقت نہیں ہے۔ کہیں ہمارے بچے ـــ"
"مگر راحیل۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ ہمارے ہی بچے، اس آفت کے شکار ہوں اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم بچے بھی پیدا کریں۔" بشریٰ سخت پریشانی کے عالم میں کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ راحیل اسے اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا اور اس سے ایسی باتوں کی توقع اس کو بالکل ہی نہیں تھی۔
"ہم ڈاکٹر ہیں۔ اسی لئے ہمارا مستقبل ہمیں ڈراتا ہے۔ ورنہ ہم تو گل و بلبل کی طرح مہکتے چہکتے رہتے اور لوگ کہتے کہ دیکھو کیسا خوبصورت جوڑا جا رہا ہے۔" راحیل نے مسکرانے کی کوشش کی ـــ
"نہیں بشریٰ۔ مذاق نہیں کر رہا میں خوب ہیں ہم بھی ـــ اور تمہاری تو بے شمار خوبیاں ہیں ـــ لیکن بشریٰ مجھے بچے ضرور چاہئیں ـــ اور جسم سے اپاہج یا دماغی طور پر کمزور نہیں۔"
"کیسی باتیں کرتے ہو راحیل۔ یہ بات بھلا کسی کے بس میں ہے۔ ویسے ایسا خیال کیوں تمہارے دل میں آیا۔ دیکھو ہمارے درمیان کبھی کوئی پردہ کب تھا۔ ہم ایک گھر میں رہتے ہیں اور ـــ"
"ہاں بالکل۔ ہم ایک گھر میں رہتے ہیں۔ ہمارے درمیان سب کچھ ایک ہے۔ لیکن ایک کمرے تک پہنچنے سے پہلے ہمیں ایک گھر میں رہنے کا خیال چھوڑ دینا چاہیئے۔ مجھے ہر حال میں بچے چاہئیں۔ ایسے بچے جو تمہاری کوکھ سے نہ نکلیں ـ"
راحیل نے وہ بات بڑے آرام سے کہہ ڈالی جس کا تصور کرتے ہوئے بھی وہ بدحواس ہو جاتا تھا ـــ اب اس کی پیشانی

پسینے سے بھیگی جا رہی تھی۔۔۔۔۔
"تم اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو"۔ بشریٰ نے بڑے سکون کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آنچل سے اس کی پیشانی اور چہرہ پونچھا۔ "ٹھیک ہے ہم الگ ہو جائیں گے۔ کون سی ہماری رخصتی ہو گئی ہے۔ ابھی ہم ایک کمرے تک کہاں پہنچے ہیں۔۔۔۔۔ تم جیسا چاہو گے"۔ بشریٰ مسکرائی اگرچہ اس کے دل میں بیک وقت ہزاروں نشتر ٹوٹ گئے تھے۔
"بشریٰ کیا ہمارا الگ ہو جانا اتنا آسان ہے؟" راحیل نے بشریٰ کے پرسکون چہرے کی طرف دیکھا۔
"دیکھو راحیل کیا آسان ہے اور کیا مشکل یہ مجھے پتہ نہیں۔ مجھے تو بچپن سے ہر لمحے یہی بتایا گیا کہ راحیل تمہارا مستقبل ہے۔ تم اس کے سامنے مت بولو۔ اس کی کسی بات کو مت کاٹو۔ اس کی رضا میں راضی رہو۔۔۔۔۔"
"اور تم ہر حال میں میری رضا کی خواہاں ہو۔۔۔۔۔"
"ہاں بھئی زبردستی کا سودا کون کر سکتا ہے"۔
"اچھا تو پھر تم تو بشریٰ نہیں ہو، نیک پروین ہو۔۔۔۔۔" راحیل کھلکھلا کے ہنسنے لگا۔۔۔۔۔ جیسے ابھی ابھی اس نے کوئی دل توڑنے والی بات نہیں کہی تھی، اس پر اچانک پریشانی نہیں چھائی تھی اور بشریٰ کی جدائی کا خوف اس کے دل کو اپنی مٹھی میں لے کر دبا نہیں رہا تھا۔۔۔۔۔ بشریٰ نے اس کی ہر لمحے بدلتی ہوئی کیفیت سے پریشان ہو کر اسے دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔
"سر جی۔۔۔۔۔ آٹھ نمبر کمرے میں مسز جمیل کی طبیعت خاصی خراب ہے۔ آپ۔ یا۔ ڈاکٹر صاحب آپ"۔ نرس نے باری باری دونوں کو دیکھا۔
"ہاں دیکھو میں چلتی ہوں۔ اور تم راحیل۔ بیگم عباس احمد کو دیکھ لو۔ انہیں بیٹا چاہیئے۔ اور وہ تو میری صورت دیکھتے ہی بدک جاتی ہیں کہ ان کی پیٹ کی اولاد کہیں عورت کا سایہ پڑنے سے عورت نہ بن جائے۔ وہ ضد کر کے ہمارے اس ہسپتال آئی ہیں کہ یہاں ایک مرد گائینکالوجسٹ بھی ہے اور وہی انہیں دیکھے گا"۔
"سونوگرافی کرائی ہے؟"
"نہیں۔ انہیں وہم ہے کہ کہیں اس عمل سے ان کے پیٹ کے بچے پر برا اثر نہ پڑے"۔
"سب بکواس ہے۔ میاں بیوی دونوں کس قسم کے سیٹھ ہیں۔ بالکل بھوسا بھری بوریوں کی طرح۔۔۔۔۔" راحیل نے اوورآل پہنتے ہوئے اُسے دیکھا پھر پوچھا "ابھی ان کی کتنی بچیاں ہیں؟"
"بچیاں کہاں سے آئیں۔ یہ تو ان کا پہلا بچہ ہے۔ تمہاری رشتہ دار لگتی ہیں۔ وہ پیٹ بسے بچے کو بیٹا دیکھنا چاہتی ہیں اور تم ان بچوں سے خوفزدہ ہو جو ابھی میری کوکھ میں بھی نہیں آئے"۔
"اوہ۔۔۔۔۔ کہاں کا ڈانڈا کہاں جا کر ملایا تم نے"۔ راحیل نے نرس پر نظر ڈالی، جو لپکتی چلی آ رہی تھی۔۔۔۔۔ "خیریت ہے نرس؟"
"سر۔ مسز جمیل کی حالت۔۔۔۔۔"
"ہاں ٹھیک ہے چلو۔ تم انہیں فوراً لیبر روم میں پہنچاؤ میں ابھی آتی ہوں۔۔۔۔۔" بشریٰ نے نرس کو حکم دیا اور مسکرا کے راحیل کو دیکھا۔ "تو یہ حالات ہیں ڈاکٹر راحیل کہ اکیسویں صدی کے دروازے پر کھڑے ہیں اور توہمات سے فرصت نہیں ملتی"۔
"ہاں شاید تم اسے وہم کہہ سکتی ہو۔ مگر عورتیں تو عموماً ایسی ہی باتوں پر یقین رکھتی ہیں۔ تم اپنے آپ کو دیکھ لو۔ تمہارا نام بشریٰ بھی اسی وہم کا نتیجہ ہے"۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ آپا، باجی اور چھوٹی آپا کے بعد جب میں بھی آ گئی تو اماں نے بڑی اماں کے مشورے پر میرا نام بشریٰ رکھ دیا۔"

"اور آپ دیکھ لیں بشارت حسین آ گئے ۔"

"خیر راحیل یہ کہنے کی بات ہے بشارت کو آنا ہی تھا۔ بس یہ ماما اور بڑی اماں کے ایمان کی کمزوری تھی۔ اور پھر بشارت نہ بھی آتے تو کیا آفت آ جاتی۔ ان سے تو بہتر تھا کہ ہم جیسی کوئی اور بہن ہی آ جاتی ۔"

"اُف وہ بھئی۔ یہ کیا بات ہوئی بشریٰ۔ بشارت کا اس میں کیا قصور —— دیکھو جانم بشارت تو معصوم ہے۔"

"ہاں پتہ ہے ایسے لوگوں کو "اللہ لوک" کہتے ہیں۔ ہم نے کب ایسا بھائی چاہا تھا —— "، بشریٰ نے آزردگی سے کہا۔ اس کا اکلوتا بھائی جو کہنے کو ان تھا اس سے صرف دو سال چھوٹا لیکن عضو معطل تھا۔

"بشریٰ، اس میں بشارت بے چارہ کہاں گنہگار ہے۔ تم دیکھو یہ خاندان میں شادی کا نتیجہ ہے۔ تم سے زیادہ یہ بات کون سمجھ سکتا ہے۔ تم ایک سمجھ دار ڈاکٹر ہو" —— راحیل نے بشریٰ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں، تمہاری بات ٹھیک ہے۔ مگر راحیل۔ بشارت ہماری قسمت کیوں بنے؟ بڑی اماں اور تایا جان بھی خالہ زاد ہیں۔ مگر تم سارے بھائی تو ——"

"دیکھو بشریٰ۔ یہ بڑا UN FAIR ہے بھئی اب تمہیں ہماری مصیبت پڑ گئی۔ یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے۔ کیا ہم سارے بھائی تمہیں اچھے نہیں لگتے؟ کیا خاندان میں مزید بشارت جیسے تمہیں اچھے لگیں گے؟"

"ارے نہیں اللہ نہ کرے" بشریٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بشریٰ تم رو رہی ہو —— بشارت آج تو پیدا نہیں ہوا۔"

"ہاں آج نہیں پیدا ہوا لیکن اس کی وجہ سے ہمارا مسئلہ تو آج پیدا ہوا۔"

"مسئلہ۔ تم کیسی ڈاکٹر ہو؟ ممکن ہے چچی کی ننھیال میں کوئی ایسا کیس ہوا ہو ——"

"ہاں ممکن ہے۔ اور مجھے سب پتہ ہے۔ میں صرف ڈاکٹر ہی نہیں ہوں بلکہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ میں جو تمہاری بنت عم ہوں، تمہاری منکوحہ ہوں، تم سے بہتر ڈاکٹر ہوں اور پھر ——"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ اماں کہتی ہیں کہ وہ بشارت کی پیدائش سے بہت خوفزدہ ہو گئی تھیں ——"

"واقعتاً ڈرنے کی تو بات تھی۔"

"تم نے بشارت کے ہاتھ پاؤں دیکھے ہیں؟"

"ہاں روز ہی دیکھتا ہوں یہ کیا بات ہوئی۔ ایسے کیس میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"ہوں۔ اور پھر اس کا چہرہ، اٹھارہ برس کا ہے، زبان اس کی نہیں۔ آواز جانور سے بدتر جیسے گائے ڈکرا رہی ہو۔ اور ——"

"اور کچھ بھی نہیں بھئی چچا چچی خاندان کی سب سے خوبصورت جوڑی تھے۔ بیٹیاں بھی چندے آفتاب چندے ماہتاب ساری ہی بڑے آرام سے اپنے گھروں کی ہو گئیں —— یہاں تک کہ دادی نے تمہیں بھی باندھ دیا ——"، راحیل نے ہنستے ہنستے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیا —— "اداس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آؤ چلتے ہیں۔ تمہاری مسز جمیل اور ہماری

مسز علی عباس احمد علی دونوں ہی ہماری منتظر ہوں گی۔

"ہوں" بشریٰ نے راحیل کے ہاتھوں کو الگ کرتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔

نرس گھبرائی گھبرائی سی کھڑی تھی ——— ڈاکٹر کو اپنی بیوی میں محو دیکھ کر اس کے قدم دروازے میں رک گئے ——— اس کے چہرے پر ناگواری چھا رہی تھی ——— وہاں مسز جمیل موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور یہ ——— یہ کیسے ڈاکٹر ہیں۔ بھلا ——— کمال ہے ——— !

بشریٰ نے آہستہ سے اپنی آنکھوں کی نمی پونچھی ——— اپنے چہرے کے تناؤ کو درست کرتی ہوئی وہ مسز جمیل کو اٹینڈ کرنے چل پڑی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو مسز جمیل کا بیٹا دنیا میں آ چکا تھا۔ ڈیوٹی نرس اسے ہاتھوں میں سنبھال رہی تھی۔ نرس کا چہرہ خوشی سے پھول کی طرح کھلا جا رہا تھا۔

بشریٰ نے مریضہ کی طرف توجہ دی جس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور آنکھیں بند تھیں ماس نے گھبرا کے اس کی نبض دیکھی تو مسز جمیل نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

"مبارک ہو مسز جمیل۔ اللہ نے آپ کو بیٹے سے نوازا ہے!"

"بیٹا، بیٹی کیوں نہیں؟"

"کیوں کیا بات ہے؟ لوگ تو بیٹے کی تمنا کرتے ہیں۔"

"کرتے ہیں۔ لیکن مجھے تو بیٹی ہی چاہیئے تھی۔" مسز جمیل رونے لگیں۔

"ارے بھائی یہ کیسی ماں ہے کہ بیٹے کی پیدائش پر رو رہی ہے ——— دیکھو تو کیسا پیارا، پیارا خوبصورت تندرست بچہ ہے۔" بشریٰ نے بچے کی طرف اشارہ کیا جس کی نال کاٹی جا چکی تھی۔ اور اب نرس اسے دوسرے کمرے میں لے جا رہی تھی۔

"آپ نہیں سمجھ سکتیں کہ بیٹی کیوں۔" مسز جمیل بولیں۔ "یہ میرا پانچواں بیٹا ہے اور میرے میاں کو بیٹی چاہیئے تھی۔ ایسی ہی خوبصورت، ایسی ہی توانا، مگر بیٹا نہیں ——— اور میری ساس نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر اب کے میرے گھر بیٹی نہیں آئی تو وہ مجھے گھر سے بے گھر بھی کر سکتی ہیں۔"

"ارے نہیں بھئی سب کہنے کی باتیں ہیں۔ وہ بہت خوش ہوں گی پوتے کو دیکھ کر۔ ابھی ہمارے ہاں اتنے دل گردے والے لوگ کہاں ہیں جو بیٹیوں کو دیکھ کر کھل اٹھیں ——— اور آپ کے میاں خدا کا شکر کریں گے کہ اللہ نے انھیں اولاد سے نوازا ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب، میرا میاں بالکل گنوار کا لٹھ ہے۔ اس کی ماں جو کچھ کہے گی وہ کر سکتا ہے۔ اس پر اپنی ماں کا بڑا اثر ہے۔"

"مگر آپ تو خاصی پڑھی لکھی لگتی ہیں ———"

"ہاں جی، میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی ہے۔ تاریخ میرا مضمون تھا ——— اور وہ لندن پلٹ ہے مگر ہے گنوار ہی ———"

"پھر بھلا یہ انمل بے جوڑ ———"

"کچھ بھی نہیں جی ہم اپنی جائداد میں کسی کو حصہ دار نہیں کرتے اور اس طرح یہ ہمارے حصے میں آ گیا۔"

"اچھا تو آپ کا کزن ہے۔ جائداد کا چکر تو ـــــ"

"نہیں جی ہم بالکل غیر ہیں اور ہماری جائداد ہماری محبت ہے۔ اور اس میں کسی کی حصہ داری نہیں ہو سکتی اور اب میری ساس کہتی ہے کہ اگر میرے گھر بیٹی نہیں ہوئی تو وہ اپنے بیٹے کی ـــــ"۔ مسز جمیل نے زار و قطار رونا شروع کیا۔ "یہ بیٹا کہیں میرے لئے مصیبت ہی نہ بن جائے۔ اس کا باپ تو میری جان ہے۔ جب میرے قریب ہوتا ہے تو اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے ہوتا ہے۔ پیار بھی بہت کرتا ہے۔ میرا دم روم اسے پکارتا ہے۔ مگر یہ بیٹے ـــــ"۔ مسز جمیل بات کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔

"ایسے نہیں روتے ہیں مسز جمیل۔ خدا کے لئے چپ ہو جایئے۔ کیا آپ کو بیٹے اتنے برے لگتے ہیں۔"

"نہیں جی، بالکل نہیں۔ اپنی اولاد کسے بری لگتی ہے۔ جمیل کو بھی کوئی پرخاش نہیں ہے۔ لیکن میری ساس ـــــ وہ تو ـــــ وہ تو ـــــ"۔ مسز جمیل نے پھر سے رونا شروع کر دیا۔

"پلیز آپ اس طرح تو نہ روئیں۔ دیکھیں اس طرح آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بلیڈنگ بڑھ جائے گی، پھر ہم کیا کریں گے ـــــ"۔ بشریٰ پریشان ہو کر اس کے آنسو پونچھنے لگی ـــــ "چلیں بس اب خوش ہو جائیں آپ کے میاں بھی آنے ہی والے ہوں گے ـــــ"۔

"ہاں مگر وہ ـــــ"، وہ اچانک چپ ہو گئی جیسے اس کی زبان پر ٹھہر لگ گئی ہو۔

"بات کیا ہے بیوی ـــــ" بشریٰ نے دروازے کی طرف دیکھا جہاں مسز جمیل کی نگاہیں ٹنگ کے رہ گئی تھیں اور ان میں سے خوف جھانک رہا تھا ـــــ "بات یہ ہے جی کہ ہمیں تو بیٹی ہی چاہیئے تھی لیکن اس نامراد کی کوکھ ہماری روایت کے خلاف جا رہی ہے۔ پہلے ہی کون سی کمی تھی کہ اب یہ بھی ـــــ"، بڑھیا نے اپنا سر پیٹ لیا۔ بشریٰ حیرت سے سجی سنوری بڑی بی کو دیکھ رہی تھی۔ "ٹھیک کہتی ہے مسز جمیل ـــــ خاندان ہی گنواروں کا ہے۔"

"کیوں بیٹا جمیل تجھے اپنا بیٹا پسند ہے۔" بڑی بی نے اپنے کبھرو جوان بیٹے کو دیکھا۔

وہ مسکرایا پسندیدگی اس کی نگاہوں میں موجود تھی۔ ایک قدم آگے بڑھا۔ آہستہ سے بیوی کے بازو میں پڑی ننھی سی جان کو جھک کر دیکھا۔ نرمی سے اس کے گال میں انگلیاں چبھوئیں۔ اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "اپنی اولاد کسے پسند نہیں ہوتی اماں اور یہ میری پاکیزہ اولاد ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔"

"ہائے ہمارا گھرانا تو ـــــ"

"اماں تم اپنا گھرانا اپنی نواسیوں سے آباد کرو۔ اس میں اللہ کی بڑی مصلحت ہے۔ اس نے ہمیں ان کوٹھوں اور گھرانوں کے دلدل سے نکال دیا ـــــ"۔

"کیا ـــــ؟ کیا ـــــ؟"

"کچھ نہیں اماں، ہم اب تمہارے ساتھ نہیں رہیں گے ـــــ"۔

"مت رہو۔ تم پر دنیا تھوکے گی۔ شریف بننے چلے ہو ـــــ"۔

"ہاں بالکل ہم تو شریف ہیں ہی اماں۔ شریف کی اولاد ہیں ـــــ آخر دیکھیں نا آپ کہ ہمارے ابا نے ہمیں اپنا وارث

ردیا ہے۔ہیں تنہا نہیں چھوڑا۔ یہ ان کی شرافت نہیں تو اور کیا ہے ـــــ انھوں نے مجھے انسان بنایا ـــــ"

"کیوں نہ بناتا۔میں کسی یار سے لے کر تو نہیں آئی تھی ـــــ ارے تو، تو تھا ہی اس کا بیٹا ـــــ"

"تھا نہیں اماں ہوں۔ اور اب ہماری بیوی آپ کی تحویل میں نہیں جائے گی۔بس یہاں سے ہمارے راستے الگ ـــــ آپ ہماری اماں ہیں مگر ـــــ اب ـــــ"

"یہ یہ پانچ کیڑے جنم دینے والی سب کچھ ہو گئی اور میں جو تیری ماں ہوں، کچھ بھی نہیں۔ اسے ہماری بھی کوئی عزت ہے!"

"اماں تم سب کچھ ہو لیکن عزت دار نہیں ہو۔ہاں ایک عزت دار نے تمہیں عزت ضرور دی جو تمہیں راس نہیں آئی۔ مجھے خود کو تمہارا بیٹا کہلوانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔میں اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں ـــــ اس کا وارث ـــــ"

"ارے جمیل ـــــ اسے تجھے کیا ہوا ہے۔ تو، تو دربدری میں مبتلا ہو جائے گا۔تیرے ہوتے سوتے تجھے بے عزت سمجھیں گے۔"

"مگر اماں میرے ہوتے ہوئے دربدری کیوں ہوگی۔ بے شک میں اپنے ہوتے سوتوں کی نظر میں کھٹکتا ہوں ـــــ لیکن ـــــ لیکن یہ کچھ دنوں کی بات ہے۔ پھر یہ میرے پانچ بیٹے پانڈو بن کر دنیا کے کوروؤں سے ٹکرلیں گے اور فتح ہماری ہوگی۔"

بشریٰ حیرت زدہ سی کبھی جمیل کو اور کبھی اس کی ماں کو دیکھ رہی تھی۔"تو بیٹی دکان سجانے کو چاہیے تھی!!" آہستہ سے کمرے سے نکل گئی۔سامنے سے راحیل چلا آرہا تھا۔ منہ لٹکائے، اداس اداس سا۔

"کیوں ڈاکٹر صاحب منہ پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" وہ ایک دم اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"کچھ بھی نہیں بشریٰ۔مسز علی عباس احمد علی کے ہاں بیٹی ہوئی ہے۔ خوبصورت، تندرست و توانا۔ اور مسز علی کے آنسو تھم رہے ہیں ـــــ بے چارہ علی عباس بھی اپنی بیوی کی وجہ سے سخت پریشان ہے ـــــ"

"اور یہاں مسز جمیل کا معاملہ بالکل اس کے برعکس تھا۔ وہاں پانچواں بیٹا ہوا ہے اور مسز جمیل نے رو رو کے برا حال کیا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ مسٹر جمیل نے اپنے تمام گنوارپنے کے باوجود بڑا مثبت قدم اٹھایا۔"

"کیا؟ ـــــ جمیل کیا؟ ـــــ ارے نہیں بھئی جمیل بہت پڑھا لکھا ہے۔ لندن پلٹ ہے۔ بس اسے اپنا آپ اچھا نہیں لگتا نا"

"آپ کیسے جانتے ہیں؟"

"اسکول سے لے کر گورنمنٹ کالج تک یہ میرا ہم جماعت تھا"

"مگر اس کی مسز تو اسے گنوار، اکھڑ وغیرہ وغیرہ کہہ رہی تھی۔ اور بیٹی نہ ہونے کا غم اسے مارے ڈال رہا تھا ـــــ"

"اچھا!"

"ہاں وہ کہتی تھی کہ اس کی ساس نے اسے طلاق کی دھمکی دے رکھی ہے۔ اور اب وہ کہیں کی نہیں رہے گی۔"

"ہاں وہ ایسا کہہ سکتی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جمیل ایسی کوئی بات نہیں کرے گا کیونکہ اسے اپنے گزرے ہوئے سے بڑی نفرت ہے اور اس کی ـــــ بھئی وہ تو عالم باپ کی بیٹی ہے۔ بڑے خاندانی تھے، علم کے شیدائی۔ کھلے دل و دماغ کے مالک تھے بیٹی کا رجحان دیکھ کر انھوں نے آنکھ بند کر کے اسے بیاہ دیا تھا۔"

"انھیں جمیل کی اصلیت کا پتہ نہیں ہوگا؟"

"نہیں جمیل نے اپنی اصلیت نہیں چھپائی تھی۔ حالانکہ چاہتا تو سب کچھ چھپا لیتا کیونکہ مولوی صبغت اللہ کے گھر خود

اس کے والد رشتے کر گئے تھے جو علاقے کے بڑے زمیندار ہیں اور باعزت لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مگر مولوی صاحب کی بھی بڑی عزت ہے۔ صاحب علم، صاحب جائداد۔ بڑے جید عالم ہیں وہ —— جمیل اور اُس کے والد نے اس کی ماں کی حقیقت بتادی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ اپنی ماں ہی کے پاس رہتا ہے جبکہ ان کی جائداد کا تنہا وارث بھی یہی ہے —— اب آپ سوچ لیں —— مولوی صاحب کا چہرہ پتھر تھا۔ کچھ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں ——"

"تم یہ سب کچھ اتنی تفصیل سے کیسے جانتے ہو؟" بشریٰ قدم سے قدم ملائے اپنے کمرے کی طرف جارہی تھی جو راحیل کا کمرہ بھی تھا۔

"مجھے یہ سب کچھ ایسے پتہ ہے بیگم صاحب کہ میں وہاں شریک تھا۔ اور آپ کو شاید معلوم نہیں کہ مولوی صبغت اللہ میرے نانا تھے —— میں نے ہی نانا کو جمیل کا پیغام دیا تھا اور اس کی بیوی میری سب سے چھوٹی خالہ ہیں۔ میری ہم عمر اور میری دوست بھی ——"

"پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا جمیل کے بارے میں اور اس کی ماں —— میں بھی تو تمہاری دوست، تمہاری بنت عم، تمہاری ——"

"خیر یہ سب کچھ تو تم ہو۔ مگر میں کیسے بتا سکتا بھئی۔ جمیل ہوسٹل میں رہتا تھا نوابوں کی طرح، اس کے والد آتے رہتے تھے۔ چھٹیوں میں وہ ہمیشہ (بقول خود) گاؤں جاتا تھا —— خالہ نے ایم اے جمیل کے ساتھ کیا تھا۔ اور وہیں سے ان کی دوستی بھی ہیں تو کے۔ اسی میں مر رہا تھا تمہارے ساتھ ——"

"اور تم ان کے BESTMAN بن گئے۔"

"ہاں پیامبر تو میں ہی بنا۔ اور جب انھوں نے اپنے بارے میں بتایا تو مجھے اس دن وہ دونوں باپ بیٹے بہت ہی اچھے لگے۔ کھرے اور سچے۔"

"اور تمہارے نانا کو کوئی اعتراض نہیں ہوا ——؟"

"نہیں۔ نانا نے صرف یہ پوچھا تھا کہ انھوں نے جمیل کی ماں سے نکاح کیا تھا؟ اور اس وقت تو بشریٰ مجھے پتہ بھی نہ تھا کہ ڈیرے دار کیا ہوتی ہیں۔ وہ فنکار تھیں۔ ایک اچھی گانے والی۔ اور گانے کی حد تک یہ ان کا پیشہ تھا اور اس طرح وہ کسبی تھیں یعنی محنت کرنے والی۔ میرے نانا نے ان کی ساری باتیں سنیں۔ ٹھنڈی سانس بھری اور پھر صرف یہ کیا کہ اسی وقت بیٹی کو یعنی آج کی مسز جمیل کو بلا کر میری اور اس کے باپ کی گواہی میں ان کا نکاح کر دیا۔ اور بڑے اطمینان سے جمیل کے ساتھ رخصت کر دیا۔ چلتے چلتے یہ ضرور کہہ دیا کہ "بیٹی وہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ اور مرضی کی شادی بھی بُری بات نہیں۔ بڑا ذاتی طور پر اس شادی کے خلاف نہیں ہیں بلکہ انھوں نے عملاً ساتھ دیا ہے لیکن ہر عمل کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ اب اس گھر سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ کیونکہ انھیں ہماری نانی سے کسی قسم کی رواداری کی کوئی امید نہیں ہے —— اور اس طرح ہماری خالہ گلبرگ کے ایک کوٹھے پر پہنچ گئیں۔"

"مگر شریفوں کا کیا تعلق کوٹھے سے؟" بشریٰ نے حیرت سے راحیل کو دیکھا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ ہمارے گھر بھی تو کوٹھے ہیں ہمارے پنجاب میں تو کبھی کچا کوٹھا اور کبھی پکا کوٹھا۔ تو اس سے بدکنا کیسا۔ جمیل کے والد تو بہت ہی خاندانی آدمی ہیں۔ بس ذرا اس کی والدہ میں قناعت نہیں تھی۔ انھیں اپنی فنکاری پر

بڑا ناز تھا یں کل کھڑی ہوئیں۔"

"ہماری ننا کہتی تھیں، چیچک اور طوائف نکلے بغیر نہیں رہتیں۔"

"بشریٰ ـــــ!" راحیل اتنے زور سے چیخا کہ غلام گردش میں جاتی ہوئی نرس کے ہاتھ سے دوا کی ٹرے چھوٹ گئی۔ وہ پریشان ہو کر ان کی طرف بڑھی۔

"کیا ہوا سر ـــــ؟" نرس نے نرم اطوار شیریں گفتار ڈاکٹر کو بپھرتے دیکھ کر سوال کر ڈالا۔

"کچھ نہیں آپ اپنا کام کریں اور دیکھیں یہ سب کچھ یہاں سے صاف کروائیے۔ نرس کا دل مضبوط ہونا چاہیے کہ ہسپتال میں اس سے بھی بھیانک چیخ سنائی دیتی ہے۔ سمجھ میں آیا آپ کے۔" راحیل نے آہستہ آہستہ لیکن سخت لہجے میں کہا اور بشریٰ کا بازو پکڑ کے کمرے میں چلا گیا۔ "بات یہ بشریٰ کہ تم ـــــ تم انتہائی کمینی ہو ـــــ پھر یہ کہ گانے والے فنکار ہوتے ہیں قطعی بازاری نہیں ہوتے۔"

"پھر مسز جبیں کی ماں کس روایت، کس کوٹھے کی بات کر رہی تھی؟"

"یہ تمہاری سمجھ سے باہر ہے۔ ان کے اور تمہارے معاشرے میں فرق ہے۔"

"مگر ہمارا تمہارا معاشرہ تو ایک ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تمہاری خالہ ایک گانے والی کی بہو ہے۔"

"ہاں بالکل۔ گانا، عبادت ہے، زندگی ہے، روح کی غذا ہے بس نقطۂ نظر کی بات ہے۔"

"ہاں جیسے چاہو معنی پہنا دو مگر ہمارے ہاں تو گانا اور گانے والے سب ہی کوٹھے سے روایت ہیں۔"

"تم کس صدی کی بات کر رہی ہو؟" راحیل نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"اسی صدی کی بات ہے راحیل، تمہاری خالہ کو تمہارے نانا نے کینسر کی طرح اپنے خاندان سے کاٹ کر الگ کر دیا کہ وہ اپنے گھر کو باعزت ـــــ"

"کیا ہے ـــــ کیا ہے ـــــ ارے میرے نانا جیسے وسیع القلب لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ راضی برضا رہنے والے۔ مجھی کو دیکھ لو بیگم صاحب کہ میں تمہیں صرف آنے والے دنوں کے خوف سے ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں ـــــ" راحیل کے لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ بشریٰ تلملانے لگی۔

"اور ہمیں کونسا ارمان ہے تمہاری قربت کا۔ تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔ مجھے ویسے بھی ـــــ خوف کے سائے تلے زندہ رہنے سے کوئی دلچسپی نہیں ـــــ" بشریٰ کی آواز میں غم اور غصہ تھا۔

"خوب ہے میڈیکل سائنس بھی۔ عورت "کیریئر" ہوتی ہے ـــــ پھر بھلا وہ خود ہی کیوں نہ انکار ـــــ"

"ہاں، اچھا، پھر تم جب کہو فارغ خطی لکھ دوں گا۔ مہر بھی دے دوں گا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ میں اپنی اور تمہاری تمام خوبصورتی کے باوجود بشارت جیسی بدصورتی نہیں پیدا کر سکتا۔"

بُت کدہ

ظہیر بابر

عجیب بستی تھی، چاروں طرف سے صحرا میں گھری ہوئی، قریبی قصبے سے بھی کوسوں دُور، شہری زندگی سے سینکڑوں سال پچھڑی ہوئی اور اپنے آپ میں بھی گمشدہ!

یہ بستی ایک مضبوط ٹیلے پر آباد تھی جس کا رقبہ دو ڈھائی مربع میل سے زیادہ نہیں تھا۔ یہ ٹیلا اپنے باشندوں کے لئے خوراک بھی فراہم کرتا تھا، ان کے مال مویشی کے لئے چارہ بھی اور ان کے گھر کی تعمیر کے لئے مٹی اور لکڑی بھی۔ اس میں تین کنوئیں بھی کھدے ہوئے تھے۔ ان کا میٹھا پانی بستی والوں کے لئے بڑی نعمت تھا۔ وہ اس سے پیاس بجھاتے تھے، نہاتے دھوتے تھے اور سبزیوں کی کیاریاں تر رکھتے تھے۔ ٹیلا کیا تھا، الٰہ دین کا چراغ تھا مگر کوئی دیو اس کا غلام نہیں تھا۔ بستی کے لوگ جو کچھ حاصل کرتے تھے اپنی محنت سے حاصل کرتے تھے۔ ان کی ضرورتیں اور خواہشیں بہت کم تھیں اور وقت وافر تھا اس لئے کام کرنے سے کسی کو انکار نہ تھا۔ بوڑھے اور بیمار ان پر بوجھ نہیں تھے۔ سب مل جل کر رہتے تھے اور مل جل کر خوشی اور غم مناتے تھے۔

ان لوگوں نے اپنے ماضی کے بارے میں لمبی چوڑی داستانیں گھڑ رکھی تھیں، جن کا لُب لباب یہ تھا کہ ان کے قبیلے کے بارہ خاندان بارہ مملکتوں پر حکومت کرتے تھے۔ ان سب کے راج میں امن چین تھا اور رعایا خوش اور خوشحال تھی۔ انسانوں کا یہ سکون جنات کے بادشاہ کو پریشان رکھتا تھا۔ اسے آدم زادوں میں لڑائی اور فساد ہی خوش آتا تھا۔ ایک دن اسے ایک چال سوجھی۔ وہ سب سے کم عمر بادشاہ کو بہلا پھسلا کر ملکِ پرستان لے گیا تھا۔ وہاں ایک پری اس پر یا وہ ایک پری پر عاشق ہو گیا تھا۔ دونوں نے شادی کر لی تھی۔ وہ اپنی راجدھانی میں واپس آیا تھا تو اس کے گیارہ کے گیارہ بھائی ایسی خوبصورت، خوش اندام اور خوش قدم بھابھی کو دیکھ کر اپنے ہوش کھو بیٹھے تھے۔ وہ بھی سب کے سب ملکِ پرستان پہنچے تھے اور ایک ایک پری پر عاشق ہو کر اُسے بیاہ لائے تھے۔ کچھ مدت بعد ایک بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ سارے شہزادے پری زادیوں سے شادی کرنا چاہتے تھے جبکہ پری زاد شہزادے ان پر اپنا حق فائق سمجھتے تھے۔ اس کشمکش کے باعث پہلے دلوں میں گرہیں پڑی تھیں پھر میدانِ جنگ میں تلواریں چلی تھیں اور یوں خاندانوں کی جنگ کا آغاز ہوا تھا۔ برسوں تک کشتوں کے پشتے لگتے رہے تھے۔ جب سارے خاندان لڑتے لڑتے بیدم ہو گئے تھے اور جنگ نے لشکریوں کا احساس اور ضمیر بھی تلف کر دیا تھا اور وہ اپنوں کو ہی مارنے اور لوٹنے لگے تھے تو وحشیوں کا ایک لشکر کہیں سے نمودار ہوا تھا اس کے سپاہی چیونٹیوں کی طرح ہر طرف پھیل گئے تھے۔ انہوں نے قتل و غارت کا ایسا بازار گرم کیا تھا کہ لوگوں کے لئے جان بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ جس کا جدھر منہ آیا تھا پوٹلے اٹھائے ہوئے اور ڈھور ڈنگر ہانکتے ہوئے اُدھر کو چل دیا تھا۔ بستی والوں کے بزرگوں نے اس ٹیلے کی جانب رُخ کیا تھا اور یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ان دنوں ریگستان اتنا وسیع نہیں تھا۔ جنوب کی جانب ٹیلے سے دو کوس دور آبادی اور سبزہ زار تھا۔ وہاں ایک دریا بھی بہتا تھا۔ لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر اسے پار کیا کرتے تھے پھر ایک اور آفت لوٹی تھی جنوب

میں بھی صحرا پھیلنے لگا تھا۔ بھکڑ روز ہی چلنے لگے تھے اور بادل ادھر کا راستہ ہی بھول گئے تھے۔ ایک روز سیاہ رنگ کی آندھی اٹھی تھی اور کئی دنوں تک شوکتی، کراہتی اور چلاتی رہتی تھی۔ جب اسے قرار آیا تھا اور سورج کا پنجہ زمین پر پھیلا تھا تو گاؤں کے لوگ بے نشاں ہو چکے تھے۔ ان گنت لوگ اور مویشی صحرا میں دفن ہو گئے تھے اور دریا کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ اس عظیم سانحے میں صرف وہی لوگ بچے تھے جو ٹیلے پر پناہ گزیں تھے، وہی عہدِ رفتہ کے شاہی قبیلے کی نشانی تھے۔

آج کل "پدرم سلطان بود"، کا نعرہ مار کر بھڑ بھونجے بھی خوش ہو لیتے ہیں۔ پھر ٹیلے والوں کے شاہی خون پر اعتراض کیوں؟ وہ تو شکل سے بھی اصیل لگتے تھے۔ دکھ یہ تھا کہ ان کی آبادی بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی تھی۔ ان کے ہاں بچے تو پیدا ہوتے تھے کہ ساجن سجنی بنے بغیر ان کا بھی گزارہ نہیں ہوتا تھا مگر بہت سے بچے نظر ٹھہرنے سے پہلے ہی چل بستے تھے۔ بہت سے لڑکے جوانی چڑھنے سے پہلے اللہ کو پیارے ہو جاتے تھے۔ کئی عورتیں وضع حمل کا عمل برداشت نہیں کر پاتی تھیں اور پکی عمر کے اکثر لوگوں کو پہلی سخت بیماری موت کے کنوئیں میں کھینچ لے جاتی تھی۔ علاج معالجے کے لئے بستی میں ایک سیانا گھرانا بھی موجود تھا پر اس کی جڑی بوٹیوں کا اثر دو چار چھوٹی موٹی بیماریوں تک محدود تھا۔ یوں بھی بستی کے لوگوں کا علم فرسودہ اور بے کار تھا۔ وہ ان تمام توہمات، شکوک اور دہشتوں کا شکار تھے جو لاعلمی اور تنہائی کی کوکھ میں پلے ہیں اور بعض اوقات "جینز"، پر نقش ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسی اوٹ پٹانگ باتوں پر یقین رکھتے تھے جنہیں جہالت کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ٹیلے کے پچھم کی جانب صحرا کی سرحد سے جہنم کا علاقہ شروع ہوتا ہے، پورب کی طرف چڑیلیں رہتی ہیں وہ مسافر کو غلط راستے پر ڈال کر اس کے مرنے کا تماشہ دیکھتی ہیں، اتر میں دیو آباد ہیں جو دریا کا سارا پانی پی جاتے ہیں، صرف دکھن کی طرف ایک قصبہ ہے جہاں کچھ آدمی بستے ہیں۔ اس قصبے تک پہنچنے کے لئے پانچ رات سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس کا راستہ بستی کے سوداگر گھرانے کے سربراہ کو معلوم تھا۔ اس کا ذہنی نقشہ اسی کنبے میں گھومتا رہتا تھا۔ وہ اسے کسی صدری نسخے کی طرح چھپا کر نہیں رکھتے تھے۔ اس کے مطابق سفر کرنا جان جوکھم کا کام تھا۔ کئی سوداگر اسی راستے میں کہیں کھو گئے تھے۔ کئی دنوں کے بعد ان کا ایک آدھ اونٹ ہی واپس آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سربراہ سوداگراں، ان کے بھائیوں اور بیٹوں کے سوا کوئی مائی کا لال بستی کی مٹی چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ بعد میں یہ بہانہ بھی بن گیا تھا کہ قصبے والوں کی زبان صرف سوداگر ہی سمجھتے ہیں اور وہی ان سے لین دین کر سکتے ہیں۔

بستی کی زندگی میں سوداگر گھرانے کو محور کی حیثیت حاصل تھی۔ بستی کی ساری پیداوار اُس کے بھنڈار میں جمع ہوتی تھی۔ وہیں سے سب کو کھانے کے لئے اناج وغیرہ مل جاتا تھا۔ پانچ پورن ماشیاں گزرنے کے بعد سوداگر اپنے اونٹوں پر فاضل اناج، اون، کھالیں، جنگلی پھل، خشک سبزیاں اور دوسری اشیا لاد کر قصبے کو جاتا تھا اور ان کے عوض میں نمک، شکر، تیل، کھدر، برتن اور ضرورت کی دوسری چیزیں لے کر آتا تھا۔ ان اشیا کا حساب پہلے سے تیار ہوتا تھا۔ اس کے مطابق وہ بھی بستی والوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ نگرانی کرنے کے لئے ایک پنچائت ضرور موجود تھی مگر اس کے ارکان کو کسی کی شکائت نمٹانے کی زحمت کبھی کبھار ہی اٹھانا پڑتی تھی۔ ان لوگوں نے اپنی تاریخ سے یہ سبق سیکھا تھا کہ حسد اور حرص سے دور بھاگو، غصہ پیو، نفرت سے نفرت کرو اور زندگی میں تھوڑی سی کمی بیشی خوشدلی سے قبول کر لو۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اس ٹیلے پر کسی سردار یا سرکار کا سایہ نہیں پڑا تھا۔ فساد کی جڑ ناپید تھی تو پھر لڑائی کہاں سے پھوٹتا۔ یہ انتظام ہزار سال سے چل رہا تھا اور ہزار سال اور چل سکتا تھا مگر بستی پر ایک اور افتاد آ پڑی تھی۔ اس کے ٹکڑے بکھر ہونے لگے تھے۔

اس مصیبت کا پہلا نشانہ ایک بزرگ بنا تھا۔ اس کے مرنے کا وقت آیا تھا تو اس کی بیوی اس کے پاؤں داب رہی تھی۔ اس کا بیٹا

اس کی ٹانگوں میں مالش کر رہا تھا اور اس کی بہو اس کا ماتھا مل رہی تھی۔ بیوی کو اچانک احساس ہوا تھا کہ اس کے شوہر کے پاؤں سخت ہو گئے ہیں۔ اس نے گھبرا کر چادر ہٹائی تھی تو وہ پتھر ہو چکے تھے۔ عین اسی وقت بیٹے نے محسوس کیا تھا کہ اس کے باپ کی پنڈلیاں میں نرمی اور لچک باقی نہیں رہی۔ اس نے چادر کھینچی تھی تو پتھر کی ٹانگیں ننگی ہو گئی تھیں۔ بہو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس کے خسر کے چہرہ پر عجیب سی جالی چڑھ گئی تھی۔ اس نے ہاتھ لگایا تھا تو وہ پتھر کی تھی۔ تینوں نے کھلے منہ اور پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور ایک ساتھ چیخ مار کر کوٹھڑی سے باہر کود گئے تھے۔ دونوں عورتیں تیورا کر گر گئی تھیں اور نوجوان ہکلا ہو گیا تھا۔ وہ کوٹھڑی کی طرف اشارہ کرتا تھا اور عجیب سی بولیاں بولتا تھا۔ اڑوس پڑوس کے لوگوں کا خیال تھا کہ بزرگ کی موت کے صدمے سے اُس کے گھر والے ہوش کھو بیٹھے ہیں لیکن انہیں حقیقتِ حال معلوم ہوئی تھی تو وہ بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے تھوڑی سی دیر میں خوف نے کوڑے مار مار کر بستی خالی کرا لی تھی۔

سب لوگ کنوئیں کے پاس ایک خالی کھیت میں جمع ہو گئے تھے۔ ان کے ذہن ماؤف اور زبانیں بے قابو تھیں۔ آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اور کانوں نے جو کچھ سنا تھا، ذہن اس کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ سب نے مل کر سیانے سے درخواست کی تھی کہ وہ بستی میں جا کر میت کو دیکھے اور حقیقت کی تصدیق کرے مگر دوسروں کی طرح سیانے پر بھی لرزہ طاری تھا۔ اس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی کہ میری ایسی عمر نہیں ہے کہ اتنی بڑی ذمہ داری نبھا سکوں! بڑی مشکل سے تین نوجوانوں کو تیار کیا گیا تھا کہ وہ بستی میں جائیں اور میت کی جانچ پرکھ کر کے بتائیں کہ اصلیت کیا ہے؟ تینوں نوجوان ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر چلے تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ شروع میں ان کے قدم تیز تھے۔ بستی کے قریب پہنچ کر ان کی رفتار سست پڑ گئی تھی۔ گلی میں داخل ہوتے وقت ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ ایک گھر میں لاش پڑی تھی جو پتھر کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد سب نے پلٹ کر دیکھا تھا کہ تینوں نوجوان بھاگتے ہوئے آ رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں تھے۔ بستی والوں کے پاس پہنچے تھے تو بُری طرح ہانپ رہے تھے۔ ان کے خشک حلق پورا جملہ ادا کرنے سے قاصر تھے اس میں سے صرف دو لفظ نکل رہے تھے —— لاش...... پتھر!

نوجوانوں کی گھگھیاتی آواز نے بستی والوں کے خوف میں اضافہ کر دیا تھا۔ شام پڑنے کو تھی اور کوئی شخص بستی میں جانے اور وہاں سے بستر لانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ان کے پاس کلہاڑی اور درانتی ایسے اوزار بھی نہیں تھے کہ سوکھی شاخیں اور گھاس کاٹ کر جمع کرتے اور اُسے آگ لگا کر صحرا کی رات گرم کر لیتے۔ سب ان ہی کپڑوں میں لیٹ گئے تھے جو ان کے تن پر تھے مگر نیند تو ان کی آنکھوں سے اڑ گئی تھی۔ سبھی لوگ ساری رات کانپتے اور سسکتے رہے تھے۔ صبح اُٹھے تھے تو ان کا ایک اور آدمی مر گیا تھا۔ اُسے ہلانے جلانے کی کوشش کی گئی تھی تو اس کے ساتھی چیخ کر دور ہٹ گئے تھے۔ ایک اور لاش پتھر ہو گئی تھی۔

اب تو کہیں بھاگ جانے کی گنجائش نہیں تھی۔ حقیقت سامنے پڑی تھی۔ اُسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

دوپہر تک بحث ہوتی رہی تھی۔ پھر بھوک سب کو کاٹنے لگی تھی اور یہ احساس بھی تیز ہو گیا تھا کہ چاروں طرف ریت کا سمندر ہے۔ کھانے کا سامان ہی نہیں۔ مال مویشی بھی بستی میں ہیں اور وہ بھوک پیاس سے ہلاک ہو سکتے ہیں۔ سب کی باتیں سن کر پنچایت کے ایک بزرگ رکن نے کہا کہ پتھر لاشیں ہمارے اپنوں کی ہیں۔ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ انہوں نے پتھر ہو کے ہمیں بتا دیا ہے کہ مرنے کے بعد بھی ہم انہیں اپنے پاس رکھیں، ان کی خدمت کریں اور فیض پائیں۔ ان لاشوں کو اپنے اپنے صحن کے طاقوں میں رکھا جائے۔ ان کی جھاڑ پھونک کی جائے اور ان کے پاؤں چھو کر گھر سے باہر نکلا جائے۔

یہ تقریر سب کو پسند آئی تھی ۔ وہ ڈرتے ڈرتے اپنے مکانوں میں واپس آ گئے تھے اور آہستہ آہستہ کام کاج میں لگ گئے تھے پتھر کی بیٹیوں کا ذکر صرف گفتگو تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ انسان کی بقا کا شاید یہ راز بھی ہے کہ وہ ناموافق حالات کو قبول کر لینے اور ان میں زندہ رہنے کا حوصلہ رکھتا ہے اور اس کا خوف لمحاتی ہوتا ہے۔ بے خوفی کی انتہا یہ تھی کہ ڈیڑھ دو سال بعد بعض من چلوں نے اپنے بزرگوں کی پتھر لاشیں اپنے گھر کے دروازے کے ساتھ دیواروں میں چن دی تھیں کہ وہ جنوں اور چڑیلوں کو ہمارے گھروں سے دور رکھیں گی ۔ پانچ چھ سال بعد مکان کے چاروں کونوں میں ایک ایک پتھر لاش دیوار کا حصہ بنا دی گئی تھی کہ اب گھر میں کسی دیو کے آنے کا بھی خطرہ بھی نہیں رہا۔

یہ تو لاشوں کو ٹھکانے لگانے اور انہیں تعمیر میں پتھروں کی جگہ استعمال کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ ورنہ وہاں کسی کو کسی سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ خطرہ اگر تھا تو صرف اَن جانے پن سے!

ایک روز سوداگر اپنے تجارتی سفر پر روانہ ہوا تھا تو کجاوے کا وزن برابر کرنے کے لئے اس نے ایک لاوارث لڑکے کی پتھر لاش کو پاسنگ بنا لیا تھا۔ قصبے میں پہنچ کر اس نے سامان کے ساتھ پاسنگ بھی اُتار لیا تھا۔ واپس آتے وقت وہ "پاسنگ" اٹھانا بھول گیا تھا۔ دوسرے دن دکاندار نے بچے کا بت دیکھا تھا تو وہ اسے بہت پسند آیا تھا۔ اسے جھاڑ پھونک کر اُس نے اپنی دکان پر سجا دیا تھا۔ کچھ دنوں بعد تین گورے اس کی دکان پر آئے تھے۔ انہیں کرائے پر کچھ اونٹ چاہئیں تھے جو ان کا سامان شہر پہنچا دیں۔ ان میں سے ایک کی نظر بچے کی مورتی پر پڑی تھی اور وہ "واہ۔ واہ" کرتا ہوا اس کی طرف لپکا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی پلٹ کر مورتی کو دیکھا تھا۔ نظروں ہی نظروں میں اُسے جانچا تھا اور سنگ تراش کے کمال فن کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ مورتی کا پتھر چکنا اور ہموار تھا جیسے سنگ تراش نے اس میں اتنی ملائمت اور اتنا گداز بھر دیا تھا کہ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ اس پر نرمی سے ہاتھ پھیرا جائے۔ پتھر بھی گندمی رنگ کا تھا جو اس سے پہلے گوروں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بچہ محو خواب تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اُسے ہلایا جُلایا گیا تو وہ اُٹھ کر بولنے لگے گا۔ ایک گورے نے پوچھا تھا۔ "یہ مورتی کہاں سے آئی ہے؟"

دکاندار نے جواب دیا تھا "ایک سوداگر یہاں بھول گیا ہے۔"

"وہ سوداگر کہاں ہے؟"

"یہ تو کسی کو معلوم نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں سے پانچ چھ راتوں کی مسافت پر کوئی بستی ہے۔ وہیں سے وہ چھ سات ماہ کے بعد آتا ہے۔"

غیر ملکی چھ ماہ تک کہاں انتظار کر سکتے تھے؟ وہ تو مقامی صحرا کی عمر، ساخت اور معدنیات کا جائزہ لینے آئے تھے اور اپنے حصے کا کام مکمل کر کے واپس جا رہے تھے۔ انہوں نے دوکاندار کے ہاتھ پر چند سکے رکھے تھے اور مورتی لے کر چلتے بنے تھے اپنے ملک میں جا کر انہوں نے اپنے مشن پر ایک مضمون لکھا تھا۔ اس کے ساتھ بچے کی مورتی کی رنگین تصویر بھی چھپوا دی تھی مضمون تو کسی نے پڑھا تھا یا نہیں پڑھا تھا مگر تصویر کی اشاعت کی دیر تھی۔ مجسمہ سازی کی دنیا میں داد و ستائش کی لہریں چلنے لگی تھیں مغرب کے لوگ اس فن پارے کی پوری تاریخ جاننے کو بے تاب ہو گئے تھے۔ تین عجائب گھروں نے اپنے آدمی قصبے کو بھیج دیئے تھے کہ وہ ساری معلومات جمع کر کے اور اگر کوئی مجسمہ ملتا ہے تو اسے لے کر واپس آئیں۔ ان گورے افراد نے بڑے شہر سے چھوٹے شہر تک ایک دن کھڑکھڑاتی ہوئی بس میں سفر کیا تھا۔ پھر چھوٹے شہر سے قصبے تک دو راتیں اونٹ کی پیٹھ پر کاٹی تھیں۔ انہوں نے موسم کی سختیوں اور پسماندگی کی مشکلوں کو نظر انداز کر کے ایک کھلے میدان میں کیمپ ڈال دیئے تھے۔

قصبے کے لوگ خوش تھے کہ غیر ملکیوں کی آمد سے انہیں بھی چار پیسے دیکھنے کو ملے ہیں سب سے بڑھ کر دکاندار مسرور تھا کہ ایک کے دس بنا رہا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ پراسرار بستی کا سوداگر صحرا میں بھٹک کر مر جائے اور گورے زیادہ نہیں تو سال ڈیڑھ سال یہیں اس کا انتظار کریں مگر ایک دن سوداگر کے گھنٹیاں بجاتے ہوئے اونٹ قصبے میں آ پہنچے تھے۔ غیر ملکیوں کو خبر ہوئی تھی تو وہ سوداگر کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان کا رنگ روپ دیکھ کر سوداگر بے چارہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے زندگی میں ایک بھی گورا نہیں دیکھا تھا۔ یہاں پانچ پانچ گورے اسے گھیرے میں لے کر کھڑے ہوئے تھے اور اپنی جناتی زبان میں اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ ان کی کائیں کائیں کا ٹوٹا پھوٹا مفہوم دکاندار نے اسے سمجھایا تھا۔ وہ اس جگہ کا پتہ پوچھ رہے تھے جہاں سے وہ بچے کی مورتی اُٹھا کر لایا تھا۔ یہ بات سُن کر وہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے بستی والوں سے وعدہ کر رکھا تھا کہ ان کی لاشوں پر جو کچھ گزر رہی ہے، اس کا ذکر بھی زبان پر نہیں لائے گا۔ اس نے پہلے تو اَن جان بننے کی کوشش کی تھی۔ لیکن گوروں نے جب کچھ اشیاء رشوت میں پیش کی تھیں اور ساتھ ہی چاقو اور چھریاں دکھا کر دھونس دی تھی تو اس کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس مقام کو ڈھونڈ کر جلد انہیں خبر کر دے گا، جہاں سے بچے کی مورتی ملی تھی۔ اس کی لجاجت دیکھ کر گورے کچھ مطمئن تو ہوئے تھے مگر وہ خبر کا انتظار کرنے کو تیار نہیں تھے وہ خود اس کے ساتھ جانا چاہتے تھے۔ ایسی غلطی بھلا سوداگر کہاں کر سکتا تھا۔ اس نے قصبے میں تین کی بجائے دو راتیں آرام کیا تھا۔ تیسری رات کو چپ چاپ واپس چلا گیا تھا۔ صبح گوروں کی آنکھ کھلی تھی تو انہیں پتہ چلا تھا کہ سونے کی چڑیا اڑ گئی ہے۔

گورے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ پیاسا بہرحال کنوئیں کے پاس آئے گا۔ انہوں نے قصبے میں ڈیرا ڈال لیا تھا بلکہ مقامی بادشاہ کو ایک درخواست بھی لکھ بھیجی تھی کہ قصبے تک سڑک بنائی جائے تاکہ سیاحوں اور سائنسدانوں کو اس تاریخی علاقے میں آنے جانے کی سہولت میسر آئے۔ مقامی بادشاہ جمہوریت پسند قسم کا تھا۔ اس نے گوروں کی درخواست اپنے نورتنوں کے سامنے پیش کر دی تھی۔ اسے پڑھ کر سینئر رتن نے کہا تھا کہ ہم اپنے معزز مہمانوں کی یہ چھوٹی سی عرضداشت مسترد نہیں کر سکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ لوگ خوش خوش واپس جائیں اور اپنے اپنے ملک کی حکومتوں سے ہماری امداد بڑھانے کی سفارش کریں اور اپنے سرمایہ کاروں کو ہمارے ملک میں سرمایہ لگانے کی ترغیب دیں۔ اس طرح ترقی یافتہ ملک میں ہماری ایک لابی بن جائے گی۔

امداد اور سرمایہ کاری کی بات سُن کر سارے رتن مزید چمک اُٹھے تھے۔ ان کے منہ سے رال ٹپکنے لگی تھی۔ وہ سینئر رتن کی سفارش منظور کرنے ہی والے تھے کہ ملکہ اُدھر آ نکلی تھی۔ اس نے آتے ہی رنگ میں بھنگ ڈال دی تھی۔ اس نے سینئر رتن کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ جس علاقے کے بارے میں آپ کچھ نہیں جانتے وہاں سڑک بنانے کی بات کیسے سوچ رہے ہیں سڑک بن گئی تو اس علاقے کا سارا رومان مٹی میں مل جائے گا! پھر ہم صحرا کے لوگوں کی تعداد بھی نہیں جانتے۔ ان کی رسمیں اور رواج بھی نہیں جانتے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ان کا مذہب کیا ہے؟ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں؟ وہ ہمارے معاشرے میں مزید خلفشار تو پیدا نہیں کریں گے؟ ہم نے صحرا میں معدنیات تلاش کرنے کا جو ٹھیکہ دیا ہے وہ اس کی مخالفت تو نہیں کریں گے؟"

"کیا ہم اپنے مہمانوں کی درخواست مسترد کر دیں"، سینئر رتن منمنایا۔

"ہم صاف انکار کیوں کریں گے؟ ہم مستقبل کے صیغے میں بات کریں گے۔ ہم کہیں گے کہ اس علاقے کی ترقی کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے غیر ملکی امداد اور سرمایہ حاصل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جونہی یہ مرحلہ طے ہو گا صحرا میں گلزار کھلا دیا جائے گا! اس علاقے میں سڑکوں کا جال بچھا دیا جائے گا!"

"سینئر رتن صاحب۔ "گی، گا، گے" پر کچھ نہیں لگتا۔ رہی کل کی بات تو کل کس نے دیکھا ہے؟" ملکہ اپنی تقریر جاری رکھا

چاہتی تھی مگر بادشاہ سلامت اس کا مطلب پا گئے تھے۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ گوروں سے خط وکتابت کرتے وقت ملکہ سے مشورہ کیا جائے۔

سوداگر اپنا اگلا پھیرا ٹالتا رہا تھا۔ وہ کچھ بولایا بولایا سا رہتا تھا۔ کئی دن چڑھ گئے تھے مگر وہ قصبے کا رخ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ گھر والے پوچھتے تھے تو وہ یہ کہہ کر ٹال جاتا تھا کہ طبیعت کچھ پھیکی رہتی ہے۔ حیلے بہانے آخر کب تک چل سکتے تھے۔ ایک دن اشیاء کی قلت اور لوگوں کے اصرار نے مجبور کیا تھا تو وہ اپنا فرض ادا کرنے کے لئے چل پڑا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گورے اگر وہاں موجود ہوئے تو مفت میں نہیں ٹلیں گے۔ اس نے ایک لاوارث بوڑھے کی پتھر لاش تاڑ رکھی تھی۔ چلتے وقت اسے کھالوں میں چھپا کر لے گیا تھا۔ وہ قصبے کے دکاندار کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ گوروں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ کڈھب طریقے سے بھاگتے ہوئے اس کے پاس پہنچے تھے اور اپنی مٹیالی آنکھوں کھول کھول کر جانے کیا بکنے لگے تھے۔ دکاندار اپنے گاہک کی مدد کو پہنچا تھا تو سوداگر نے کھالوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ بوڑھے کا بت دیکھ کر سب کچھ بھول گئے تھے۔ انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ بت کسی انسان نے تراشا ہے۔ انہوں نے کبھی پتھر میں ڈھلے ہوئے کسی بت کی ایسی مرجھائی ہوئی جلد، اس کے اندر گھومتی ہوئی نیلی رگیں اور بدن کے رنگ سے مختلف رنگ کے بال دیکھے ہی نہیں تھے۔ انہیں اپنے صبر کا پھل مل گیا تھا۔ انہیں مزید کسی بت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اسے بیچ کر لاکھوں کما سکتے تھے۔

بوڑھے کی سنگین میت ترقی یافتہ ملکوں میں پہنچی تھی تو پھر سے ہنگامہ بپا ہو گیا تھا۔ نقادانِ فن اس کی تعریف کرنے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانا چاہتے تھے کوئی کہتا تھا کہ یہ مجسمہ تو قبل از مسیح کے یونانی سنگ تراشوں کے لیے بھی ایک ماڈل ہے۔ کسی کا کہنا تھا کہ اسے تراش کر مائیکل اینجلو بھی اس پر ناز کرتا۔ کسی کو اس کے تناسب اور تنظیم کی مثال نہیں ملتی تھی اور کوئی اس کی بلاغت اور اعتدال پہ فدا ہو گیا تھا۔ سب لوگ متفق تھے کہ جہاں سے یہ دو مجسمے ملے ہیں وہاں اور بھی مورتیاں ہوں گی اور ایسے گنج شائگان کو گنواروں کے رحم وکرم پر چھوڑنا زیادتی ہے۔ اسے صحرا کے ویرانے سے نکال کر مہذب دنیا میں لانا چاہیئے۔ جہاں اس بت کدے کی مورتیاں سجانے کے لئے اعلیٰ قسم کے عجائب گھر موجود ہیں کچھ بت نیلام کئے جا سکتے ہیں۔ سنگ تراشی کے نادر نمونے جمع کرنے والے امراء ان کے منہ مانگے دام دیں گے۔ اس طرح خاصا سرمایہ جمع ہو جائے گا۔ اس کا ایک حصہ صحرائی علاقے کے لوگوں کی بھلائی کے کاموں پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق ان لوگوں نے سڑک اور کار، تو کیا گھوڑا گاڑی بھی نہیں دیکھی۔ وہ خود بھی علم الانسان کے ماہرین کا بہت اچھا موضوع بن سکتے ہیں۔

مغربی دنیا کی مختلف سوسائٹیوں نے بلکہ حکومتوں نے بھی مورتیاں ڈھونڈنے اور جمع کرنے کے لیے اپنے اپنے ایجنٹ پہنچا دیئے تھے۔ وہ کافی سامان بھی ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی حکومتوں کی ہدایت پر یہ طے کیا تھا کہ وہ مل جل کر کام کریں گے اور جو مورتیاں ملیں گی، انہیں ایمانداری سے بانٹ لیں گے۔ سارے فیصلے کرنے کے بعد وہ سوداگر کا انتظار کرنے لگے تھے۔ اب وہ قصبے والوں اور بستی والوں کے بارے میں پہلے سے زیادہ معلومات رکھتے تھے۔

اس بار سوداگر نے واپسی میں دیر نہیں کی تھی۔ گھنٹیاں بجاتے ہوئے اونٹ دکاندار کے دروازے پر پہنچ گئے تھے اور وہ بڑے اطمینان سے سامان اتارنے لگا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گوری بلائیں ٹل گئی ہیں اس لئے وہ اپنے ساتھ کوئی پتھر لاش نہیں لایا تھا۔ وہ دکاندار سے ابھی خیر خبر معلوم کر رہا تھا کہ گوروں کا ایک غول وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کا مال اتروانے کے بعد گورے اسے اپنے کیمپ میں لے گئے تھے۔ ایک مقامی ترجمان نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں اسے گوروں کی درخواست سے آگاہ کیا تھا۔ وہ اس بستی کی راہ معلوم کرنا چاہتے تھے جہاں سے وہ دو مورتیاں اٹھا کر لایا تھا۔ اس کے انکار کا بھی انہوں نے برا نہیں مانا تھا۔

اسے طرح طرح کے مزیدار کھانے کھلائے تھے اور قیمتی لباس پیش کئے تھے۔ وہ ذرا سا کھل گیا تھا تو اونٹوں کی باتیں ہونے لگی تھیں۔ اس نے اپنی علمیت بگھارتے ہوئے کہا تھا کہ اونٹ کی پکڑ سخت اور حافظہ تیز ہوتا ہے وہ جس کسی کا دشمن ہو جائے اسے کبھی نہیں بخشتا اور جس راہ پر سے ایک بار گزر جائے اسے ہرگز نہیں بھولتا۔ یہ بات سن کر گوروں کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔
دوسری صبح سوداگر کے اونٹ غائب تھے وہ اونٹوں کی ایک قطار کی رہبری کر رہے تھے۔ پانچ راتوں کے بعد یہ قافلہ بستی میں تھا۔ اونٹوں کی گھنٹیاں اتار لی گئی تھیں اس سے بستی والوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی کہ ان کے گھر میں چور گھس آئے ہیں۔ صبح اٹھے تھے تو یہ دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے تھے کہ عجیب و غریب شکلوں والے گورے بستی کے غربی کھلیان میں جمع ہیں۔ اس وقت ان سب کے ذہن میں ایک ہی بات آئی تھی کہ جہنم کے فرشتے بستی تک آ پہنچے ہیں وہ بھاگ کر شرقی کھیتوں میں جا کر چھپ گئے تھے لیکن انہوں نے جب دیکھا تھا کہ گورے ان کے صحنوں میں گھس کر ان کے بزرگوں کی میتوں کو چھیڑ رہے ہیں تو ان کی غیرت نے جوش مارا تھا۔ وہ لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور درانتیاں سنبھال کر گلیوں میں جمع ہو گئے تھے۔
گوروں کو خطرے کا احساس ہوا تھا تو انہوں نے دو اونٹوں پر لدا ہوا سامان کھولا تھا اور صحرا میں بازار لگا دیا تھا۔ انہوں نے کرائے کے ساربانوں کو کھانے کے لیے بسکٹ اور چوسنے کے لئے کھٹی میٹھی گولیاں دی تھیں پھر بھی بستی والوں کے منہ میں پانی نہیں بھرا تھا تو وہ خود بھی بسکٹ کھا کر اور گولیاں چوس کر انہیں بے ضرر ثابت کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ الا بلا کھانا بستی والوں کی طرف بڑھایا تھا مگر وہ اسے ہاتھ لگانے کو تیار نہیں تھے۔ طرفین کی مشکل بستی کے دیوانے لڑکے نے آسان کر دی کرتی۔ وہ جب تک جاگتا رہتا تھا گلیوں میں ناچتا، کودتا پھرتا اور چھوٹے بچوں کے ہاتھ سے کھانے کی چیزیں چھینتا رہتا تھا اس نے حسب عادت بسکٹوں کے تھال پر جھپٹا مارا تھا اور کئی بسکٹ ایک ساتھ منہ میں ڈال لیے تھے۔ اسے دیکھ کر بستی والوں کا حوصلہ بڑھ گیا تھا انہوں نے بڑھ کر بسکٹ اور گولیاں اٹھا لی تھیں۔ وہ انہیں مزے کی لگی تھیں تو انہوں نے جھولیاں بھر لی تھیں۔ صرف ایک بزرگ نے ہانک پکار کے کہا تھا "کوئی چیز مفت نہیں ملتی۔ پردیسی تو کسی کو بھیک بھی نہیں دیتے۔ ہوش میں آؤ۔ سونگھو، گوروں نے کتنی بدبو پھیلا دی ہے۔ بستی کی ہوا بھی گندی ہو گئی ہے۔" یہ پکار نہ گوروں کی سمجھ میں آئی تھی اور نہ ہی کرائے کے ساربان ہی یہ زبان جانتے تھے۔ رہے بستی والے تو کھٹی میٹھی گولیوں کی لذت نے ان کے کان بند کر دیے تھے۔
پاگل لڑکا دوسری بار ناچتا کودتا آیا تھا اور اس نے جھپٹا مارنے کی کوشش کی تھی تو ایک گورے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اتنے زور سے دھکا دیا تھا کہ وہ چار قدم دور جا کے گرا تھا۔ دیوانے کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ چیزیں مفت نہیں ملتیں! سامنے طرح طرح کی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ رنگ برنگ کے کپڑے، سرخی پوڈر، پلاسٹک کے کھلونے، ٹرانزسٹر، اچار چٹنیاں، مربے، بسکٹ، ٹافیاں، چاندی کے زیور اور بستی کے لوگوں کے لئے دوسری دلکش چیزیں — کرائے کے ساربانوں نے اشاروں کنایوں اور الٹی سیدھی زبان میں بستی والوں پر واضح کر دیا تھا کہ یہ ساری چیزیں تمہیں مل سکتی ہیں بشرطیکہ ان کے بدلے میں تم اپنے اپنے گھروں سے بت اٹھا کر پردیسیوں کو دے دو!
سودے کی بات سن کر بستی والے پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے ساربانوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ یہ بت نہیں ہیں ان کے بزرگوں اور بھائی بہنوں کی لاشیں ہیں جو پتھر ہو گئی ہیں۔ یہ وضاحت ساربانوں کی سمجھ میں نہ آئی تھی اور وہ کچھ سمجھے بھی تھے تو اسے مذاق سمجھ کر ٹال گئے تھے۔ بستی کے بزرگ نے پھر ہانک لگائی تھی "احمقو! پردیسیوں کے جال میں نہ پھنسو۔ ان کی لائی ہوئی چیزیں چار دن میں ختم ہو جائیں گی۔ ان کی خاطر باپ دادا کی میتیں نیلام پر نہ چڑھاؤ۔ دیکھو، گوروں نے بستی میں کتنی غلاظت پھیلا دی ہے۔ سانس لینا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ بھلا اسی میں ہے کہ انہیں بھگا دو۔"
ایسی چمکتی دمکتی اور گاتی ہوئی چیزیں دیکھ کر بزرگ کے مشورے پر کون عمل کرتا تھا۔ تھوڑی سی ردّ و قدح کے بعد بستی

چند آدمی اپنے بزرگوں کی مٹی بلکہ پتھر خراب کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ وہ اپنے اپنے گھر گئے تھے تو گھر کی عورتوں نے انہیں اپنے بزرگوں اور بچوں کی پتھر لاشیں اٹھانے سے روکا تھا کہ اس طرح اپنے شجرے ضائع نہ کرو۔ مگر انہوں نے اپنی عورتوں کو دھکے کر اپنے راستے سے ہٹا دیا تھا اور پتھر لاشیں اٹھا کر چلے گئے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی بستی کے دوسرے لوگ بھی اپنے گھروں میں پڑی ہوئی لاشیں اٹھا لائے تھے اور گوروں سے چیزوں کی صورت میں ان کی قیمت وصول کر لی تھی۔ کچھ نوجوان قبرستان جا پہنچے تھے۔ اور برسوں پرانی قبریں اکھاڑ دی تھیں مگر ان میں سے انہیں ٹیڑھی میڑھی ہڈیوں اور بے لوز کھوپڑیوں کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ بازار بھرا ہوا تھا اور لاشیں کہیں سے مل نہیں رہی تھیں۔ گوروں کو معلوم تھا کہ ابھی بیش قیمت نسوانی مورتیاں موجود ہیں جو یہ لوگ بیچنے کے لئے نہیں لائے تھے لیکن گورے جانتے تھے کہ انہوں نے سیدھے سادے لوگوں کو خواہشوں کا غلام بنا لیا ہے وہ اب بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ وہ ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد نسوانی مورتیاں بھی لے آئیں گے۔ گورے ان کے انتظار میں ریڈیو بجاتے رہے تھے، پٹاخے چلاتے رہے تھے۔ کپڑوں کے تھان کھول کھول کر پھینکتے رہے تھے۔ چابی والے کھلونے اور پلاسٹک کے پستول چلاتے رہے تھے۔ گوروں کا اندازہ صحیح تھا بستی والے ایسی ترغیبات کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے عورتوں کی پتھر لاشیں بھی اٹھا لائے تھے۔ شروع میں ان کے چہرے شرم سے سرخ تھے مگر تھوڑی دیر بعد ان کے رنگ نارمل ہو گئے تھے۔ وہ نسوانی لاشوں کا بھی مول ٹھہرانے لگے تھے۔ انہیں اپنے بزرگ کی آواز سنائی ہی نہیں دے رہی تھی جو کہہ رہا تھا "عزیزو، کیا تم پتھر کے ہو گئے ہو؟ اپنی عزتیں بیچے دے رہے ہو۔ گندے گوروں نے تمہاری آنکھوں پر حرص کی پٹی باندھ دی ہے تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ گوروں کی آمد کے بعد بستی کی فضا خراب ہو گئی ہے۔ چڑیاں تک اڑ گئی ہیں۔ تم بے حس ہو چکے ہو۔ مرنے جوگو، تم اپنے بزرگوں کے انتقام سے نہ بچ سکو گے۔ یہ بستی تمہاری بستی نہیں رہے گی۔ یہ بھی گوروں کی ہو جائے گی اور تم در در کی ٹھوکریں کھاؤ گے!"

شام تک گوروں نے گاؤں کی ساری مورتیاں سمیٹ لی تھیں۔ صرف وہ بت بچے تھے جو دیواروں میں چنے ہوئے تھے۔ انہیں وہ اگلے پھیرے کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ رات کو وہ قصبے کو روانہ ہو گئے تھے اور بستی کے باشندے اپنی انوکھی چیزوں کو سجانے اور چھپانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ رات کو دیکھنے کے لیے ان کے پاس ٹارچیں بھی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار انہیں چوری کا خوف لاحق ہوا تھا۔ وہ جو صبح تک دروازے کھلے چھوڑ کر کھیتوں میں کام کرنے کے لئے چلے جایا کرتے تھے۔ اب رات کے اندھیرے میں بھی چوروں کے سائے دیکھنے لگے تھے۔ بچوں کے سوا سب نے اپنے مال کی حفاظت کرنے کے لئے رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔

پو پھٹی تو تیز ہوا چلنے لگی تھی۔ دوپہر کو آندھی اٹھی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ بستی کے نیچے دریا بہنے لگا ہے۔ دیواروں میں چنی ہوئی لاشیں آہستہ آہستہ گوشت پوست کی لاشیں بن گئی تھیں۔ وہ دیوار کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ کئی مکان جھول کر دھڑام سے گر رہے تھے۔ بستی کے لوگ یہ منظر دیکھ کر حواس باختہ ہو گئے تھے وہ ڈھاٹے باندھ کر بستی سے باہر بھاگے تھے۔ سب سے آگے دیوانہ لڑکا تھا۔ لوگ اسی کے پیچھے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ کچھ دور جا کر انہیں احساس ہوا تھا کہ دیوانہ لڑکا تو جہنم کی جانب جا رہا ہے وہ رک کر پلٹے تھے مگر آندھی نے ان کے قدموں کے نشان بھی اڑا دیئے تھے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ بستی کا صحیح زاویہ کون سا ہے اور انہوں نے بھاگتے ہوئے کتنی قوسیں بنائی ہیں؟ آندھی تھمی تھی تو انہوں نے اٹھ کر چلنا شروع کیا تھا۔ وہ چلتے گئے تھے۔ گرتے گئے تھے۔ مرتے گئے تھے لیکن انہیں بستی کا نشان تک نہیں ملا تھا!

صرف ایک سوداگر بستی والوں کی نشانی رہ گیا تھا۔ وہ قصبے میں رو رو کر بستی کے قصے سناتا تھا اور خیرات میں دو وقت کی روٹی پاتا تھا۔

ذمہ دار

سلطان جمیل نسیم

سڑک کے کنارے گڑے ہوئے بجلی کے کھمبے نے اپنی یرقان زدہ آنکھ سے دیکھا۔

سعیدہ کے اُترتے ہی ٹیکسی نے یوٹرن کاٹا اور پل بھر میں اس کی سرخ روشنیاں بھی نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ وہ سڑک سے اُتر کے اپنے گھر کی طرف جانے والی اُس گلی میں مڑگئی جس کے بیچوں بیچ وہ گندی نالی رک رک کر بہتی تھی جس میں چھوٹا بڑا فاصلہ طے کر کے محلے بھر کی نالیاں آن ملی تھیں اور چوبیس گھنٹے بدبو کا بھبکا اٹھتا رہتا تھا۔ نالی میں زبان لٹکائے اور پیر پھیلائے لیٹے ہوئے کتوں کے سامنے گرمیوں کی رات کے پورے چاند کا سایہ خشک روٹی کی طرح پڑا تھا۔

سعیدہ کے قدموں کی مانوس چاپ سُن کر کوئی کتا نہیں بھونکا۔ بس ایک لحظہ کے لیے لٹکی ہوئی زبانیں جبڑوں میں سمیٹیں، اپنی تھوتھنیاں اُٹھا کر لاتعلقی سے دیکھا اور پھر پہلے کی طرح اپنی پچھلی ٹانگوں پر سر لٹکا دیئے، زبانیں باہر نکال دیں اور نالی میں بہتے چاند کو تکنے لگے۔

سعیدہ نے اپنے جانے کے بعد سے اب تک کا وقت ٹھہر ٹھہر کر خیالات کے جھٹکے کھاتے ہوئے گزارا تھا۔ اس کو موقع ہی نہیں ملا تھا کہ اپنے حالات کا ناتا گزری ہوئی گھڑیوں یا آنے والی ساعتوں سے جوڑ سکے لیکن گھر کے دروازے سے چند قدم فاصلہ رہ جانے پر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے اور وہ یوں لڑکھڑانے لگی جیسے ایک انجانا خوف گلی میں بچھی ہوئی دھول کی طرح اس کے پیروں سے لپٹ گیا ہو۔

خوف اور خجالت سے زیادہ اسے اپنے بھائی فتح شیر کی فکر تھی جو سات برس جیل میں گزار کے آیا تھا۔ وہ اُسے پھر جیل کی کوٹھڑی کا راستہ دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ اب ایک ہی تو بھائی رہ گیا تھا۔ وہ اگر اب تک جاگ رہا ہوا تو۔۔۔؟

اس ایک سوال نے اُس کے سامنے یادوں کی جھولی پھیلا دی جس میں فقیر کو بھیک میں ملنے والے سکوں کی طرح بچپن سے اب تک کے سارے واقعات رلے ملے پڑے تھے۔ اسے ماہ و سال کا تو علم نہیں تھا مگر وہ ان اسباب سے واقف تھی جو گھر میں دہشت بن کر پھیلے تھے اور اُس کے بھائی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کے کال کوٹھڑی کی طرف لے گئے تھے۔

سعیدہ گھر کے بند دروازے کے سامنے پہنچ کر ٹھٹھر گئی۔

کیا وہ لوٹ جائے۔؟ مگر کہاں۔؟

اُس کے کئی ٹھکانے بن سکتے ہیں لیکن اس بند دروازے کے اُدھر لوگوں پر کیا بیتے گی؟

ذہن میں قطرہ قطرہ ٹپکنے والے سوال ایک بوجھ بن گئے تو وہ کچھ دیر بند دروازے کے آگے کھڑے رہنے کے بعد چوکھٹ کے سامنے پڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔

سعیدہ جب دس بارہ سال کی تھی تب بڑا بھائی گاؤں میں قتل کردیا گیا تھا۔ پشت در پشت چلنے والی دشمنی اپنا رنگ

دکھاتی ہی رہتی تھی ۔۔۔۔ فتح شیر نے ماں کے رونے اور منت سماجت کرنے پر انتقام سے تو ہاتھ اٹھا لیا لیکن ساتھ ساتھ یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ صبر کا گھونٹ تو بھر لیا ہے مگر طعنوں کے زخم نہیں کھا سکتا اس لیے گاؤں چھوڑنا پڑے گا ۔۔ بیٹے کی زندگی اور ضد کے آگے دو بیگھے زمین کی کیا حیثیت تھی چنانچہ ماں پرکھوں کی زمین سے رشتہ توڑنے پر آمادہ ہو گئی ۔

فتح شیر نے بوڑھی ماں، چھوٹی بہن، بیوہ بھاوج اور اس کے تین بچوں کو لے کر شہر کا رخ کیا ۔ شہر میں رہنے کے لیے ایک ٹھکانہ نظر میں تھا جہاں اتنے عرصہ کے لیے ٹھہرا جا سکتا تھا کہ ایک گھر کا انتظام کر سکے ۔ لاری سے اُتر کے دوڑا ہوا راجہ کے پاس پہنچا، اُس سے گھر کی چابی لی پھر سوزوکی پکڑی ۔ سارا سامان لاد کے اس پر گھر والوں کو بٹھایا اور ڈرائیور کے پاس راستہ بتانے لیے خود بیٹھ گیا ۔

ندی کے کنارے میلوں تک کچی آبادیاں پھیلی ہوئی تھیں ۔ ان ہی آبادیوں میں سے ایک میں راجہ رہتا تھا فتح شیر جب پہلی مرتبہ شہر آیا تھا تو اجنبیت اس طرح ٹوٹ کے ملی تھی کہ وہ چند گھنٹوں میں ہی گھبرا گیا تھا ۔ واپسی کا ارادہ کیا تو راجہ سے ملاقات ہو گئی ۔ پہلی ملاقات پر راجہ نے ایسی اپنائیت دکھائی کہ اپنے گھر لے گیا ۔ رہنے سہنے میں ہی ساجھا نہیں کیا بلکہ مرچ مسالا بھی مل کے منایا ۔ فتح شیر کی محنت اور کام کی صفائی نے اسے ترکھانوں کی صف میں لا کھڑا کیا جن کی مہارت پر شہر کے ٹھیکیدار پیشگی رقم دے کر نخرے بھی اٹھاتے ہیں ۔ راجہ بھی اسی کے گاؤں کا رہنے والا تھا مگر مدت ہوئی شہر میں آ بسا تھا ۔ لاری اڈے کے ساتھ فٹ پاتھ پر قینچی استرا لے کے بیٹھتا تھا اور شام تک اتنی کمائی کر کے اٹھتا تھا کہ اگر وہ ایک دن ناغہ بھی کرے تو روٹی پانی کی فکر نہ ہو ۔ مگر جب کام کے ساتھ ساتھ یاری دوستی بھی چلتی رہے تو ناغہ کیوں کرے ۔ ہاں ہفتہ میں ایک رات وہ اپنے کسی نہ کسی ساتھی کے ہمراہ "دل پشاوری" کرنے ضرور جاتا تھا ۔ راجہ سے ان دنوں کی ملاقات اب پھر کام آئی

شام کو راجہ اپنے گھر پہنچا تو ایسا لگا جیسے غلطی سے کسی اور کے گھر میں چلا آیا ہے ۔ اُجلا اُجلا بھرا پُرا گھر اتنا اچھا لگا کہ جب بھی فتح شیر نے کہیں اور گھر لینے کی بات کی تو راجہ نے ایک کان سے سُن کر دوسرے سے اُڑا دیا ۔ فتح شیر کو ایک بڑا کام مل گیا تھا ۔ ہاتھ میں پیسہ بھی تھا لیکن اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ کوئی جگہ ڈھونڈ سکے ۔ مہینہ دو مہینہ کی بات ہوتی تو راجہ کے ساتھ رہنے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن پورے خاندان کے ساتھ کب تک رہا جا سکتا تھا ۔ آخر روز روز کے ایک ہی مطالبہ سے تنگ آ کر راجہ نے ایک دن اپنے گھر کے برابر والی جگہ کا سودا کرا دیا ۔ فتح شیر کو جگہ بہت اچھی لگی ۔ ایک تو راجہ کی قربت ، دوسرے گلی کے نکڑ پر ہونے کی وجہ سے دو طرف سے کھلی ہوئی ۔ کچھ رقم ہاتھ میں تھی کچھ پیشگی لی ۔ دو پکے کمرے بنوائے ۔ بعد میں زینہ اٹھا کے ایک کمرے کی چھت پر اپنے مرحوم بھائی کے بچوں اور سعیدہ کے لیے علیحدہ کمرہ بھی بنوا دیا کہ اس نے سُنا تھا کہ پڑھنے والے بچوں کے لیے الگ جگہ ہونی چاہیئے ۔

فتح شیر کی مصروفیت اور "دو منزلہ" مکان دیکھ کر بستی کی جوان بیٹیوں کی ماؤں نے اس کے گھر پھیرے لگانے شروع کر دیے ۔ پھر ماں اور بھاوج نے مل کر ایک لڑکی پسند کی اور فتح شیر کی شادی ہو گئی ۔

یہ اُن دنوں کی ایک رات کا واقعہ ہے جب فتح شیر کی بیوی مردہ بچے کو جنم دینے کے بعد ایک ہفتے اسپتال میں رہ کر آئی تھی اور کڑاکے کی سردی میں شوہر سے لپٹی سو رہی تھی کہ اچانک فتح شیر کی گہری نیند میں خلل پڑا ۔ اس نے کروٹ بدلی تو کان میں عجیب سی آوازیں آئیں ۔۔ اس نے سوئی ہوئی بیوی کی سانسوں پر توجہ دی تو محسوس ہوا یہ آوازیں تو کہیں باہر سے آ رہی ہیں ۔۔ ماں کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی ۔ یہ سوچ کر وہ چارپائی سے اٹھا ۔ لالٹین کی لَو اونچی کی ۔ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے سے چادر کو جسم پر لپیٹے ہوئے جب اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو ساری آوازیں خاموشی میں سمٹ گئیں ۔ جس کمرے میں ماں اور بھاوج سوتی تھیں ، ہاتھ لگاتے ہی

اس کا دروازہ کھل گیا۔ ماں رضائی میں لپٹی ہوئی ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ بھاوج کی چارپائی خالی تھی۔ اُس کمرے کے برابر بنے ہوئے بھنڈار کا دروازہ کھولا تو کوئی اچھل کے اس سے ٹکرایا۔ لالٹین ہاتھ سے چھوٹ گئی اور فتح شیر لڑکھڑا کے دیوار سے جا لگا اور ٹکرانے والا پلک جھپکنے میں دروازہ کھول کے گلی کے اندھیرے میں گھل مل گیا۔ سنبھلنے کے بعد فتح شیر نے لالٹین اٹھائی تو ملگجی روشنی میں اپنی بیوہ بھاوج کو دیکھا جو فرش پر بچھی ہوئی دری میں اپنے بدن کو لپیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ فتح شیر نے لالٹین کو زمین پر رکھا اور آگے بڑھ کے دونوں ہاتھوں سے اس طرح بھاوج کا گلا دبوچا کہ حلق سے ایک آواز بھی باہر نہ آ سکی۔

اقراری ملزم تھا۔ کسی گواہ کی ضرورت تھی نہ صفائی کی۔ سات سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا ۔۔۔ قید کے ان سات برسوں میں فتح شیر پر جو گزرنی تھی سو گزری لیکن گھر پر قیامت آتی چلی گئی۔ پہلے تو گھر میں فاقے گھس آئے اور آہستہ آہستہ برتن بھانڈے نکلنے لگے۔ پھر دشمن کی فوج کے مانند سعیدہ پر جوانی ٹوٹ پڑی اور سارا بچپن تہس نہس کر ڈالا۔

راجہ بھی کہاں تک سہارا دیتا۔ ایک دو وقت کی تو بات نہیں تھی۔ اُس کا یہی احسان کیا کم تھا کہ جب بھی دس پانچ روپے مانگے اُس نے انکار نہیں کیا۔ پھر فتح شیر کو بیڑی سگریٹ پہنچانے کی ذمہ داری تو اُس نے دوست ہونے کے ناتے پہلے ہی قبول کر رکھی تھی۔ وہ ایک مرتبہ اماں اور بھرجائی کو ملانے کے لیے جیل خانے بھی لے گیا تھا لیکن جب فتح شیر نے بیوی کے بدن پر نیزوں کی طرح پڑتی ہوئی غیر نگاہیں دیکھیں تو راجہ کو منع کر دیا کہ آئندہ وہ اپنے ساتھ کسی کو بھی لے کر نہ آئے۔

ماں کی آنکھوں میں تو اُسی دن سے اندھیرا چھانے لگا تھا جب بڑا بیٹا قتل ہوا تھا۔ اس دن کے بعد سے رہی سہی روشنی بھی جاتی رہی جب راجہ نے وقفہ وقفہ سے یہ خبریں سنائیں کہ جیل سے فرار ہونے کی کوشش میں فتح شیر کی ٹانگ میں گولی لگی ہے اور اسے جیل کے اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے ۔۔۔ پھر یہ کہ زخم خراب ہو جانے کی وجہ سے ایک پیر ہی کاٹ دیا گیا ہے۔

گرمیوں کی وہ سیاہ رات کچھ زیادہ ہی بڑی ہو گئی تھی اور کاٹے نہیں کٹ رہی تھی جس رات کی سیاہی میں تیرتی ہوئی سرگوشیاں اُس کے کانوں تک پہنچی تھیں۔ سعیدہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تھی مگر کسی پہلو چین نہیں تھا۔ وہ سرگوشیاں کانٹے کی طرح چبھتی چلی جا رہی تھیں۔ پھر اچانک زیرِ لب کہی جانے والی باتیں وہ آنکھیں بن گئیں جن کو کئی دن سے دیکھ رہی تھی۔ راجہ کی آنکھیں اور بھرجائی کی آنکھیں۔ سعیدہ کو ان آنکھوں میں کچھ عجیب سی بے رحم اجنبیت نظر آئی تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکی لیکن محسوس کیا کہ دونوں کی آنکھیں چار ہوتے ہی کسی سازش میں مصروف نظر آنے لگتی ہیں۔ سعیدہ نے بے چینی اور بے کلی کے ساتھ کئی راتیں اس طرح گزاریں کہ دن کے اجالے میں دیکھی ہوئی آنکھیں رات کی سیاہی میں تلوار کی طرح چمکتی ہوئی ایک طرف سے اٹھتیں اور اُس کے وجود کو دو لخت کرتی ہوئی دوسری طرف ڈوب جاتیں۔

ایک دن بھرجائی نہا کے نکلی تو بال جھٹکتے ہوئے اس کی نظر اوپر اٹھی جہاں سعیدہ گم صم بیٹھی تھی۔ وہ گیلے بالوں کو خشک کپڑے میں لپیٹتی ہوئی زینہ چڑھ کے سعیدہ کے پاس آ گئی، بہت اپنائیت سے پوچھا "کیا سوچتی بیٹھی ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

بھرجائی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ اپنا ایک ہاتھ سعیدہ کے زانو پر رکھا اور جھکے ہوئے لہجہ میں سمجھانے کا انداز سمیٹ کر بولی۔ "مت سوچ سعیدہ ۔۔۔ جب تک میں بھی سوچتی رہی گھر کا سامان بکتا رہا جب میں نے سوچنا چھوڑ دیا تو دو وقت کا آسرا ہو گیا لیکن کب تک ۔۔۔ ایک بندہ ہو تو ایک وقت بھوکا رہ کر بھی گزارہ کر لے۔ رات کی نیند کا بوجھ اب مجھ اکیلی سے بھی نہیں اٹھتا، میں تھک چلی ہوں۔ آ ۔۔۔ ہم دونوں مل کر اس بوجھ کو بانٹ لیں۔"

وہ گھنٹوں سعیدہ کے ساتھ بیٹھ کر اُسے سمجھاتی رہی۔ اُس کا خوف دور کرتی رہی۔ جب سعیدہ نے کمر باندھی تو حالات

سدھرنے لگے۔ مقتول بھائی کی دونوں بیٹیوں کو پھر اسکول میں داخل کرا دیا۔ نو عمر بھتیجے کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ اواگی تواگی پھرنے سے بہتر یہی سمجھا کہ راجہ کے مشورے پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ ایک موٹر میکینک کے پاس کام سیکھنے کے لیے بٹھا دیا۔

ذرا ہاتھ کھلا تو سعیدہ نے بھرجائی سے مشورہ کیا۔ کیوں نہ لگے ہاتھوں ماں کی آنکھیں بھی بنوادی جائیں؟

"برا نہ ماننا سعیدہ — یہ پیسہ ایسی قبر میں تو نے گرانا نہیں ہیں — تیری بھتیجیاں، بڑی ہو رہی ہیں۔ ان کے بھی ہاتھ پیلے کرنے ہیں ماں کی آنکھیں بن جائیں یہ بات اچھی تو ہے مگر کیا یہ سب کچھ دیکھ کر خوش ہوگی؟"

معلوم نہیں اس بات کی بھنک ماں کے کانوں میں کیسے پڑ گئی۔ ایک روز اس نے باتوں باتوں میں سعیدہ سے کہا۔ "میرا ایک بیٹا قتل ہو گیا۔ دوسرا جیل جا کر اپاہج ہو گیا۔ اب میرے دیکھنے کو کیا رہ گیا ہے۔ اب تو آنکھیں کھول کر رہیو اور اپنی بھرجائی کو بھی سمجھا دے فتح شیر کے سات سال پورے ہونے میں کچھ ہی مہینے رہ گئے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا بیٹا ساری عمر جیل ہی میں گزار دے —"۔

سعیدہ حالات کے چکر میں ایسی گھری تھی کہ فتح شیر کو بھول ہی بیٹھی تھی۔ اب ہر لمحہ بھائی کے آنے کا دھڑکا لگا رہنے لگا۔ دروازے کی جب بھی کنڈی کھٹکائی جاتی اس کا دل دھڑکنے لگتا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سعیدہ سو کر اٹھی تھی کہ کسی نے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ ماں نے آواز لگائی۔ "ارے دیکھو تو کون ہے —"

بھرجائی بے دلی سے اٹھ کر گئی۔ پھر سعیدہ نے اس کی ہلکی سی چیخ سنی۔ پھر تیز تیز قدموں سے پلٹتے اور ماں کے قریب آتے دیکھا — پھر پھولی ہوئی سانس اور خوف زدہ لہجہ میں ابھرتے ڈوبتے لفظ سنے — "وہ وہ — آگیا —"

"آگیا وہ —؟" ماں نے اتنے خوشی بھرے انداز میں کہا جیسے اس کی بوڑھی آنکھوں میں روشنی آگئی ہو۔ تڑت اٹھی اور دونوں ہاتھ پھیلائے دروازے کی سمت بغیر ٹھوکر کھائے بڑھتی چلی گئی۔

سعیدہ اس طویل عرصہ میں اپنے بھائی کے خدوخال بھی بھول چکی تھی۔ گھٹا ہوا سر گھنی داڑھی مونچھیں جن میں سفید بالوں کی چمک بھی شامل تھی۔ نحیف و نزار کو ایک طرف سے ماں سہارا دیئے ہوئے تھی اور دوسری طرف سے بغل میں دبی ہوئی بیساکھی — سعیدہ اس اجنبی کو دیکھتی رہی۔ پھر بے اختیار اٹھی اور بھائی کے سینے سے لگ کر رونے لگی

دروازے سے کمرے تک پہنچنے کے عرصے میں بھرجائی نے لپ جھپ کر کے فوم کے گدے پر نئی چادر بچھادی۔ تکیہ کے غلاف بدل ڈالے۔ فتح شیر نے اطمینان سے بیٹھنے کے بعد باری باری سب کے چہروں پر نظر دوڑائی۔

"یہ سعیدہ ہے — اور بیگماں کتنے اے — اچھا یہ بیگماں ہے اور — اور وہ کاکی، وہ شادو ہے نا؟" اپنی بہن بھتیجیوں کو پہچان رہا تھا۔ جب لیٹ گیا تو ایک نظر پھر سب کو دیکھا۔

"سات برس بھی لمبی مدت ہوتی ہے۔ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ جیسے میں — جیسے سعیدہ، بیگماں اور شادو — میں تو اپنے ساتھ ان کا بچپن لے گیا تھا اور دہی لے کے نکلا تھا — پر یہاں تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔"

"کچھ نہیں الٹا پلٹا۔ تو بہنوں کو چھوڑ کے گیا تھا۔ اپنوں میں آن ملا ہے —" ماں نے اپنی بے نور آنکھیں اٹھا کر اس کی باتوں میں الجھی اداسی کو دور کرنا چاہا — پھر اچانک بیٹے کے کٹے ہوئے گھٹنے پر ہاتھ پڑا — اور وہ ڈکیں مار مار کر رونے لگی۔

"معمولی زخم تھا کچھ دن میں آپ ہی ٹھیک ہو جاتا — میں دوبارہ نہ بھاگ سکوں اس لیے انھوں نے ٹانگ ہی کاٹ دی۔"

فتح شیر کے آنے کی خوشی، ماحول میں سمٹی خوف زدہ اداسی، دلوں میں چھپے ہوئے چور نے سب ہی کو رونے پر مجبور کر دیا —

شام تک خاطر مدارات اور باتوں میں وقت ایسے گزرا کسی کو زیادہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ جب سورج ڈھلے پر سعیدہ نے سونچ

دیا کے بلب روشن کیا تو چکا چوند سے فتح شیر کی آنکھیں جھپک گئیں۔ "اچھا تو بجلی آگئی ہے؟"
یہ سوال سنتے ہی پہلے تو سب کے کرنٹ سا لگا۔ لمحہ بھر سکتہ طاری رہا۔ پھر جواب دینے کی ساری ذمہ داری ماں نے قبول کر لی اور آہستہ سے بولی: "ساری بستی میں بجلی آگئی ہے رے — گھر میں نلکا بھی لگ گیا ہے۔ سوئی گیس بھی آگئی ہے۔"
جب رات گئے راجہ کی مانوس دستک گونجی تو سعیدہ لپک کر دروازے پر پہنچی اور اس سے پہلے کہ راجہ کے منہ سے کوئی لفظ نکلے اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر ذرا بلند آواز میں کہا "خیر ل گئی تمہیں بھی بھائی فتح شیر کے آنے کی آجاؤ — وہ تمہارا ہی انتظار کر رہا ہے۔ کئی دفعہ پوچھ چکا ہے تمہیں۔"
راجہ نے فتح شیر سے گلے ملنے کے بعد ایک سانس میں کئی باتیں کہیں۔ "مجھے خبر کیوں نہیں کی — میں گاؤں چلا گیا تھا اس لیے تیرے پاس نہیں آسکا۔ کتنا کمزور ہو گیا ہے پہچانا ہی نہیں جا رہا ہے۔ ذرا ٹھہر میں سامان رکھ آؤں تو یہ جھاڑ جھنکاڑ صاف کروں — "
"بیٹھا رہ، بیٹھا رہ — ابھی تجھ سے بڑا ساز و سامان منگانا ہے — جب سے آیا ہوں بدن ٹوٹ رہا ہے" وہ دونوں آپس میں کچھ دیر کانا پھوسی کرتے رہے پھر راجہ یہ کہتا ہوا اُٹھا "ابھی لے کے آتا ہوں — "
راجہ کو جاتے دیکھ کر دروازہ بھیڑنے کے لیے سعیدہ اُٹھی تو چوکھٹ پار کرنے سے پہلے راجہ نے دھیمی آواز میں کہا "چرس منگائی ہے تیرے بھائی نے — سارا پروگرام ستیاناس کر دیا — اب کون دن بتاؤں اُن کو —؟"
"ابھی کوئی نہیں — میں خود تجھے کسی دن بتا دوں گی — " اتنا کہہ کر سعیدہ نے دروازہ بند کر دیا۔
دوسرے دن فتح شیر کی فرمائش پر جب راجہ اُٹھ کر جانے لگا تو اُس نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا "اب ہمارے گھر میں بجلی لگ گئی ہے۔ گیس آگئی ہے۔ نلکا بھی لگ ہے تو کب تک اپنی جیب کا بوجھ ہلکا کرتا رہے گا — پھر اس نے بیوی کو آواز دی اور قریب آنے پر کہا "راجہ کو بیس روپے دے دے۔"
انکار کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ اتنا کہہ کر چلی گئی کہ پھا ماں سے لاکر دیتی ہوں۔
فتح شیر کو آئے ابھی ہفتہ دس دن ہی گزرے تھے کہ اس کی آؤ بھگت میں مہینہ بھر کا خرچہ اُٹھ گیا۔ چرس گانجے کا صرفہ الگ — بھرجائی اور سعیدہ ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ جاتیں۔ بات ہونٹوں کی سرحد پار نہیں کرتی تھی۔
فتح شیر گانجے کے نشے میں دھت ہو کر سو رہا تھا اور وہ تینوں عورتیں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ ماں نے تاسف بھرے لہجے میں کہا "اس کے آنے کی دعا مانگی تھی کہ آئے گا تو گھر کا ڈھکڑا پہلے کی طرح چلنے لگے گا۔ مگر یہ تو جیل سے اور بگڑ کے آیا ہے — "
"ہاں — بھائی کا مسئلہ نہیں ہے۔ ان کی ضرورت تو بیس پچیس روپے کی ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کل پہلی ہے اور بیگماں کی اور رکانی کی فیس جانے کی ہے — "
"ہاں گھر کے بھانڈے بھی منہ باندھے بیٹھے ہیں — "
"اب ان سب باتوں کا کچھ نہ کچھ علاج تو کرنا ہی ہوگا۔"
"اگر تم لوگوں کا مشورہ ہو تو میں چلی جاؤں — " بھرجائی نے کہا۔
"نہیں — وہ تو خواب میں بھی تجھے ہی آواز دیتا ہے — چل سعیدہ — تیاری کر لے — "
سعیدہ کو تیاری کیا کرنا تھی۔ اُجلی ساڑی لپیٹی۔ ہلکا سا روج پاؤڈر ملا۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک پھیری — راجہ تیار بیٹھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بات کئے بغیر آگے پیچھے گھر سے نکل گئے۔

تین گھنٹے بعد واپسی ہوئی — اور اب وہ چوکھٹ کے سامنے پتھر پر بیٹھی اپنی انگلی پر چادر کا کونا لپیٹ اور کھول رہی ہے۔

سعیدہ مرنے کے لیے تیار تھی۔ اگر فتح شیر جاگ رہا ہے تو یقیناً گھر میں قدم رکھتے ہی اس کا گلا دبوچ لے گا — تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی — سات برس جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں گزارنے کے بعد ایک مہینہ بھی تو اُس نے کھلی فضا میں سانس نہیں لی ہے۔

سعیدہ نے بہت آہستہ سے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ بھرجائی نے پل بھر میں دروازہ کھول دیا اور سعیدہ کے پوچھنے سے پہلے کہا: "وہ ابھی تک سو رہے ہیں!"

سعیدہ کی جان میں جان آئی۔ وہ دبے پاؤں اپنے کمرے کا زینہ چڑھنے لگی، اُسی وقت فتح شیر کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی — "کون ہے؟ سعیدہ —!"

سعیدہ جہاں تھی وہیں اس کے قدم جم گئے۔

بھرجائی نے فتح شیر کے پاس پہنچ کر بہت ہی ناز نخرے کے ساتھ اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور سرگوشی بھرے انداز میں کہا: "کوئی نئیں — تسی سو جاؤ —"

فتح شیر نے ایک جھٹکے سے بھرجائی کے بازوؤں کا حلقہ توڑ کے پھر آواز لگائی: "سعیدہ — اِدھر آ —"

سعیدہ کے لیے دو تین زینے اُترنے ایسے ہو گئے جیسے وہ موت کے پاتال میں اُتر رہی ہو — فتح شیر اپنی بیساکھی بغل میں دبا کر اُٹھ کھڑا ہوا — سعیدہ کو اُس کے مضبوط پنجوں کا اندازہ تھا۔ ان پنجوں میں بڑی بھاوج کا منکا لمحہ بھر میں ٹوٹ گیا تھا — سعیدہ نے غیر ارادی طور پر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن چھپا لی۔

"کہاں جا رہی تھی —؟" بڑی ملائمت سے پوچھا گیا۔

"اپنے کمرے میں —" مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"اِدھر آ — میرے قریب —"

سعیدہ کے لیے دو قدم اُٹھانے دوبھر ہو گئے۔ شاید مرنے والوں کا سارا بوجھ اُن کے پیروں میں سمٹ آیا ہے۔

"ڈرتی کیوں ہے — بھائی ہوں تیرا —"

اُس نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ سعیدہ کے سر پر رکھا اور اپنی آواز میں جتنی نرمی سمیٹ سکتا تھا اتنی مٹھاس کے ساتھ بولا — "میں اپاہج ہوا ہوں — مرا نہیں — تیرا بھائی ہوں — اس گھر کا مرد ہوں — سارا خرچہ اُٹھانا میری ذمہ داری ہے — آج کے بعد سے تو مجھ سے پوچھ کر جائے گی اور واپسی میں ساری رقم بھی میرے ہاتھ پر رکھے گی — سمجھ رہی ہے نا — لا — کتنے روپے لائی ہے —؟"

سعیدہ جب سکتے سے نکلی تو اُس نے اپنے بلاؤز میں ہاتھ ڈال کر تمام روپے نکالے اور گھر کے ذمہ دار مرد کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیئے —!

تابعدار

شکیلہ رفیق

کئی فٹ پڑی ہوئی برف پر شلوار سوٹ میں ملبوس، اسنو شوز کے ساتھ، ڈھیروں گرم کپڑے پہنے جب وہ سیئرز کے شاپنگ مال میں داخل ہوئی تب اسے کراچی کا طارق روڈ ٹوٹ کر یاد آیا۔ جہاں کی سردیوں میں ایک شال ایک ہی کندھے پر ڈال لینے سے سردی نے کہاں غائب ہو جاتی تھی اور وہ مزے سے گھنٹوں دنیا جہاں کی خریداری کیا کرتی تھی۔ یہاں تو یہ فکر لاحق ہو جاتی کہ واپسی تک ٹھنڈ مزید بڑھ جائے گی اور راستے سامان کے ساتھ، اس حالت میں بسوں کی تبدیلی ۔۔۔۔ وہ تو شکر ہے کہ ٹی ٹی سی (ٹورانٹو ٹرانزٹ کارپوریشن) کا نظام اتنا عمدہ ہے کہ سفر کے دوران ان دقتوں اور آفتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو وہاں کی منی بسوں کا خاصہ ہے۔

سیئرز سے سردیوں کے تمام کپڑے معہ لوازمات پھر فوڈ سٹی سے ماہانہ جنس کی مکمل خریداری کے بعد اسے یوں محسوس ہوا کہ اگر اب وہ یہ تمام بوجھ اٹھا کر دو بسیں بدل کر گھر گئی تو ۔۔۔۔۔۔ جوزی دنیا میں وقت سے پہلے ہی آ دھمکے گا۔ لہٰذا اس نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ کرایہ آٹھ ڈالر سے کم نہیں بنے گا ٹیکسی روکی اور تمام سامان اس میں لاد دیا۔ سیٹ پر ڈھیر ہوتے ہی وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی "ہنہ! آٹھ ڈالر کیا میری جان سے بڑھ کر ہیں؟"

ڈرائیور کو کرایہ ادا کرتے ہوئے اور HAVE A NICE DAY کہتے ہوئے اس کی نگاہ اچانک آصف پر پڑی جو تالا کھول کر گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے اسے پکارا۔ وہ مڑا، آنکھیں سکیڑ کرات اور گروسری کو دیکھا "یار! میں تو بہت تھکا ہوا ہوں۔"

"میں تم سے زیادہ تھک چکی ہوں پلیز!" اس نے ملتجیانہ کہا۔ جواباً وہ تھکے اور بھاری قدموں سے سامان کی جانب آنے لگا۔ وہ مطمئن ہو کر اندر چلی گئی۔

گرم کوٹ اور دیگر لوازمات کے ساتھ بھاری اسنو شوز اتارتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پتنگ کی مانند ہلکی پھلکی ہو گئی ہو کاش یہ پتنگ بند گھروں سے باہر بھی اڑ سکتی، اس نے تمنا کی اسی وقت آصف کو سامان کے ساتھ لدا پھندا آتے دیکھ کر اس نے تعاون بھرے لہجے میں کہا "بس بس ۔۔۔ تم سب چیزیں وہیں ہال وے میں رکھ دو ۔۔۔ میں تھوڑی دیر میں سب کچھ جگہ پر رکھ دوں گی۔"

اور ۔۔۔ آصف نے فوراً اس کا کہنا مان لیا۔

وہ تمام سامان مقررہ جگہوں پر رکھ کر کافی بنا کر، دونوں پیالیاں ہاتھوں میں تھامے LIVING ROOM میں آئی تو وہ قالین پر چت پڑا چھت کو تک رہا تھا ۔۔۔ پیالی اس کے پہلو میں رکھ کر وہ اس کے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔ پھر اس کی خلا میں گھورتی نگاہیں دیکھ کر بولی "کیا بات ہے؟"

"بات کیا ہو گی یار! اس ریسیشن نے تو زندگی بالکل عذاب بنا دی ہے" وہ گھسٹ کر اٹھا اور صوفے سے پشت لگا کر بیٹھ گیا پھر بولا "ادھر تم ۔۔۔۔"

"کیا تم؟"

"اس پر تم ٹیکسی کر کے آئی ہو!"

"آتی نہیں ہوں آج آگئی ہوں۔" آصف کا یہ جملہ اسے بہت بُرا لگا، مگر کافی کے تلخ گھونٹ کے ساتھ ہی وہ اسے بھی حلق سے نیچے اتار گئی اور پھر دھیمی ہو کر بولی "جب میں کہتی ہوں تم مجھے بھی جاب کرنے دو تو تم ......"

"جاب ہے کہاں؟ یہاں بڑے بڑوں کو جاب نہیں مل رہی تو تمہیں کون دے گا اور پھر تم ... کیا کر سکتی ہو اس حالت میں؟"

"کیوں؟ یہاں کی عورتیں تو PRAGNANCY میں بھی جاب کرتی ہیں، پھر میں کیوں نہیں کر سکتی؟"

"اتنا سا سامان تک تو تم اُٹھا نہیں سکتی ہو تم؟"

"سامان اُٹھانے سے جاب کا کیا تعلق؟"

یہ پاکستان نہیں ہے عنیزہ! یہاں افسر جو کام بھی کہے گا تمہیں کرنا ہوگا، تم اس سے یہ عذر نہیں کر سکتیں کہ کام میرے بس کا نہیں .... ہمیں ڈالر دیتے ہیں یہ تو واقعی خون پسینے کے دیتے ہیں ..... ہر ایک کو آفس ورک تھوڑی مل جاتا ہے یہاں۔" آصف نے کہا تو عنیزہ نے عجیب نگاہوں سے اسے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں پھر چند ساعت کے لئے دونوں خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر بعد وہ منمنائی "کیسا شوق تھا یہاں آنے کا؟"

"دیکھو!" اس نے انگلی اٹھائی "اس موضوع کو اس وقت نہ چھیڑنا ورنہ بہت بُرا ہوگا۔"

عنیزہ نے دیکھا، اس کا چہرہ سرخ ہو کر زنگ آلود ہونے لگا تھا ــــــ وہ وہاں سے اُٹھ گئی، پھر کچن میں جا کر کھانا بنانے لگی۔

سچی بات تو یہ تھی کہ دونوں ہی کنیڈا جیسے ملک میں خوش نہ تھے۔ مگر اب ان کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا، کشتیاں وہ جلا آئے تھے اور ــــــ تیرنا انہیں آتا نہ تھا ــــــ آصف کو آٹھ برس قبل بڑی شادی شدہ بہن نے اسپانسر کیا تھا ــــــ پھر تعلیم کی تکمیل کے ساتھ ہی اسے شہریت بھی حاصل ہو گئی ــــــ ساتھ ہی گھر گھر PIZZA پہنچانے کی جاب بھی مل گئی۔ مگر بے حد کوششوں کے بعد بھی جب کوئی اچھی ملازمت نہ مل سکی تب اس نے وطن واپسی کا فیصلہ کر لیا اور پھر اس پر فوری عمل بھی کر ڈالا۔

غیر ملک میں مقیم ہر لڑکے کی طرح اس کی مانگ بھی وطن میں بہت بڑھ گئی تھی، بلکہ لوگ تو لڑکیوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دینے کو تیار تھے ــــــ مگر سب باتیں طے ہو جانے کے بعد جب لڑکی والے یہ سنتے کہ وہ واپس نہیں جائے گا تو ان کے منہ لٹک جاتے۔ لڑکیوں کو باہر جانے کا ہوکا جو ہو گیا تھا۔

خوب کھنگالنے کے بعد اسے عنیزہ پسند آگئی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی آنکھیں، نیلم کی بنی ہوئی کٹوریاں ــــــ آخر سب کچھ طے ہو گیا اور جونہی تمام باتیں طے ہوئیں، اسی وقت عنیزہ کی ماں نے صاف کہہ دیا "عنیزہ کو تو بچپن سے ہی امریکہ، لندن، کنیڈا، فرانس جیسے ملکوں میں رہنے کا شوق ہے۔"

"مگر آصف تو اب یہیں رہے گا۔" باپ نے کہا۔

"تمہیں واپس وہیں جانا ہوگا بیٹے!" وہ باپ کی بجائے براہِ راست آصف سے بولی۔

"لیکن ہمارا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ ہم اس کے بغیر کیسے رہیں گے؟" اب ماں نے کہا۔

"یہ مسئلہ آپ لوگوں کا ہے ... اس کا حل بھی آپ ہی جانیں۔" اس جملے میں انکار صاف جھلک رہا تھا ــــــ ماں ابھی کچھ کہتی ہی کہ آصف نے ماں کو مزید کچھ نہ بولنے کا اشارہ کیا ــــــ (وہ نیلم کی بنی ان دو ننھی منی کٹوریوں میں قید ہو چکا تھا) اور رشتہ پکا ہو گیا۔

عنیزہ کو تو باہر جانے کا شوق تھا ہی مگر اس کی ماں کو جنون تھا جس نے ایک اوسط سے بھی کم گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ پھر بیاہ کر بھی ایسے ہی گھر اور ماحول میں گئی۔ اس کی تمام زندگی مشقت کرتے اور تنگ ہاتھوں کے ساتھ گزری تھی ــــــ ان چیزوں نے اسے خواب دکھانے

ع کر دیئے تھے اور اب اپنے خوابوں کی تعبیر وہ عنیزہ کی شکل میں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عنیزہ بھی زندگی کو اسی طرح ارزاں گزار دے جیسی اپنے
ا اس نے گزار دی تھی۔ پھر اس کے بعد اس نے بچپن سے ہی عنیزہ کے ذہن میں یہ بات پکے رنگوں کی طرح منعکس کر دی تھی کہ خوابوں کی تعبیر وہیں
ہے "میں نے زندگی میں کوئی عیش نہ کیا، اگر تم ضرور کروگی۔" ماں کہتی تو عنیزہ کی خوبصورت آنکھیں جگمگا اٹھتیں —— آخر جیت لڑکی والوں
ں ہوئی۔ "ہم نے تو یہ عرصہ کسی نہ کسی طرح تنہا رہ کر اس امید پہ گزار لیا تھا کہ جب تم کسی قابل ہو جاؤگے تب ...... مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ہمیں اب
تنہا ہی رہنا ہے۔ بہر حال ......" باپ نے بات ادھوری چھوڑ کر آصف کو عینک کے شیشوں کے پیچھے سے جھانکا۔ جس کی واپسی میں اب
روز ہی باقی رہ گئے تھے۔

"اب کیا کیا جائے ابا! لڑکی مجھے پسند آگئی تھی۔" آصف نے کہا پھر اس کے لہجے میں برہمی عود کر آئی۔ "بڑھیا بھی بڑی چالاک ہے جب
ب طے ہو گیا تب یہ شرط لگا دی۔"

عنیزہ میکے گئی ہوئی تھی جبھی گفتگو کا یہ رنگ تھا۔

"بہر حال میں آپ لوگوں کو جلد اسپانسر کر دوں گا۔"

"پہلے تو بیوی کو بلاؤگے؟" ماں کے لہجے میں طنز کڑی دھوپ کی مانند نمایاں تھا —— نہ جانے بیٹے کے نکاح میں آتے ہی ماؤں کو اس چہرے
دھبہ کیوں نظر آنے لگتا ہے جو چند روز قبل ہی چاند کا ٹکڑا ہوا کرتا تھا۔ آصف نے ماں کے طنز کو نظر انداز کرنے میں ہی عافیت جانی اور بولا "عنیزہ کا
ریبا سب کام مکمل ہی ہے وہ تو چند ماہ بعد آ ہی جائے گی۔ بس پھر اس کے بعد آپ لوگ ......"

"مگر ہم وہاں کب آنا چاہتے ہیں؟" باپ نے بات کاٹ دی۔

"پھر اس مسئلے کا کوئی حل آپ ہی بتا دیجئے۔"

آصف کی بات کا جواب اب کے ماں نے دیا۔ "تم ان کی ماں سے صاف صاف کہہ دو کہ میں واپس نہیں جانا چاہتا۔"

"مگر امی! یہ تو وعدہ خلافی ہوئی ...... اگر کہنا تھا تو اسی وقت کہتے۔"

"اس وقت کیسے کہتے؟ اس وقت تو تم اس کی آنکھوں کے سحر میں گرفتار تھے۔" ماں نے ناگواری سے کہا۔ پھر بولی "دوسرے انھوں نے کون سا
ایمانداری سے کام لیا ہے ..... جب سب کچھ طے ہو گیا تھا، اٹھا کے شرط لگا دی —— شروع میں ہی کہتیں تو زبان سے ایسے الفاظ نکلتے ہی ہم انکار کر دیتے"
ں اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ "ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے اس میں، بہت پڑی ہیں اس سے لاکھ درجے اچھی اور دیتے بھی سر آنکھوں پر وہ بھی ہماری
ی تمام شرطیں مان کر۔"

"امی ان سب باتوں سے اب کیا حاصل؟"

"ہے — کیوں نہیں ..... کہہ جو رہی ہوں ..... ان کی بات ماننے سے انکار کر دو۔"

"ایسا تو میں اب نہیں کر سکتا۔"

"اچھا! —— تو ہو گئے چار دن میں ہی جورو کے غلام؟"

"ٹھیک ہے ..... طلاق دے دیتا ہوں پھر ......"

"کیا بیکار باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو تم!!" اب ابا نے دخل دیا۔ "ٹھیک تو کہہ رہا ہے ..... جو ہو گیا —— یہ سب باتیں تو پہلے سوچنے کی تھیں .....
ے جانے دو ..... ہمارا کیا ہے ..... اوپر والا سب سے بڑا ہے ..... گزار لیں گے جیسی بھی ......"

شکستہ لہجے میں کہے گئے ان الفاظ میں پوشیدہ طنز کو آصف نے بہر طور محسوس کر لیا۔ پھر بھی وہ رسان سے بولا "میں کہہ جو رہا ہوں کہ
ب لوگوں کو جلد وہاں بلا لوں گا ..... آپ لوگوں کی سمجھ میں پتہ نہیں کیوں میری بات نہیں آ رہی۔"

"ٹھیک ہے ـــــ تم جیسا مناسب سمجھو کرو۔ تمہاری ماں تو یونہی جذباتی ہو جایا کرتی ہے ـــ" باپ نے گویا موضوع ہی ختم کر دیا۔
مگر ـــــ ماں کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔
"جب ہم آنا ہی نہیں چاہتے تو کیوں کیے جا رہے ہو، بلا لو گے؟"
اب کے آصف سمجھانے والے انداز میں بولا "آپ لوگوں کے پاس خاصا وقت ہے ...... ابھی تو اسپانسر کروں گا... پھر سال ڈیڑھ سال اس کے مکمل ہونے میں لگے گا ـــ اس دوران آپ لوگ خوب سوچ لیجئے گا ...... اگر نہیں آنا چاہیں تو ...... منع کر دیجئے گا" اس نے بات ختم کی اور کسی اگلے سوال کی آمد سے قبل ہی کمرے سے نکل گیا۔

اچانک ہی، کھٹاک کی آواز سے، ماضی کی تنگ گلیوں سے کھینچ کر حال کی کشادہ سڑک پر لے آئی ـــ وہ اٹھ کر کچن میں گیا ـــ جہاں عنیزہ کھلے فریج کا کواڑ پکڑے ٹوٹے ہوئے انڈوں کو دیکھ رہی تھی ـــ وہ اسے بازو سے پکڑ کر قریبی کرسی پہ بٹھاتے ہوئے بولا "کمال کرتی ہو تم بھی! ہر کام ایک ہی وقت میں نمٹانے کی پڑی رہتی ہے تمہیں!"
"پھر کون کرے گا؟"
"مجھے آواز دے لیتیں میں HELP کرا دیتا۔"
"تمہیں اپنی ذات سے فرصت ملے تو کسی اور کے بارے میں سوچو۔" عنیزہ کا لہجہ کاٹ دار تھا۔
"سو بار منع کیا ہے طنز نہ کیا کرو ...... اور بہت پڑے ہیں طنز کرنے والے، تم تو پیار سے بول لیا کرو۔" یہ کہہ کر وہ پیپر ٹاول سے زمین پر گری انڈوں کی زردیاں سمیٹنے لگا۔
"ہنھ، پیار سے بولا کروں ـــ باورچن، دھوبن، ماسی، جمعدارنی حتیٰ کہ گھسیارن تک تو بن کر رہ گئی ہوں ـــ یہاں آنے کے بعد ..... اتنی مصروفیات کے درمیان پیار کی گنجائش ہی کہاں نکلتی ہے۔ اکیلے کام کر کر کے میرا تو برا حال ہے ..." وہ اٹھ کر بڑبڑاتی ہوئی خواب گاہ میں چلی گئی۔
آصف باقی چیزیں مقررہ جگہوں پر رکھتے ہوئے بہت دور ماضی میں ایک بار پھر جا پہنچا ـــ وہاں، گزرے وقت کے ان لمحوں میں، جب والدین اس کے اصرار پر یہاں آگئے تھے اور عنیزہ نے اس کی ماں کے ساتھ نوکروں سے بھی بدتر سلوک کیا تھا ـــ جبکہ ماں نے آتے ہی پوری گھرداری سنبھال لی تھی اور باپ بھی برف ہٹانے سے لے کر گھاس کاٹنے تک میں اس کی مدد کرتا تھا۔ مگر ـــ پھر بھی عنیزہ کی تیوریوں کے بل کم نہ ہوتے تھے ـــ اچانک اس کے پیٹ میں بھوک کا گولہ اٹھا ـــ وہ جلد از جلد کام سمیٹ کر PIZZA کا آرڈر کر کے کمرے میں آگیا۔ اس وقت وہ کچھ یاد نہ کرنا چاہتا تھا۔
وہ اس کے برابر لیٹ کر بولا "میں نے PIZZA آرڈر کر دیا ہے۔"
"اب کون کر رہا ہے خرچہ؟"
"پھر کیا کرتا؟"
"تم کم از کم آملیٹ تو بنا سکتے تھے۔"
"میں اس وقت صرف اپنے بھیجے کا آملیٹ بنا سکتا ہوں .... ہنھ!"
اسے اس قدر جھنجھلایا ہوا اور بیزار دیکھ کر اب اس نے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی اور خود بھی PIZZA کا انتظار کرنے لگی۔
اطلاعی گھنٹی بجی۔ آصف نے دروازہ کھولا، نہ جانے کس ماں کا لال، تیرہ چودہ برس کی ہتھیلیوں پر پیزا کا ڈبہ دھرے کھڑا مسکرا رہا تھا ... خالص کاروباری مسکراہٹ، آصف نے بھی رسمی طور پر مسکرا کر پیسے ادا کیے، ساتھ ٹپ بھی، پھر دروازہ بند کرتے ہوئے ماحول کو بدلنے کی نیت سے خوشگوار موڈ میں پکارا "عنیزہ! آجاؤ PIZZA آگیا ہے۔"

یوں بھی ماحول ہمیشہ وہی ٹھیک کیا کرتا تھا۔
دو ہی روز قبل کی تو بات تھی، عنیزہ اپنی پڑوسن کے ساتھ بیرونی گیلری میں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ یہ ایک سکھ فیملی تھی۔ سامنے کی
بُڈواک پر سکھنی کے ساس سسر ٹہل رہے تھے۔ عنیزہ نے ایک نگاہ ان پر ڈالی پھر پڑوسن سے منہ بنا کر بولی "ان لوگوں کے یہاں ساتھ
رہنے سے کام کتنا بڑھ جاتا ہے اور خرچے کا تو حساب ہی نہ پوچھو"
"نہیں بہن جی...... ہمارے گھر تو اُلٹا ہو رہا ہے"
"اچھا—!! وہ کیسے؟" عنیزہ نے بے یقینی سے پوچھا۔
"وہ ایسے کہ جب یہ لوگ آئے تو میری [illegible] نے آتے ہی گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔ اس کی وجہ سے جاب سے آنے کے بعد پکا پکایا کھانا ملتا تھا۔
اور یہ مزے ابھی تک ہیں"۔ اس نے بتایا تو عنیزہ کا ذہن ماضی کی جانب چلا گیا جب آصف کی ماں نے بھی اسے گھر کے کاموں سے آزاد کر دیا تھا اور
وہ سارا سارا دن وی سی آر پر فلمیں یا پھر ٹی وی دیکھا کرتی تھی۔
"مگر دو سے چار ہو جائیں تو خرچہ......"
"خرچہ بڑھنے کی بھی بات نہیں ہے— حکومت ہر مہینے دونوں کے چیک بھیجتی ہے..... اچھی خاصی رقم ہوتی ہے وہ" پھر اس کی آواز مدھم ہو گئی
"اری بہن ان کا خرچہ ہی کیا ہے.... کھانے کا ہی ہے.... باقی تو سب ہم لوگوں کے ہی کام آتا ہے.... اچھا خاصا دیتی ہے سرکار ان بڈھوں کو...
اور ہم تو بس...." وہ حسب عادت اپنی گفتگو میں خود ہی محو تھی اِدھر عنیزہ جانے کس سوچ میں گم تھی۔
"گھر میں کتنا سناٹا رہتا ہے"۔ کوک کا گھونٹ لیتے ہوئے عنیزہ نے کہا۔
"وہ تو ہے.... مگر بس کچھ مہینوں کی بات ہے۔ پھر......"، آصف مسکرایا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ پھر فضا میں گھونٹ لینے اور کھانا کھانے کی آوازیں
اُبھرتی رہیں۔
کچھ دیر بعد عنیزہ نے آصف کو دیکھا پھر معمول کے لہجے میں بولی "امی ابا کو بلا لو نا!"
"آں؟؟" وہ چونک اُٹھا۔ اسے عنیزہ اور اس کا جملہ دونوں ہی بے حد اجنبی لگے۔
"ہاں" وہ پھر مسکرائی مگر وہ— ماضی کے دھندلکوں میں بھٹکنے لگا تھا۔
جب وہ دونوں یہاں تھے— اور عنیزہ کو یہ بھی گوارہ نہ تھا کہ آصف ماں باپ کو پیار سے دیکھے، ان کا خیال کرے، ان کی محبت میں کچھ خرید لائے
...... ایسا کچھ بھی وقوع پذیر ہوتے ہی اس کا موڈ آف ہو جاتا جیسے وہ کبھی سر درد، کبھی تھکن کا غلاف پہنا کر بستر پر پڑ جاتی۔ پتھر پر پانی کا ریلا گرے تو وہ
پتھر کا کچھ نہیں بگاڑتا— تیزی سے بہہ کر آگے گزر جاتا ہے مگر..... قطرہ قطرہ.... اس میں سوراخ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ سو وہ بھی پوری مشاقی
سے قطرے گرا رہی تھی۔ وہ نامعلوم طریقوں سے، غیر محسوس انداز سے آصف کو باور کراتی رہتی کہ ان دونوں کے آ جانے سے گھر میں سوائے اخراجات
بڑھ جانے کے اور کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے— پریشانیاں اور مسائل گھٹے نہیں ہیں— بڑھ گئے ہیں— اس کا شمار عورتوں کے اس قبیلے سے تھا جو
دشمن کو میٹھی چھری سے قتل کرتی ہیں تاکہ مقتول زندگی کے آخری لمحے بھی اپنے لبوں پر موت کی تلخی سے زیادہ زندگی کی شیرینی کو محسوس کرے۔
آخر ساڑھے تین سال کا طویل عرصہ گزار کر وہ دونوں مقتول اپنے وطن لوٹ جانے کا فیصلہ کر کے آخری بات چیت کے ارادے سے
آصف کے پاس پہنچے۔ "اب ہم یہاں سے واپس جانا چاہتے ہیں"
کتاب کے پیچھے چھپا آصف کا چہرہ سنولا کر دھواں دھواں ہو گیا— "کیوں؟" اس نے خود پر قابو پا کر کتاب ہاتھ میں تھام لی۔
"بس...... اب ہمارا دل یہاں نہیں لگ رہا"
ماں بھی عورت ہی تھی عنیزہ کے چلے ہوئے ہر مہرے کو وہ اپنی ماہرانہ چال سے مات دے سکتی تھی مگر...... ماں بچوں کی زندگیوں میں امرت

گھومتی ہیں۔۔۔۔ذہر نہیں لہذا وہ بوبی تمہارا ہی اصرار تھا کہ قومیت نئے بغیر نہ جائیں سو وہ بھی مل گئی بس۔۔۔۔اب اور رہ کر کیا کرنا ہے ؟"

آصف نے پہلے باپ کی جانب دیکھا جو سر جھکائے لکڑی کے فرش کو یوں تک رہا تھا گویا اندر جانے کا راستہ تلاش کر رہا ہو۔۔۔۔پھر عنیزہ کی جانب نگاہ اٹھائی، جو اپنے چہرے کے سارے تاثرات نہایت خوبی سے چھپا کر صرف متعجب سی نظر آنے کی کامیاب کوشش کر رہی تھی۔

"تو آپ لوگ یہاں صرف اسی لئے آئے تھے ؟" آصف صرف یہی کہہ سکا۔

"ہم لوگ تو صرف اسی لئے نہیں آئے تھے، ہم نے تو آنے کے دوسرے مہینے ہی جانے کی بات کی تھی، تمہی نے اصرار کیا تھا کہ شہریت کے لئے رک جائیں۔ کیا یاد نہیں تمہیں" ؟ باپ نے بڑا تفصیلی جواب دیتے ہوئے آخر میں پوچھا۔

"جی صاحب کے پھر وہ اسی قدر کہہ سکا اور دوبارہ عنیزہ کو دیکھا ـــــ مگر۔۔۔۔۔ وہ تو صنم بکم کی تصویر بنی بیٹھی تھی ـــــ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ عنیزہ بچوں کی طرح ضد کر کے اس کے والدین کو روک لے۔۔۔ پر ـــــ وہ ـــــ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ سمجھنا نہ چاہتی تھی۔ پھر ہلکی سی بحث کے بعد یہی فیصلہ ہوا کہ وہ لوگ واپس چلے جائیں۔ والدین جان گئے تھے کہ اب ان کا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔ وہ کچھ نہ بول سکا کہ۔۔۔۔ اب وہ بھی سب کچھ جان چکا تھا۔

اور آج ـــــ وہی عنیزہ کہہ رہی تھی کہ انہیں بلا لو۔۔۔ آصف نے بغور اسے دیکھا ـــــ وہی تھی نا جس نے ان کی واپسی کا سن کر گھنگھے کا گڑ کھا لیا تھا ـــــ اس نے یقین کرنے کے لئے پوچھا "کیا کہہ رہی ہو تم ؟"

"ہاں آصف !۔۔۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔۔۔ تم ایک ہی تو اولاد ہو ان کی۔۔۔ وہ بھی تنہا ہیں اور۔۔۔۔ اور پھر اب تو وہ دادا دادی بھی بننے والے ہیں !"

آصف کو اس کا لہجہ اجنبی لگا ـــــ مگر چہرے پر خلوص کی پرچھائیاں تھیں اور نیلم سے بنی آنکھوں میں پیار کی چمک ـــــ وہ ایک دم ہی خوش ہو گیا "تم۔۔۔۔ کتنی اچھی ہو عنیزہ !"

"ہوں۔۔۔ کتنا خوش ہوں گے وہ جوزی کو باہنوں میں لے کر !"

"ہاں۔۔۔۔ ہم دونوں انہیں بلانے کی کوشش کریں گے !"

"گھر میں بزرگوں کی موجودگی سے الگ ہی رونق ہوتی ہے۔۔۔۔ سچی کتنا اچھا لگے گا آپ کو بھی اور مجھے بھی ان کے آجانے سے !"

"ہاں سچی !"

پھر کئی روز کی کوششوں کے بعد ان دونوں نے بڑی محنت سے خط کا مضمون تیار کیا۔

محترمی ابا اور امی جان۔ ہم دونوں کی جانب سے سلام قبول کریں۔ آپ لوگ کیسے ہیں ؟ ہم دونوں آپ لوگوں کو بہت یاد کرتے ہیں آپ کے جانے کے بعد گھر میں بیحد سناٹا ہو گیا ہے۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ ذہن آپ لوگوں سے ہٹ کر دوسری جانب لگ جائے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اب تو یہ حال ہے کہ ہم سے ایک پل بھی آپ دونوں کے بغیر گزارا نہیں جا رہا ہے۔

پچھلی بار ہم میں سے کسی سے بھی اگر کوئی کوتاہی، گستاخی یا غلطی ہوئی ہے تو اسے ہماری نادانی سمجھ کر معاف کر دیجئے اور ہمیشہ کے لئے ہمارے پاس آجائیے۔ ہمارے دل اور آنکھیں آپ کی آمد کے یوں منتظر ہیں جیسے ہم ننھے منے بچے ہوں اور۔۔۔۔ آپ کے بغیر جینے کا تصور بھی نہ کر سکتے ہوں۔ پلیز آپ لوگ جلد از جلد آنے کی حامی بھریں۔ آخر میں بہت سے مؤدبانہ سلاموں کے ساتھ ایک خوشخبری۔۔۔۔ آپ لوگ بہت جلد دادا اور دادی بننے والے ہیں ـــــ !! ہمیں یقین ہے اب آپ لوگ ایک لمحہ بھی وہاں نہ رک سکیں گے ـــــ ہے نا ! اب اجازت دیجئے۔ خدا حافظ !

آپ کی آمد کے شدت سے منتظر آپ کے تابعدار
عنیزہ اور آصف

بلّی کا بچّہ

اطہر شاہ خان

"اُلّو کا پٹھا"

کسی دور افتادہ کمرے میں ایک آواز گونجی اور میں نے فرائی پان ہاتھ سے رکھ دیا۔ کچن میں کھڑے کھڑے آواز کی سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔

"خیر، کوئی بات نہیں!" میں نے دل میں سوچا ـــــ "چند ہی لمحوں بعد مجھے دوبارہ پکارا جائے گا"

ـــــ ایک ایسے شخص کے لیے جس کا اصل نام "چراغ دین" ہو اس قدر نامعقول اندازِ تخاطب جسم کی رگوں میں سیال مرچیں دوڑا دینے کے لیے کافی ہے اور ایسی صورت میں تو یہ تکلیف کچھ اور بڑھ جاتی ہے جب مخاطب نہایت معزز اور تعلیم یافتہ بھی ہو، یا یوں کہیے کہ باقاعدہ اُلو کا پٹھا نہ ہو۔

میرا اصل نام چراغ دین ہے میں پڑھا لکھا آدمی ہوں، سائنس کے سبجکٹس کے ساتھ میٹرک سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا ... پھر گھریلو حالات ایسے ہوگئے کہ آگے نہ پڑھ سکا، ویسے بھی ایک ایسے شخص کے لئے جو خاندان میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا ہو ایک یہی بات خاصی طمانیت کا باعث بن جاتی ہے کہ اُسے خاندان اور قصبے کے سارے لوگ بڑے احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں

عزت کے لیے ہمارا خاندانی پس منظر بھی کم نہیں ہے۔ ابا جی بتایا کرتے تھے کہ ہندوستان پر انگریزوں کی حکمرانی کے زمانے میں ہمارے پردادا کے دادا کو ایک بہت بڑے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ یہ خطاب کس خدمت کے صلے میں ملا تھا ..... اس بارے میں ابا جی کو ٹھیک سے کچھ یاد نہیں تھا، خطاب کے لیے بھی وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ "خان بہادر" ـــ "سر" ـــ یا "شمس العلماء" میں سے کوئی تھا یا کوئی اور ہی تھا ..... لیکن خطاب ملا ضرور تھا اور یہ بات قصبے کے سب لوگ جانتے تھے کیونکہ ابا اُن لوگوں کو بھی یاد دہانی کراتے رہتے تھے جنھیں یہ بات حفظ تھی۔

ابا جی قریبی شہر میں ڈپٹی کمشنر کے قاصد تھے اور باقی سارے چپراسی اس بات پر اُن سے جلتے تھے کہ ڈپٹی کمشنر بھی نہ صرف اُن کی عزت کرتا تھا بلکہ دفتری ہدایات میں اُن کے لیے بڑے احترام کے ساتھ "سینئر قاصد" کے الفاظ لکھتا تھا ـــــ ابا جی نے بتایا کہ انھوں نے ڈپٹی کمشنر کے چارج سنبھالنے کے پہلے ہی دن انگریزوں کے خطاب والی بات علیحدگی میں بتا دی تھی

اُس پسماندہ قصبے میں ابا جی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ آتے جاتے لوگ سلام کرنے میں پہل کرتے۔ سڑک پر چلتے تو لوگ احترام اور خوف سے راستہ چھوڑ دیتے۔ احترام میں خوف کا عنصر اس لیے شامل ہوتا کہ ابا جی ڈپٹی کمشنر کے قاصد تھے اور جاننے والے

یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ڈپٹی کمشنر تک پہنچنے کے لیئے دروازے سے ہی گزرنا پڑتا تھا جہاں اباجی اسٹول پر تخت نشیں بیٹھتے تھے۔
قصبے کے لوگوں کو ڈپٹی کمشنر تک رسائی حاصل کرنے کی نوبت تو شاید ہی کبھی آتی لیکن علاقے کے تھانے سے تو شرفا کو کام پڑتے ہی رہتے تھے۔ اور تھانے میں اباجی کی وہ دہشت تھی کہ تھانیدار بھی اُن کی دوستی کو قابل فخر گردانتا تھا اور اباجی ہیڈ کانسٹیبل تک کو چپت لگا دیا کرتے تھے۔

شام کو پکے مکان کے مغلئی طرز کے دروازے کے باہر چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں بچھا دی جاتیں اور حقے کا دور چلتا تو حاضری دینے والوں اور حاجت مندوں کی قطار لگ جاتی۔ اباجی کھری چارپائی پر مخمل کا گاؤ تکیہ لگائے کسی مغل بادشاہ کی طرح فریادیوں کی دادرسی کرتے۔ چوہدریوں تک کی مجال نہیں تھی کہ اباجی کسی کام کو کہہ دیں اور وہ انکار کر دیں ــــ اباجی غریبوں کی مدد کو توشۂ آخرت سمجھتے تھے۔ اور اُن کی شاہ خرچیاں دیکھ کر اکثر حاسد قسم کے لوگوں نے یہ بات اڑا دی تھی کہ اباجی کے اللّے تللّوں میں رشوت کو بھی دخل حاصل ہے لیکن ایک دن اماں کے سامنے قسم کھا کر اباجی نے بتایا کہ وہ رشوت کو حرام سمجھتے ہیں۔۔۔۔ ہاں اگر اپنی خوشی سے کوئی کچھ دے جائے تو الگ بات ہے۔

گھر کے یہ خوشگوار مالی حالات ہی تھے کہ میں نے بڑے شہر کے اچھے اسکول میں تعلیم حاصل کی اور بھی سائنس کے سبجکٹس کے ساتھ (سیکنڈ ڈویژن) ــــ جب میں اباکو بتاتا کہ H_2SO_4 گندھک کے تیزاب کو کہتے ہیں تو وہ کافی دیر تک حیران رہتے کہ سائنس نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ لیکن یہ بھی کہتے کہ سائنسدانوں کو اتنا مشکل نام لینے کی نسبت سیدھا سادا گندھک کا تیزاب کہہ دینے میں کیا قباحت تھی؟

اکثر وہ دروازے کے باہر چارپائیوں پہ بیٹھے حاضرین کو مجھ سے نیوٹن اور سیب کے درخت والا واقعہ سنواتے اور جب میں بتاتا کہ یہ سب کچھ کششِ ثقل کی وجہ سے ہوا تھا تو حاضرین دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے اور اتنی مشکل اردو بولنے پر اباکا سینہ فخر سے کچھ اور چوڑا ہو جاتا! ــــ خود قصبے کے لوگوں کے لیئے یہ بات اجتماعی افتخار کا باعث تھی کہ میں ایک خطاب یافتہ خاندان کا چشم و چراغ ہوں اور کچھ عجب نہیں کہ آگے چل مجھے بھی حکومت کی جانب سے کوئی خطاب مل جائے!

"اُلّو کا پٹھا!"
مجھے مخاطب کرنے والا اس بار بھی کہیں دور تھا۔

اُس پسماندہ قصبے میں لڑکیوں کے لیئے تعلیم حاصل کرنا ایسا ہی تھا جیسے کسی سویرے سورج چھپ جائے اور اُس کی جگہ چاند طلوع ہو جائے لیکن قصبے کے ایک گھر میں جو مالی لحاظ سے ہمارے بعد دوسرے نمبر پر تھا یہ معجزہ ظہور پذیر ہو چکا تھا! ــــ سارے قصبے میں اگر کسی کو تعلیمی لحاظ سے میری ہمسری کا دعویٰ تھا تو وہ "رجّو" تھی۔۔۔۔۔ رجّو کو اپنے تعلیم یافتہ ہونے کا مجھ سے زیادہ غرور تھا ایک بار جب میٹرک کے امتحان سے کچھ پہلے طبیعیات کی کتاب میں سے "انعطافِ نور" کا مطلب پوچھنے کے بہانے وہ میرے گھر آئی تھی تو میری ماں کے سامنے اُس نے بڑے فخر سے کہا تھا "چاچی! پورے علاقے میں کون ہے جو ہم دونوں کی برابری کر سکتا ہے۔ لڑکوں میں تو شاید آئندہ بھی کوئی میٹرک ہو جائے پر لڑکیوں میں میرے بعد یہ خلا پُر ہوتا نظر نہیں آتا!"
پڑھا کو رجّو شہر سے رسالے اور کتابیں منگوا کر پڑھتی رہتی تھی اور اُسے بھی میری طرح مشکل اردو بولنے کا شوق تھا میری ان

ماں اگرچہ "غلو پڑہ" ہونے جیسے مشکل استعارے سمجھنے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی لیکن رجّو کے جملے کا مفہوم وہ سمجھ گئی تھی اور اُس کے چہرے پر انجانے اندیشے کا سایہ سا گزر گیا تھا ــــــــ رات کو اپنے کمرے کی اَدھ کھلی کھڑکی میں سے مجھے اباجی اور اماں کی باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی ...... اماں کہہ رہی تھیں ــــ "زیادہ پڑھی لکھی بہو خطرناک ہوتی ہے، قائم شاہ سے کہو کہ رجّو کو اسکول سے اُٹھا لے لڑکی تباہ ہو جائے گی"۔

رجّو کی ممکنہ تباہی کے صدمے کے باوجود یہ خیال میرے لیئے بے حد خوشگوار تھا کہ اماں ذہنی طور پر رجّو کو اپنی ہونے والی بہو تسلیم کر چکی ہیں ــــ!

قائم شاہ پہلے کبھی ساتھ والے گاؤں کے زمیندار کا منشی تھا لیکن کسی بڑی ہیرا پھیری کے بعد وہ اتنا خوشحال ہوا کہ اپنے گھر کے احاطے میں دو عدد کولہو بنا لیئے۔ نوکروں اور بیلوں کی مدد سے یہ کولہو دن رات چلتے تھے اور اُن کا مال شہر بھیجا جاتا تھا کچھ پڑھا لکھا ہونے، اور شہر میں زیادہ آمد و رفت رکھنے کی وجہ سے، پتلون پہننے کے باعث قائم شاہ کی ترقی پسندی کو قصبے کے لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ ایک تو رجّو کو شہر کے اسکول میں پڑھانا ہی کیا کم قیامت تھا۔ اوپر سے اُس کے گھر میں تین بینڈ کے ریڈیو پر گانوں کی آوازیں دور دور تک گونجا کرتی تھیں اور مسجد کے مولوی صاحب نے اُس راستے سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔

رجّو...... قائم شاہ کی اپنی بیٹی نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ لالچی آدمی تھا اس لیئے مولوی صاحب کا خیال یہ تھا کہ قائم شاہ نے رجّو سے شادی کے لیئے شہر میں کوئی اونچی اسامی تاڑ رکھی ہے، تبھی تو وہ بڑے گھرانے کی بہو بنانے کے لیئے رجّو کو فرنگی تعلیم دلوا رہا ہے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ قائم شاہ اپنی بیوی کی یتیم بھتیجی کو صرف اس لئے تعلیم دلوا رہا ہے کہ شہر میں نوکری کرا کے اُس کی پرورش کے خرچ کا اصل زر بھی وصول کرے اور سود بھی...... اماں بھی رجّو کے بارے میں اندیشوں کا شکار رہا کرتی تھیں۔ بھلا ایسی آفت لڑکی قصبے کے روایت زدہ لوگوں نے اب سے پہلے کہاں دیکھی تھی جو آناً فاناً بیر کے درخت پر چڑھ جائے اور ندی کے ٹوٹے ہوئے پل پر بیٹھ کر مچھلی کا شکار کھیلے۔ جب وہ آخری بار گلی کے بچوں کی فٹ بال ٹیم میں شامل ہونے کے لیئے آئی تو قریبی گھروں کی لڑکیوں نے اُس سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا...... مولوی صاحب کے نزدیک یہ قربِ قیامت کے آثار تھے اور اماں کیلیئے اُس کے خاندان کی تباہی کے...... لیکن اماں کے اندیشے قائم شاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی رجّو بیمار پڑ گئی، وہ میٹرک امتحان نہ دے سکی، اور جب ٹائیفائڈ سے صحت یاب ہو کر وہ بستر سے اٹھی تو قائم شاہ نے اُسے اسکول سے بھی اُٹھا لیا ــــ رجّو نان میٹرک رہ گئی۔ اُس کی تعلیم ادھوری رہ جانے سے مجھے خوشی سی ہوئی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ اتنی ذہین اور تیز طرار لڑکی تھی کہ امتحان دیتی تو فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوتی اور یہ بات میری خودداری کبھی قبول نہ کرتی کہ آگے چل کر جب وہ میری بیوی بنتی تو مجھ سے زیادہ قابل کہلاتی۔ لیکن اس چھوٹی سی خود غرضی کے باوجود میں نے اُسے کبھی نہ جتایا کہ وہ تعلیم میں مجھ سے کمتر ہے یعنی میٹرک (سیکنڈ ڈویژن) کے مقابلے میں نان میٹرک۔

سچی بات یہ ہے کہ میں اُس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ وہ بہت حساس لڑکی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ مذاق میں بھی کوئی نوکیلا لفظ اُس کے احساسات کو مجروح کر دے ــــ تعلیم ادھوری رہ جانے سے پہلے اُس کے ارادے بہت بلند تھے۔ معمولی سے قصبے کی وہ لڑکی افسانے پڑھ پڑھ کر بہت شہری قسم کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ اُسے اس بات کا گہرا احساس تھا کہ بچپن میں اُس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد پھوپھی اور پھوپھا نے اس کی پرورش کی ہے تو مستقبل میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اسے ڈاکٹرنی بننا ہے تب وہ بہت سا پیسہ کما کر پھوپھا کے کولہوؤں کی جگہ بیلوں سے تیل نکالنے کی مشین لگوا دے گی اور یوں اُن کے احسانات کا بوجھ

قدرے کم ہو جائے گا...... لیکن یہ منصوبہ تشنۂ تکمیل رہے۔

رجّو کو اسکول سے اٹھائے جانے کا بے حد افسوس تھا۔ شہر کے اسکول کی سہیلیوں سے ملنے کے لیے پھوپھا کے ساتھ وہ اب بھی اکثر شہر چلی جایا کرتی اور ایک بار اُس نے مجھے بتایا کہ شہری سہیلیوں نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ پھوپھا نے جو اس کی تعلیم چھڑائی ہے تو اس میں کوئی رمز پوشیدہ ہے۔

ہمارے گھر آنے جانے کے لیے رجّو کوئی خوبصورت بہانہ تلاش کر لیا کرتی تھی...... کبھی میرے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے باغ سے چوری کیے ہوئے امرود لے آتی۔ کبھی ابا کے گھٹنے پر مالش کرنے کے لیے سرسوں کا خالص تیل اور کبھی میرے لیے نیم کی شاخ کی مسواک لے آتی اور کبھی اماں کے لیے کوئی خاص پکوان!...... پچھلی بار وہ اماں کے لیے میٹھی ٹکیاں لے کر آئی تھی کیونکہ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ کالج میں داخلے کھلنے سے پہلے ہی میں کئی کتابیں خرید کر لے آیا ہوں ــــ اُس کی آہٹ سنتے ہی میں نے فزکس کی کتاب کھول لی تھی جو انگریزی تھی...... میں نے اُس کی آنکھوں میں اپنے لیے برتری اور احترام کا جذبہ دیکھا! اُس نے پہلی بار مجھے "چراغو" نہیں کہا..... کہنے لگی ــــ "چراغ دین! میں چاہتی ہوں کہ تم آگے چل کر انجینئر بنو، پھر تم ندی پر ٹوٹا ہوا پل بنوانا!"

"انجینئر تو میں بھی بننا چاہتا ہوں!" ــــ میں نے پُرعزم لہجے میں کہا...."لیکن میری خواہش ہے کہ اس جاہل قصبے میں ایک بڑے اسکول کی تعمیر سب سے پہلے میرے ہاتھ سے ہو!"

اُس کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا ــــ "تب تو پورے علاقے کے ہیرو بن جاؤ گے تم!"

بس اسی بات سے مجھے اُلجھن ہوتی تھی...... یہ ہیرو کون ہوتا ہے سارے اچھے کام کرنے والا؟ لیکن رجّو کی عادت تھی کہ ہر مسئلے میں ہیرو اور ہیروئن کو ضرور لے آتی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ کبھی کبھی شہر میں اپنی سہیلی نائلہ کے گھر رہنے کے لیے جاتی تھی اور اُس آزاد خیال گھرانے میں چند دن قیام کے دوران اُسے اس فیملی کے ساتھ سینما جا کر فلمیں دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

میں نے کبھی کوئی فلم نہیں دیکھی تھی اور رجّو اکثر مجھے بتایا کرتی تھی کہ ہیرو کیا ہوتا ہے۔ "نہایت وجیہہ، تعلیم یافتہ، اسمارٹ، ناممکنات کو ممکن کر دینے والا دلیر شخص، جس کے ارادے چٹان کی طرح مضبوط ہوتے ہیں اور طوفانوں سے ٹکرا جاتا ہے۔"

تعلیم یافتہ اور مردانہ وجاہت کا نمونہ تو خیر میں بھی تھا لیکن ٹکرا جانے کے لئے طوفان کہاں سے لاتا..... جبکہ رجّو کسی ہیرو کی طرح میری پرستش کرنا چاہتی تھی۔ مجھے ویسا ہی ذہانت کا پُتلا، دلیر، پُرعزم اور فولادی دیکھنا چاہتی تھی جیسا اُس کی تصوراتی دنیا کا ہیرو تھا،

ہم دونوں دروازے کی ڈیوڑھی میں کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ پٹواری نے دستک دی، رجّو تو فوراً کھسک گئی اور مجھے اس دخل درمعقولات پر اتنا غصہ آیا کہ میں نے باہر نکل کر زندگی میں پہلی بار گالی دی ــــ احتیاطاً انگریزی میں! پٹواری بے چارہ کچھ نہ سمجھا لیکن یوں انگریزی میں گالی دیتے ہوئے ایک تکبر سا مجھے اپنی آواز میں محسوس ہوا۔ شاید یہ اُس تعلق کی وجہ سے ہو جو انگریزوں کا ہمارے خاندان سے تھا لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے خود بھی حیرت ہوئی کہ مجھ جیسے تعلیم یافتہ، مہذب اور خاندانی شخص سے یہ حرکت کیسے سرزد ہوئی؟؟ گالی ہی تو ایک ایسی چیز تھی جس سے مجھے دلی نفرت تھی۔

ا و گے پیٹے !!"

میری سماعت کو سلگانے کے لیے ہوا کے دوش پر لفظوں کے انگارے مجھ تک پہنچے۔

ابا جی تڑکے ہی ایک بس پکڑ کر قصبے سے قریبی شہر روانہ ہو جایا کرتے تھے ...... ایک دن ٹھنڈے پانی سے نہا کر جو نکلے تو بس کے پائیدان پر قدم رکھنے کی نوبت نہیں آئی، انھیں فالج ہو چکا تھا، لوگ سڑک سے اٹھا کر گھر لے آئے پھر چارپائی پہ ایسے پڑے کہ اپنے قدموں پر اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ انھیں شہر کے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ اماں کے لیے روزانہ قصبے سے شہر آنا ممکن نہیں تھا اس لیے گھرداری کا ضروری سامان خرید کر اسپتال کے قریب تر ایک اچھا مکان کرائے پہ لے لیا گیا ـــــ ایک ماہ بعد اسپتال کے ڈاکٹر کچھ مایوس سے ہو گئے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ابا جی کو گھر پر رکھ کر علاج کیا جائے۔ ہم لوگ انھیں گھر لے آئے۔ اب شہر میں رہنا یوں ضروری تھا کہ شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں تک رسائی آسان تھی۔ ایک امید یہ بھی تھی کہ ابا جی کی صحت یابی کے بعد میں کسی کالج میں داخلہ لے کر پڑھائی جاری رکھ سکتا تھا لیکن ابا کی صحت کی طرح یہ امید بھی دم توڑتی گئی ـــ اماں کے اکیلے دم سے ابا کی دیکھ بھال ممکن نہیں تھی۔ وہ بے چارے تو خود کروٹ لینے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ انھیں اٹھا کر بٹھانا، دلیہ کھلانا یا پانی پلانا اکیلی اماں کے ناتواں ہاتھوں سے ممکن نہیں تھا۔ باقی سب بہن بھائی چھوٹے تھے۔ میں ایک سعادت مند بیٹے کی طرح ابا کی خدمت میں مصروف ہو گیا۔ جب کبھی کالج میں داخلے کی بات کرتا تو اماں ڈاکٹروں کے دیئے ہوئے دلاسے دوہراتیں کہ بس دو چار مہینوں میں ابا ٹھیک ہو جائیں گے۔ مہینے پر لگا کر اڑتے رہے اور ابا کا جمع شدہ پیسہ بھی ـــ نوکری سے انھیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ دے دیا گیا تھا۔ پرائیویٹ ڈاکٹروں سے علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہہ گیا۔ آمدنی کا منبع بند ہو جانے سے خرچ کی گو نگاہ خشک ہوتی چلی گئی اور جب سالی پہ بوراڑیں پڑنے لگیں تو ایک حکیم کا علاج شروع ہوا ـــ پھر جب معجونیں اور جوارشیں بھی استطاعت سے باہر ہوئیں تو ابا جی نے لڑکھڑاتی زبان سے ہومیو پیتھک علاج کی خوبیاں بتائیں۔ ہم سب کسی بحث کے بغیر متفق ہو گئے۔ اور یہی طریقِ علاج آخر تک جاری رہا۔ ہومیو پیتھی کی پسندیدگی میں ایک یہ پہلو بھی ابا جی کے پیشِ نظر تھا کہ دوا کھانے سے آدھا گھنٹہ پہلے اور آدھا گھنٹہ بعد تک کچھ کھانے کی ممانعت تھی اور ابا جی کچھ نہ کھانے کے وقفوں کو طول دینا چاہتے تھے کہ اکثر دوا کھانے کے آدھا گھنٹہ بعد بھی کھانے کے لیے کچھ نہ ہوتا تھا ـــ!

ابا جی گوشت کے ایک بے جان لوتھڑے کی طرح بستر پر پڑے رہتے تھے۔ پورا جسم فالج زدہ، بے سکت۔ اب زبان ہلانا بھی مشکل تھا .... صرف آنکھوں میں حرکت باقی تھی۔ کئی بار ابا جی نے نظروں ہی نظروں میں مجھے پیغام دیا کہ اُن کی بیماری کو چھ سال ہو گئے ہیں اور اب اُن کے بائیس سالہ گھبرو جوان بیٹے کو کوئی کام بھی کرنا چاہیے لیکن میں انھیں کیسے بتاتا کہ اماں کے کمزور ہاتھ تو انھیں کروٹ بھی نہیں دلا سکتے۔ میں نے اگر نوکری کر لی تو ابا جی کو گود میں اٹھا کر بستر کی نجاست بھری چادر کون ہٹائے گا جو دن میں کئی بار تبدیل کرنا پڑتی تھی۔

شہر کے مکان کا کرایہ پچھلے ڈھائی سال سے ادا نہیں ہوا تھا۔ مالک مکان نے رحم کھا کر کرایہ تو معاف کر دیا لیکن گھر خالی کرنے کا قانونی نوٹس بھی دے دیا۔ ویسے بھی اب شہر میں ابا جی کی صحت یابی کی کون سی امید باقی رہ گئی تھی۔ ہم لوگ ایک خیراتی ایمبولینس میں ابا جی کو قصبے والے مکان میں لے آئے۔ گھر کا دروازہ چھ سال بعد کھلا تھا۔ ابا جی کو دیکھنے والوں کا تانتا بندھ گیا .... انھی میں رجو بھی تھی۔ پہلی نظر میں اُسے پہچاننا مشکل تھا۔ پوری تحصیل میں اُس کی تمثیل ڈھونڈے سے نہ ملتی۔ اب وہ حسن و رعنائی کا ایک جیتا جاگتا

ہیکل تھی ...: کہاں وہ میٹرک کی چھریری سی لڑکی، کہاں بھرپور جوانی کے دباؤ سے چٹختا ہوا بدن: سرو قامت، جیسے موسم بہار میں جنگلی پھو
سے لدی ہوئی شاخ! اب اُسے زیادہ چوڑے دوپٹے کی ضرورت تھی ...... مجھے دیکھتے ہی اُس کے گلابی چہرے پر دھنک
بکھر گئی۔ اتنے برسوں بعد شاید اُسے بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ میں وہی ہوں۔

"کیا تم انجینئر بن گئے ــــ؟" اُس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"نہیں ــــ!" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

دھنک کے رنگ کچھ پھیکے سے پڑ گئے ــــ "تو پھر کیا کرتے رہے"

"ابا کی خدمت!" ــــ میں مختصر جواب ہی دے سکا۔

قصبے کے مکان میں آنے کے بعد جب ایک ماہ میں گھر کی ساری ضروری اشیا بک چکیں تو لوگوں کے رویے میں
ایک عجیب سی اجنبیت آگئی۔ گھر کے باہر چارپائیوں کی محفل تو برسوں سے موقوف تھی، لوگوں نے حال پوچھنے کے لیئے بھی آنا چھوڑ د
میں گزشتہ حاجت مندوں کو خود ہی سلام کرتا تو ایک استہزائیہ مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں سے جھانکنے لگتی۔ ایک دن قصبے
ماشکی نے مجھے "اوئے" کہہ دیا۔ میں نے گھر آکر اماں سے شکایت کی۔ ابا سُن رہے تھے۔ وہ اگرچہ بول نہیں سکتے تھے لیکن مجھے ان کی آنک
میں ایسا کرب ڈوبتا نظر آیا جیسے کسی شمس العلما کو کسی بازاری آدمی نے جاہل کہہ دیا ہو۔

اباجی کو خود بھی اپنی بے توقیری کا احساس شدت سے ہونے لگا تھا۔ ایک دن ڈاکیہ اُن کی معمولی پنشن میں اضافے کا اطلاعی خط
لایا ــــ لفافے پر "سینئر چپراسی" کے الفاظ لکھے دیکھ کر ابا کے چہرے پر ایک عجیب وحشتناک سی کیفیت پیدا ہوئی۔ آنکھوں میں بجلیاں
چمکیں۔ چہرہ پہلے سرخ ہوا پھر زرد ہو گیا ــــ اسی زرد چہرے کو میں نے قبر میں آخری بار دیکھا۔

اب چھوٹے بہن بھائیوں اور اماں کی کفالت میرے ذمے تھی۔ اباجی کی پنشن بند ہوئی تو مجھے تلاش معاش کے لیئے ایک با
پھر شہر جانا پڑا ــــ اب طویل سڑکیں تھیں اور میرے بے سمت قدم ...... بُرے دن لوگوں کو اور بھی بُرے لگتے ہیں جنہوں نے کبھی اچھ
دن دیکھ رکھے ہوں، مجھے نوکری کے لیئے دست سوال دراز کرتے وقت کچھ ایسا احساس ہوتا جیسے کوئی معزول شہزادہ جلاوطنی کے دو
کسی اجنبی شہر میں سب سے سستی سرائے کا پتہ پوچھ رہا ہو۔

میں نے کئی نوکریاں کیں، صرف اس لیئے کہ میں کسی ایک نوکری پر ٹک کر نہیں رہ سکتا تھا۔ پہلی بار فٹ پاتھ کے ایک
ہوٹل پر کام ملا تھا۔ دوسرے ہی دن ایک چھوٹی سی لغزش پر ہوٹل کے مالک نے گالی دے دی ــــ! میں سناٹے میں آگیا! اسما
پر اعتبار نہیں تھا کہ یہ الفاظ میرے لیئے استعمال کئے گئے تھے۔ ہوٹل والا اس کیفیت کو جان گیا۔ میری سہولت کے لیئے اُس
وہ الفاظ کچھ اضافے سے دوہرا دیئے۔ میں نے اُس کے سامنے بڑی مشکل سے ضبط کیا لیکن جیسے ہی وہ اپنی جگہ سے ہٹا......
میں نے چولہوں پر رکھی دیگچیوں میں سے قورمے کی بڑی والی دیگچی اوندھا دی ــــ پھر میں ایسی تیزی سے دوڑا کہ باورچی کی
گالیاں میرا تعاقب نہ کرسکیں ــــ گالی ــــ نوکری ــــ گالی ــــ نوکری!!

دو سال یوں ہی نوکریاں کرتے اور گالیاں کھا کر نوکریاں چھوڑتے گزر گئے۔

آخری نوکری جو میں نے چھوڑی ایک گڈس فارورڈنگ ایجنسی پر تھی۔ میرے ذمے ٹرکوں پر سامان لادنے والے مزدورو
کی روزانہ اجرت کا حساب کتاب تھا۔ گودام کے باہر میز کرسی سنبھالنے سے پہلے میں تمام مزدوروں کو ہدایت کر دی تھی کہ میرا نا
لینے کے بجائے مجھے "منیجر صاحب" کہہ کر مخاطب کیا جائے۔ احتیاطاً ریٹائر کو بھی اپنے خاندانی پس منظر اور انگریزوں کے خطاب والی روایت

ے آگاہ کر دیا لیکن وہ بھی زیادہ دن خود پر قابو نہ رکھ سکا اور ایک دن اُس کے لبوں نے اُن ناپاک لفظوں کو آزاد کر دیا جو میرے لیے جڑ بن چکے تھے ـــــ "اُلّو کا پٹھا" کہا تھا اس نے۔

آخر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ چوبیس سال کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ شخص کو گالی دے اور شخصیت بھی وہ جس کے آبا و اجداد کی انگریزوں تک نے عزت کی تھی۔ جو ایک خوبصورت، پڑھی لکھی لڑکی کے لیئے ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔

میں اپنے وجود میں کھولتے ہوئے لاوے پر قابو نہ پا سکا، ٹرک پر چڑھ کر میں نے کراکری کے تین کارٹن چکنا چور کر دیئے اور بھاگ نکلا ـــــ مجھ میں مزید گالیاں سننے کی تاب نہیں تھی۔

"اُلّو کا پٹھا ہمیشہ اُلّو کا پٹھا رہتا ہے!"

کہنے والے کی آواز میں یقینِ کامل پوشیدہ تھا۔

میں بڑی مارکیٹ کے پاس کھمبے سے ٹیکا ایک بھٹہ کھا رہا تھا کہ ایک قیمتی سی کار میرے قریب آکر رُکی۔ ایک اجنبی شخص اُسے چلا رہا تھا۔ غور سے دیکھنے پر ساتھ بیٹھی ہوئی خاتون کو میں پہچان گیا..... وہ نائیلہ تھی، رجّو کی پرانی سہیلی ـــــ وہ تیزی سے میری طرف آئی۔ مجھے دیکھ کر ایک لمحے کے لیئے اُس کے چہرے پر ترس کھانے کے سے آثار اُبھرے، پھر اُس نے کہا: "آؤ چراغ ـــ بیٹھو گاڑی میں!"

"مگر کیوں؟" میں نے احتجاج کیا ـــــ "مجھے نوکری تلاش کرنے جانا ہے!"

"شکیل تمہیں نوکری دلوا دیں گے!" اُس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا ـــ "چلو ہمارے ساتھ!"

شکیل نے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

امید کسی اچھی نوکری کی تھی۔ میں مجبور ہو گیا۔ شکیل نے مزید تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ نائیلہ سے اُس کی شادی کو ایک سال گزر چکا ہے اور نائیلہ اُسے نہ صرف رجّو سے اپنی دوستی کے بارے میں بتا چکی ہے بلکہ میرا غائبانہ تعارف بھی ہو چکا ہے! ...... پہلی نظر میں شکیل مجھے بہت اچھا لگا، لیکن جب کار آگے بڑھاتے ہوئے اُس نے سامنے بیٹھے مریل کتے کو ہارن دیا اور کتا پھر بھی نہ اُٹھا تو اُس نے پورا اسٹیرنگ موڑتے ہوئے گالی دی اور مجھے اُس سے کراہیت سی محسوس ہونے لگی ـــ کتا بے زبان سہی، مگر جاندار تو ہے آخر اُسے گالی کیوں دی جائے؟ مجھے مسجد کے مولوی صاحب یاد آئے جنہوں نے بتایا تھا کہ گالی دینے والوں کے لیئے سخت وعید آئی ہے اور اگرچہ کتے کو "اُلّو کا پٹھا" کہنے سے اُس کے والد کے مقام اور مرتبے میں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا لیکن یہ گناہ تو بہر حال تھا!

نائیلہ کی شاندار کوٹھی میں شاندار کھانا کھا کر میں ٹھنڈے کمرے میں نرم گداز بستر پر سویا تو ظاہر ہے کہ خواب میں رجّو ہی آ سکتی تھی ـــــ اگلی صبح قصبے کے لیئے روانہ ہوتے ہوئے بھی شکیل اور نائیلہ نے مجھے کچھ نہیں بتایا...... بس اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ قصبے پہنچ کر نائیلہ نے مجھے میرے مکان پر اتارا اور رضیہ کو لینے چلی گئی۔ میں اس وقفے میں اماں اور چھوٹے بھائیوں کو تسلی دینے لگا کہ حالات بدلنے کے لیئے ایک بہت اچھی نوکری بس ملنے ہی والی ہے۔ پھر میں اور شکیل پچھلے صحن کی طرف چلے گئے۔

نائیلہ رضیہ کو لے کر آئی تو وہ بہت پریشان تھی۔

"کہاں کہاں تمہیں نہیں ڈھونڈا! شکیل اور نائیلہ نے شہر کا چپہ چپہ چھان مارا تھا ـــــ آخر تم کہاں تھے؟" رجّو نے پوچھا۔

"بھوسے کے ڈھیر میں سوئی آسانی سے کہاں ملتی ہے؟" میں نے اپنی طرف سے عالمانہ جواب دیا۔

رضیہ کے پاس وقت بہت کم تھا۔ نائیلہ اُسے پھوپھی کے گھر سے کوئی بہانہ کرکے لائی تھی کیونکہ اب رضیہ کے میرے گھر آنے پر پابندی لگ چکی تھی۔

"سنو چراغ دین!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی ـــــ "میری شادی ہونے والی ہے!"

"شادی ـــــ ہا ـــــ" مجھے جھٹکا لگا ـــــ "کس سے؟"

"ایک بڈھے کھوسٹ سے" ـــــ وہ بولی "وہ لوگ تاریخ طے کرنے آئے ہیں۔ شام تک چلے جائیں گے۔ پھوپھا کو یہ شادی کر دینے کی بڑی جلدی ہے ـــــ وہ بڈھا مستقیم شہر میں تیل کا مالک بھی آڑھتی ہے۔ پھوپھا کے کولھوؤں کی جگہ مشین لگوانے کے لیے پچاس ہزار روپے دیئے ہیں اُس نے!"

نائیلہ میرے کچھ کہنے سے پہلے بولی ـــــ "یوں سمجھو..... رضیہ کو بیچ دیا ہے اس نے!"

"ارے ـــــ" میں حیرت اور صدمے سے بولا ـــــ "تو پھر کیا کرنا چاہیئے رجو؟"

رجو نے میرے ورزشی بازوؤں، چوڑے سینے اور کشادہ پیشانی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی ہیروئن اپنے ہیرو کو دیکھ رہی ہو "تمہیں لڑنا ہے اس طوفان سے!" وہ پُرعزم لہجے میں بولی ـــــ "جاؤ اور میرے پھوپھا کے سامنے ایک آہنی چٹان بن کر کھڑے ہو جاؤ۔ اُن سے کہو کہ تم میرے بچپن کے منگیتر ہو اور تم سے مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہیں چھین سکتی!"

مجھے اپنے بازوؤں، سینے اور پیشانی میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے بمشکل کہا ـــــ "لیکن..... رجو..... ایک ایسا شخص جس کے پاس انگوٹھی خریدنے کے لیے پیسے نہ ہوں..... لڑکی والوں سے رشتے کی بات کیسے کر سکتا ہے؟"

"پیسے ہم دیں گے!" شکیل بڑے جوش سے بولا۔

"وہ یقیناً انکار کر دیں گے!" میں نے کہا۔

"اس کا حل بھی ہے ہمارے پاس!" نائیلہ بولی ـــــ "ہم نے سوچا ہے کہ اگر وہ لوگ وعدہ خلافی کریں تو سزا بھی پائیں، تم رضیہ کو لے کر شہر آ جانا، یہ عاقل و بالغ ہے... قانونی طور پر اپنی مرضی کی مالک، شہر میں تمہاری شادی کرا دی جائے گی اور پھر کوئی بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا!"

یہ دہشت ناک منصوبہ سُن کر میرا سر چکرانے لگا!

شکیل نے حوصلہ بڑھایا ـــــ "میرے بڑے بھائی وکیل ہیں اور ایسے لوگوں سے نمٹنا جانتے ہیں!"

میں نے تھوک نگلا ـــــ "یعنی..... ہم دونوں..... بھاگ جائیں؟"

"نہیں ـــــ فرار ہو جائیں!" رضیہ نے بہتر لفظ استعمال کیا۔

نائیلہ بولی ـــــ "اگر تم رضیہ کے پھوپھا سے آمنے سامنے بات نہیں کر سکتے تو پھر یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہمارے ساتھ آج ہی شہر واپس چلو۔ میں نہیں چاہتی کہ میری اور شکیل کی موجودگی میں رضیہ یہاں سے فرار ہو ـــــ ورنہ سارا شک ہم دونوں پر ہی آ جائے گا۔ شکیل شہر میں تمہیں ایک کرائے کا مکان لے دیں گے... اگلے جمعے سے پہلے تم رات کی تاریکی میں یہاں آؤ اور منہ اندھیرے رضیہ کو لے جاؤ!"

"کرائے کے اُس تنہا مکان میں؟" میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مولوی صاحب میرے کان میں سرگوشی کر رہے تھے "گناہ کبیرہ!"

شکیل کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری ـــــ "اس تنہا مکان میں رات ہونے سے بہت پہلے تم دونوں کا نکاح ہو چکے گا!"

رضیہ پُرامید نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ہیرو کے لیے طوفان سے ٹکرانے کا وقت آ چکا تھا......

میرا ابا لنگڑا اگلے دونوں پیروں کو بمشکل حرکت دیتا ہوا گھسٹنے کے سے انداز سے اُس تخت کے نیچے سے نکلا جس پر

ں اور رضیہ بیٹھے ہوئے تھے پچھلے جمعے کو جب وہ گھر کے آگے سو رہا تھا تو ایک ریڑھا اُس کے پیروں کو کچلتا ہوا نکل گیا تھا۔
لا کیاری میں تُرئی کی بیل کے جڑ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

رضیہ کو بِلّے کا یہ دخل در معقولات بُرا لگا تھا۔ اُس کی نظریں بِلّے کو کیاری تک پہنچا کر میری طرف پلٹ آئیں اور خار دار
تاروں سے بنے ہوئے سوالیہ نشان کی طرح چبھنے لگیں۔ اُسے توقع تھی کہ میں اُٹھ کھڑا ہوں گا ...... شاید ایک زوردار بڑھک بھی
ماروں گا اور چیخ چیخ کر اپنے نادیدہ ولین سے وہی کہوں گا جو اس سچویشن میں ایک ہیرو کہتا ہے یا اُسے کہنا چاہیئے، لیکن میرے حلق سے
ایک نحیف سی آواز نکل سکی ـــــ "یہ ..... یہ تو جرم ہے۔"

رضیہ نے غصے سے میری طرف دیکھا ـــــ "تو کیا ایک نوجوان لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے بغیر کسی ایسے بڈھے سے
کر دینا جرم نہیں ہے جس کی شادی کے بعد خود اُس کی جوان بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔"

"یقیناً یہ زیادتی ہے۔" میں نے کہا ـــــ "اور آخرت میں ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا ـــــ لیکن ذرا سوچو..... میں تمہیں بھگا کر
لے گیا تو کتنی بدنامی ہوگی پورے علاقے میں، تم جانتی ہو کہ میں ایک تعلیم یافتہ شخص ہوں.... میٹرک سیکنڈ ڈویژن ...... اور پھر ہمارا خاندان ایک
باعزت خاندان ہے، تم نے سنا ہوگا کہ انگریزوں نے ہمارے پردادا کے دادا کو ......"

"کئی بار سن چکی ہوں۔" رضیہ نے بات کاٹی ـــــ "لیکن تمہارے خاندان کی رہی سہی عزت سے زیادہ یہ ایک زندگی کا سوال
ہے، ایک لڑکی کی تمام عمر پامال ہونے والی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ـــ" میں نے بڑے صدمے سے کہا ـــ "لیکن لوگ کیسی کیسی گندی باتیں بنائیں گے۔ اماں کے لیئے تو یہاں
رہنا دوبھر ہو جائے گا اور اس بدنامی سے میرے ابا کی روح کو کتنی تکلیف پہنچے گی ـــ"

رضیہ نے ایک طویل سانس لی..... چند لمحوں کے لیئے آنکھیں بند کیں ..... اور تھکے ہوئے لہجے میں بولی "رہنے دو!"
"نہیں، نہیں ..... میں تمہیں وہ خطرات بتا رہا ہوں جو اس ناجائز عمل کے بعد ......" میں نے کہنا چاہا۔
"رہنے دو ـــ" اچانک اُس کی آواز میں شکستگی کا ایسا چھناکا تھا جیسے شیشے کے لفظ اُس کے ہونٹوں سے گر گئے ہوں۔

وہ خالی خالی نظروں سے کیاری میں بیٹھے ہوئے تومند بِلّے کو دیکھنے لگی۔ بِلّا اپنے معذور پنجے سینے کے نیچے دبائے بیٹھا
تھا۔ مکھیاں اُس کے میلے منہ پر بھنبھنا رہی تھیں اور قریب ہی ایک کوا اُس کی پیشانی پر رِستے ہوئے زخم کو لالچی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
چند لمحوں تک سناٹا گونجتا رہا .... پھر نائیلہ بولی ـــــ "دیکھو اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ شادی کے بعد رجّو کو کہاں سے کھلاؤ گے تو اس کی
فکر مت کرو۔ شکیل تمہیں اپنے دفتر میں ہی نوکری دے سکتے ہیں۔ تم اپنے بہن بھائیوں اور ماں کو بھی وہیں بلوا لینا۔ رجّو کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق
ہے اور اب بھی اتنی عمر نہیں گزری کہ یہ آگے تعلیم حاصل کر کے گھر کے اخراجات میں تمہاری حصے دار نہ بن سکے۔"

میں نے رضیہ کی طرف دیکھا، مگر اب وہ میری طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی..... جیسے اب اُسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اُسے
مخاطب کیئے بغیر میں نے کہا ـــ "گھر سے بھاگ جانے والی بات تو بہت خطرناک ہے، پولیس، کچہری کا چکر بھی ہو سکتا ہے .... کوئی اور حل تلاش
کرنا چاہیئے!"

رضیہ نے میری طرف دیکھا۔ اُسے میرا سوال یوں لگ رہا تھا جیسے ولین کے آ جانے پر ہیرو ہیروئن سے پوچھ رہا ہو کہ چھپنے کیلیئے
کونسی جگہ مناسب رہے گی!..... میں نے اُس کی آنکھوں میں اپنے چہرے پر دراڑیں پڑتی دیکھیں۔ حقارت کے ایک نامانوس چہرے نے اس کی پلکوں
کے روزن سے مجھے جھانکا جیسے اُس کے سامنے گری ہوئی دیوار کا ملبہ پڑا ہو پھر وہ سمٹتے سمٹتے ایک نقطہ سا بنا اور آنکھوں کے پیچھے کہیں چھپ گیا
..... رضیہ اٹھی .... اور خاموشی سے دروازے کی طرف چلی گئی۔

"مجھے آواز ضرور بلند کرنا چاہیئے!" قائم شاہ کے گھر کی طرف جاتے ہوئے میں نے سوچا تھا۔ "کہیں رضیہ مایوس ہوکر خودکشی جیسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کرے!"

میں قریب پہنچا تو گھر کے آگے چارپائی پر قائم شاہ کے تین چار مسٹنڈے ڈٹ کر بیٹھے تھے۔

("نہیں ـــــ رضیہ اتنی بے وقوف بھی نہیں ہے کہ خودکشی کرلے!" میں نے سوچا)

سامنے مونڈھے پر قائم شاہ بیٹھا تھا اور اُس کے قریب ہی کرسی پر سفید بوسکی کی شلوار قمیض میں ملبوس .... بابو مستقیم! ایک سیاہ رو، بوڑھا، مدقوق سا شخص، تنگ پیشانی، خضاب کالے کیے ہوئے چھدرے بال، وہ تیل کا آڑھتی ہی نہیں تھا تیل استعمال بھی کرتا تھا کیونکہ چپڑے ہوئے بھنووں تک آجانے والا تیل اُس کے ماتھے کی شکنوں میں چمک رہا تھا۔

پھوپھا قائم شاہ نے مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا، میں کھڑا رہا۔ وہ بابو مستقیم سے مشینوں کی باتیں کرتا رہا.... پھر کافی دیر بعد وہ یوں چونکا جیسے اُسے میری موجودگی کا احساس اب ہوا ہو۔

"یہ چراغ ہے!" اُس نے میرے نام کی تضحیک پر زور دے کر کہا، یقیناً وہ بابو مستقیم سے میرا ذکر کرچکا تھا۔ بابو مستقیم نے چندھی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اُس کے ہونٹ آہستہ سے ہلے۔ آواز تو نہیں آئی لیکن ہونٹوں کی حرکت سے شائبہ سا گزرا کہ وہ "اُلو کا پٹھا" کہہ رہا تھا۔

"سُن بھئی چراغ!" قائم شاہ کے لہجے میں پھنکار سی تھی ـــــ "رجّو کی شادی نئے چاند کی پانچ تاریخ کو بھائی مستقیم سے ہوگی!"

"اچھا!" آواز میرے حلق کے صحرا سے ہوتی ہوئی گزری ـــــ "کوئی کام ہو تو ضرور بتایئے گا!"

شہر آنے کے کچھ ہی دن بعد مجھے ایک بڑی اچھی ملازمت اپنی کوشش سے مل گئی۔ یہ ایک ریٹائرڈ پروفیسر صاحب تھے، بالکل تنہا کبھی ویٹرنری کالج میں پڑھاتے تھے۔ اب گھر میں ہی چھوٹی سی لیبارٹری بنا رکھی تھی اور جانوروں کے امراض کے لیے مختلف دواؤں کے تجربات کرتے رہتے تھے۔ نوکری تو انھوں نے مجھے لیب بوائے کے طور پر دی تھی لیکن میں اُن کے لیے گھر کے دوسرے کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ ملازمت کے تیسرے ہی دن میں نے اُن کے باورچی کو چھٹی دلا دی تو اس بچت سے وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ دو آدمیوں کا ناشتہ اور کھانا تیار کرنا مشکل ہی کیا تھا۔ پروفیسر صاحب ویسے بھی نہایت شریف اور کم گو انسان تھے۔ اب مجھے اُن کے پاس نوکری کرتے ہوئے پورے چار سال ہوچکے تھے اس دوران لیب میں کئی ٹیوبیں اور کچن میں بہت سے برتن مجھ سے ٹوٹے تھے لیکن ایک بار بھی انھوں نے گالی نہیں دی تھی.... جس سے مجھے نفرت تھی، جسے سن کر مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے پیٹرول چھڑک کر ماچس کی جلتی ہوئی تیلی مجھ پہ پھینک دی ہو۔

لیکن ...... وہ گزشتہ ہفتہ!!!

ساتھ والا بڑا مکان جن لوگوں نے خریدا تھا وہ پڑھے لکھے تو ضرور تھے لیکن گھر والی نہایت بدمزاج اور تند خو تھی ـــــ آنکھوں کے گرد حلقے، رخساروں پر چھائیاں، چہرہ زرد، بال اُلجھے اُلجھے ـــــ خود بھی اُلجھی رہتی تھی۔

"اُلو کا پٹھا" ـــــ آواز بہت قریب سے آئی اور وہ خود بھی سامنے والی کھلی کھڑکی میں آگئی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے شخص نے مسوڑوں سے پھسلتی ہوئی بتیسی کے درمیان سے پوچھا ـــــ "جب سے یہاں آئی ہو.... کسے اُلو کا پٹھا کہتی رہتی ہو تم!! کون ہے اُلو کا پٹھا!؟"

"یہ!" تلخ مزاج عورت نے ہاتھ میں تھاما ہوا بلی کا بچہ اُسے دکھایا...... "مجھے اس کی شکل سے نفرت ہے!"

میں جانتا تھا...... رجّو بلی کے بچے کو اُلو کا پٹھا نہیں کہتی تھی!

مری میں ایک دن

مصطفیٰ کریم

"بھئی میں تمہاری طرح جوان نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ تیز نہیں چل سکتا"
سعیدہ ہنس پڑی۔ خاوند کا اُسے جوان سمجھنا، جبکہ اس کی عمر باون سال تھی، خوش تو ہونا تھا اسے۔ وہ رک گئی اور اپنے بے قابو سانس کو قابو میں کیا۔ دم اس کا بھی پھول رہا تھا لیکن اتنا نہیں جتنا اس کے خاوند کا۔ وہ ہانپتا ہوا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کا موٹا کلین شیوڈ چہرہ، موٹی گردن اور گنجا سر پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔ اس کے کھلے منہ سے آتی تیز سانس کی آواز کو سعیدہ سُن رہی تھی۔ لیکن اپنے خیالوں میں گم وہ خاوند سے آگے نکل آئی تھی۔

"انگلستان کا مکھن اور خالص دودھ آپ کے جسم میں کیسی پھرتی لے آیا ہے۔ دیکھا آپ نے موٹی بیگم؟"

"میں موٹی نہیں بس تندرست ہوں" سعیدہ نے اپنی موتی جیسی آنکھیں اٹھلاہٹ میں گھمائیں۔

"لیجئے مان لیتے ہیں" خاوند نے اثبات میں سر ہلایا۔ عمر کی وجہ سے بیوی کا جسم بھر گیا تھا۔ ورنہ وہ دبلی ہی لگتی۔

دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مال پر آ گئے۔

"آؤ۔ ادھر بیٹھتے ہیں" ڈاک خانے کی سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خاوند بولا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے انھیں بیریئر کے پاس اتار دیا تھا۔ وہاں سے مال تک پہنچنے کے لئے انھیں چڑھائی پر جاتی سڑک کو طے کرنا پڑا۔ سعیدہ بھی تھک گئی تھی۔ اس کی کنپٹیاں پسینے سے تر تھیں۔ ریشمی سبز جمپر اور شلوار میں ڈھکا اس کا جسم اس اچانک ورزش سے گرم اور نم تھا۔

دونوں سیڑھی پر بیٹھ گئے۔ سعیدہ نے کاغذ کے پیکٹ سے ایک سنگترہ نکالا، اسے چھیلا اور چند قاشیں خاوند کے حوالے کیں۔ بلندی کی خنکی اور سنگترے کے میٹھے رس سے میاں بیوی نے تازگی محسوس کی۔ سعیدہ کو اپنے بدن کی تمام نسیں، رگ اور پٹھے کھلتے محسوس ہوئے ہوئے۔ فرحت کے احساس سے اس کی گردن میں ذرا سا خم آ گیا۔ اپنے ہاتھوں کو اس نے اپنی گود میں پھیلا دیا۔ اس کی کلائی میں سونے کی چوڑیاں کھنک گئیں۔

"ہم مری میں رہ چکے ہیں۔ میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ ہم یہاں کیوں آئے؟ سوات، کاغان یا ہنزہ ــــــ کہیں بھی جا سکتے تھے" خاوند نے معصومیت سے دبے لہجے میں شکایت کی۔

"شادی کے بعد یہیں تو لائے تھے آپ مجھے۔ ایک مہینہ ساتھ گزارا تھا ہم نے مری میں۔ بھول گئے؟" خوش دل سعیدہ نے خوش کن بات کہی ہنسنے کی وجہ سے اس کے گالوں میں گہری شکنیں پڑ گئی تھیں۔ چمکتے دانتوں میں دو نقلی دانت کی تمیز مشکل تھی۔ اور شانے تک ترشی زلف میں سفید قطاریں تھیں۔ خاوند کو اس وقت وہ بہت بھلی لگی۔

اس مہینے کی یاد میں سحر تھا۔ ایک خوشگوار سحر۔ اس سحر نے دونوں کو چپ کرو یا۔ سعیدہ جو سڑک کنارے کچھ کھانے سے
جھکتی تھی، آرام سے سنگترے کھاتی رہی۔ ایک کے بعد دوسرا۔ اپنے خاوند کی طرح جیسے وہ مری نہیں اپنے گھر میں تھی۔ پرسکون اور شادماں۔
ریہ تھا بھی سچ۔ ان کا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ میاں بیوی انگلستان میں بسے ہوئے تھے۔ بیٹی وہیں پلی بڑھی تھی اور جوان ہوئی تھی۔
صرف انگریزی میں گفتگو کرسکتی تھی۔ جینز اور اسکرٹ اس کا مرغوب لباس تھا۔ اس کی نسبت آسانی سے کراچی میں طے ہو جائے گی،
یدہ نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ بھاگ دوڑ سے ذرا فرصت ملی تو سعیدہ نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ مری میں گھوم آئیں جہاں اچھا وقت گزرا
ہاں جانا بھلا لگتا ہے۔ گیا وقت پھر آ جاتا ہے۔ چپکے سے۔ بھلائی ہوئی خوشیوں کے ساتھ اور ان راحتوں کے ساتھ بھی جو اس وقت
؛ محسوس ہوئی تھیں۔ ماضی میں جب بھی انگلستان سے پاکستان آنا ہوا، میاں بیوی کراچی اور لاہور میں وقت گزار کر واپس
، گئے۔

کاغذ کے پیکیٹ میں چار ہی سنگترے تھے۔ جلد ہی ختم ہو گئے۔ "ان چھلکوں کو کدھر پھینکوں؟" سعیدہ بولی۔ اس کی
ہیں سڑک پر ڈسٹ بن تلاش کر رہی تھیں۔

"مجھے دے دو۔ شاید کہیں کوڑا پھینکنے کی جگہ ہو" خاوند نے سنگتروں کے چھلکوں کو کاغذ کے خالی پیکیٹ میں ڈالا اور چل پڑا۔
جون کا مہینہ تھا اور دوپہر کا وقت۔ پھر بھی مال پر اتنے ٹورسٹ نہیں تھے۔ سڑک کی دونوں جانب دوکانیں تھیں۔ شلوار،
، سوئٹروں، ویسٹ کوٹ اور اونی ٹوپیوں سے بھری دوکانیں جن کا سامان فٹ پاتھ پر بکھر آیا تھا۔ اسی فٹ پاتھ پر چلتے
، دونوں میاں بیوی ونڈو شوپنگ کرتے تھے۔ شوکیس میں ہنر مند درزیوں کے سیئے ہوئے خوبصورت لباس۔ یہیں پر کسی دوکان
یدہ نے اپنے لئے ہلکے سبز رنگ کا کوٹ اور اس کے خاوند نے سرخ رنگ کا ویسٹ کوٹ خریدا تھا جسے اپنے نیلے سوٹ
اتھ پہن کر لندن کے لسٹر اسکوائر اور ریجنٹ اسٹریٹ میں گھوما کرتا تھا۔

سعیدہ نے مڑ کر ایک دو بار ڈاک خانے کی جانب دیکھا۔ ہر بار اس کی نگاہیں چند لمحوں کے لئے اس پر رکیں۔ پوسٹ
، عمارت اسے نامانوس محسوس ہوئی۔ وہاں وہ اکثر جاتی رہی تھی۔ مری پہنچ کر ممی ڈیڈی کو تار دینے، خطوط پوسٹ کرنے۔
منوں اور سہیلیوں کے نام۔ شادی اور مری۔ شب و روز کے لمحات کا نامکمل بیان ہوتا تھا ان خطوں میں۔ جب اس کا
اپس آیا تو وہ بولی "ایسی تو نہیں تھی یہ۔ زرد دیواریں اور تکونی چھت تھی اس ڈاک خانے کی۔"

"وہ انگریز کا طرزِ تعمیر تھا۔ اچھا ہی ہوا بدل دیا گیا۔ جب انگریز نہ رہے تو ان کی نشانیاں کس کام کی۔"

سعیدہ اپنے خاوند کو کیا سمجھاتی۔ سمجھ جانے کے باوجود وہ اقرار نہیں کرتا کہ اس نے سمجھ لیا ہے۔ اس طرح اس کی انا مجروح
ہے! یہ ممکن تھا کہ وہ سعیدہ سے الجھ پڑتا۔ کوئی بھی اختلافی نکتہ ہو خاوند ہی کی بات درست ہوتی ہے۔ تیس سال شادی شدہ
، ہم خیال ہو جاتے، سعیدہ کو حسرت ہی رہی۔ اس کی روح میں کئی دریچے خالی رہ گئے۔ کوئی ان میں سے جھانکتا، اسے
بلیکن اب اس کا کیا گلہ؟ خوشی کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ سعیدہ تسلیم کر چکی تھی۔

وہ خاموش رہی۔ اسے اسکاٹ برو کی وہ جگہ یاد آ رہی تھی جہاں تالاب کے وسط میں پہاڑی پر لکڑی کی بنی ہوئی چھوٹی سی
، سرخ خمدار چھت۔ برآمدہ اور سبز ستون۔ پہاڑی پر بہتا جھرنا۔ اور شہر برائیٹن میں مسجد نما عمارت۔ چین اور اسلامی تہذیب
انگلستان میں بھی تھیں۔ ملکوں میں تہذیبی رنگارنگی نہ ہو تو کیا رہ جاتا ہے سوائے بے لطفی اور بیگانگی کے۔

آیئے چلیں۔" گردن میں جھولتے ڈوپٹے سے سعیدہ نے سر ڈھکا اور اپنے دستی بیگ کو سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
ال پر چلتے ہوئے کچھ دور جا کر میاں بیوی رک گئے "مجھے یاد آتا ہے یہاں ایک ہوٹل تھا" سڑک کی الٹی جانب اشارہ کرتے ہوئے سعیدہ نے کہا۔

"ہاں ہوٹل ہی تھا حسین سا۔ اوپر بڑا سا کمرہ اور نیچے کشادہ برآمدہ جہاں سے دور تک مال اور شاید مری کی وادی بھی نظر آتی تھی۔
سعیدہ نے جیسے اپنے خاوند کی بات نہیں سنی۔ اسے تیس سال پہلے کی وہ شام یاد آگئی تھی جب دونوں قریباً اسی ہوٹل میں بیٹھے تھے جو کبھی یہاں تھا۔ ان کے ساتھ اس کے خاوند کا دوست کیپٹن نفیس بھی تھا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ اچانک بولا "بھابی! مجھے لگتا ہے کہ مری میں ملاقات سے پہلے میں آپ کو کہیں دیکھ چکا ہوں۔"
"میری بیوی کے تخفیف چہرے کو دیکھ کر لوگوں کو ایسا شبہ ہو جاتا ہے۔ یہ کوئٹہ کی رہنے والی ہے۔ گئے ہو تم وہاں؟" سعیدہ کے خاوند نے نفیس کو جواب دیا تھا۔
نفیس کی بات سچ نہیں تھی۔ پھر بھی سعیدہ خوش ہو گئی تھی اور اپنائیت کا احساس ہوا تھا اسے۔ نفیس کا کنبہ ۴۷ء میں سرینگر سے اجڑ کر مری میں آبسا تھا۔ سعیدہ کا خاوند اور نفیس کالج میں ساتھ تھے۔ بعد میں ملازمتوں کی نوعیتوں نے انہیں الگ کر دیا۔ ان دنوں نفیس ڈویژنل ہیڈکوارٹرز مری میں کام کر رہا تھا۔ گو سعیدہ اس سے ایک دو بار مری میں مل چکی تھی لیکن کسی دیرینہ شناسائی کی بات پہلی بار نفیس نے اس شام کہی تھی۔ وہ بھی بڑی سنجیدگی سے۔
سعیدہ اس ملاقات کی بابت سوچتی ہوئی اپنے خاوند کے ساتھ آگے بڑھ آئی۔ پاس ہی کتابوں اور رسالوں کی دوکانیں تھیں۔ وقت کسی طرح گزارنا تھا۔ میاں بیوی ایک دوکان میں چلے گئے اور رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگے۔
"شاید یہ فوٹوگرافی کی دوکان تھی کبھی؟" سعیدہ کا خاوند کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔
"جی ہاں میں ہی کرتا تھا فوٹوگرافی۔ لوگوں کو تصویریں کھچوانے کا شوق نہیں رہا اس لئے کتابوں کی دوکان کھول لی۔" درمیانہ عمر کے لمبے مالک دوکان نے افسردہ جواب دیا۔ اسے اپنے ہنر کے زیاں کا افسوس تھا۔
سعیدہ کی نگاہ دوکان کی خالی دیوار پر پھر گئی۔ وہاں کبھی فوجی افسروں کی تصویروں کے درمیان نفیس کی تصویر نمایاں تھی۔ چہرے کے مضبوط نقوش۔ آنکھوں میں خود اعتمادی۔ سر کے بال بغیر مانگ نکالے پیچھے کی جانب اُلٹے ہوئے۔
دوکان سے چند رسالے خرید کر دونوں نکل آئے۔ سعیدہ سوچنے لگی کہ نفیس کو بھی فوٹوگرافی کا شوق تھا۔ اس نے سعیدہ اور اس کے خاوند کی کئی تصویریں کھینچی تھیں۔ ایک تصویر وہ بھی تھی جس میں سعیدہ ہاتھوں پر چہرہ ٹکائے مغموم کسی خیال میں کھوئی ہوئی تھی پتہ نہیں نفیس کو اس عکس میں کیا نظر آیا، اس نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ بعد میں سعیدہ نے اکثر سوچا کہ نفیس نے ایسا کیوں کیا؟ لیکن وہ خود کو کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکی نہ ہی نفیس سے اس نے اس بابت کبھی پوچھا۔ سمجھ اور ناسمجھ کے درمیان کی الجھنوں کو سلجھانے کا وہ زمانہ بھی نہیں تھا۔ اس وقت وہ تھی اور اس کا شوہر۔ اس کے شب و روز اور ایک دوسرے میں کھو جانے کی خواہشیں۔
مری میں ہنی مون منانے کے بعد جب وہ کوئٹہ واپس ہوئے تو نفیس سے رابطہ ختم ہو گیا۔ اور جب وہ انگلستان چلے گئے تو بہت سے رشتے پرانے اور غیر اہم ہو گئے۔ ان میں نفیس اور اس سے ملاقاتیں بھی شامل تھیں۔ جب وہ اس بار مری آنے لگے تو دونوں نے طے کیا کہ نفیس اگر وہاں ہوا تو اس سے مل لیں گے۔ لیکن سعیدہ نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ یہاں پہنچنے کے بعد وہ بار بار اس کی بابت سوچے گی۔ خیال پر کسے بس ہے۔ نہ اس کی آمد اور نہ اس کی کیفیت پر۔
جب دونوں سی۔ ایم۔ ایچ کے گیٹ کے قریب پہنچے تو انہیں سڑک کی داہنی جانب وہ گرجا نظر آیا جس سے وہ آشنا سے تھے۔ ماضی میں مال پر ٹہلتے ہوئے ان کی نگاہیں اس پر اکثر پڑتی تھیں۔ گرجا مقفل تھا اور اس کے صحن کے دروازے پر ایک تختی لگی تھی جس پر لکھا تھا ــــ "یہاں رفع حاجت منع ہے" ــــ سعیدہ کی طبیعت مکدر ہو گئی۔
"مجھے یقین ہے کہ جب ہم پچھلی دفعہ یہاں تھے تو اُس وقت یہ ہدایت نامہ نہیں تھا۔"

"اُس وقت سب کا خدا ایک تھا اور عبادت کی ہر جگہ متبرک تھی۔" سعیدہ نے تلخی سے اپنے خاوند کو جواب دیا اور آگے چل دی۔

ڈپٹی کمانڈر کے مکان کے دروازے پر سوائے ایک کے باقی محافظ سپاہی ڈھیلے ڈھالے کھڑے تھے۔ میاں بیوی نے ان پر نگاہ ڈالی۔ سپاہیوں میں سے جو سگریٹ پی رہا تھا اس نے آسمان کی طرف منہ کرکے دھواں کا نیلا مرغولہ ہوا میں اڑایا۔ سعیدہ کے پاس ملے میں ایک ضعیفہ ٹورسٹ کو ٹہلتا ہوا ایک بالو گزر رہا۔

"شاید تمہیں وہ صبح یاد ہو، ہم یہاں ٹہلتے ہوئے جب پہنچے تو نفیس ڈپو ہیڈکوارٹرس کی طرف جاتا ہوا ملا تھا۔ خاکی کمر کدار وردی۔ پر چمکتے ہوئے تین ستارے اور سر پر سبز ٹوپی۔ کمانڈر کے محافظ دستے میں سے کوئی للکارا ـــ گارڈ ـــ اٹنشن۔ پھر سبھوں نے سیلوٹ کیا اور نفیس نے بھی تن کر سیلوٹ کا جواب دیا۔

بعد میں وہ مجھ سے کہنے لگا "تم نے سپاہیوں کے سیلوٹ کا جواب نہیں دیا۔" "کیسا جواب۔" میں نے پوچھا اور نفیس بولا "تم زور سے کہتے سلام، تم ہنس پڑیں ورنہ میں تو یقین کر بیٹھا تھا۔ عین ممکن تھا بعد میں یہ حماقت مجھ سے ہو بھی جاتی۔"

شوہر نے جس واقعے کا ذکر کیا وہ سعیدہ کو یاد نہیں تھا پھر بھی اس کا دل رکھنے کے لئے وہ ہنس دی۔ وہ سامنے اس پہاڑی کو تک رہی ،کی بلندی پر کالج تھا۔ اور اس کے نیچے وہ سفید بنگلہ جس میں نفیس رہا کرتا تھا۔

دونوں وہاں پر آکر رک گئے جہاں سڑک پہاڑی کے ساتھ پنڈی پوائنٹ تک جاکر دائرہ بناتی ہوئی اسی جگہ آتی تھی جہاں اس وقت ،اور اس کا خاوند کھڑے تھے۔ وہیں سڑک کے کنارے کبھی آہنی ریلنگ تھی۔ اسی جگہ سے تو بیاہے میاں بیوی پرسکون مری کی وادی کا نظارہ ، تھے۔ وادی میں ننھے منے گھر اور ان پر کبھی کبھی اڑتے بادل۔ دور پہاڑ اور اس کے اوپر آسمان۔ کبھی دھوپ نکھرا ہوا اور کبھی چاندنی چاندی میں ،راسب کچھ بھلا تھا۔ سب میں اپنا پن تھا۔ اب سڑک کی دونوں جانب ہوٹل تھے۔ ان ہوٹلوں میں کام کرنے والوں اور گاہکوں کا شور، سیاہ ،ن میں تلتے کبابوں کی چھل چھل، خستہ لکڑی کی میزوں پہ چائے کی چھوٹی پیالیاں اور کوک کی خالی بوتلیں۔ ہوٹل کے باہر غلاظت میں ،ریلیاں۔ سب کچھ غیر، سب کچھ بیگانہ۔ سعیدہ بجھ گئی۔

"اسی پہاڑی پر نفیس کا مکان ہے۔ آؤ چلتے ہیں ملنے۔ اب تو وہ جنرل ونرل ہوگا۔"

سعیدہ نے اپنے دل کی بات خاوند سے سنی اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ اس حسن کی فریاد کرنے جو ہری سے مٹ گیا۔ اور بھی بہت کچھ کہنے ،ہنے۔ تیس سالہ زندگی کی بابت۔ اپنی اور اس کی۔

دونوں سرو اور اخروٹ کے درختوں کے درمیان ناہموار پگڈنڈی پہ چلتے ہوئے سفید بنگلے پر پہنچے۔ اس کے صحن کے گرد دیوار تھی جس کا دروازہ کھلا ،یں درخت کے سائے میں ایک پستہ قد بھرے جسم کا آدمی آنکھیں بند کئے آرامدہ کرسی پر لیٹا تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر داڑھی تھی اور سر ،بال تھے۔ اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں اور ماتھے پر بل ڈال کر ترچھی نگاہوں سے سعیدہ اور اس کے خاوند کو تکا۔ سیزن میں ٹورسٹ ،کس کے گھر میں بھٹک آتے ہیں اور آرام میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ نوواردوں کا اچانک آجانا اسے بُرا تو لگتا تھا۔

اجنبی کو بنگلے میں دیکھ کر میاں بیوی بھی ٹھٹک گئے تھے۔

"اس مکان میں ایک کیپٹن نفیس رہتے تھے۔ سرینگر سے ان کا خاندان اجڑ کر یہاں آبسا تھا۔ ہمیں ان سے ملنا ہے۔" سعیدہ کا خاوند دبی ،بولا۔

کرسی پر لیٹا آدمی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر نفیس سے واقفیت کا اظہار کیا۔ اس کی سست نگاہیں دونوں پر ی گھومیں، پھر تھکی ہوئی بے جان آواز میں اس نے جواب دیا "کیپٹن نفیس مارے گئے جی ... چٹاگانگ کے پاس ۷۱ کی جنگ میں مارے ،اپنوں کے ہاتھوں ... "

جلوہ

عطیہ سید

چیڑ کے جنگل میں سرمست ہوا چل رہی تھی۔ سارا جنگل وجد میں تھا۔ مسلسل بارشوں سے زمین نم ہو کر نسواری ہو چکی تھی۔ درختوں کے تنوں کی چھال نکھری ہوئی تھی۔ فضا میں چیڑ کی خوشبو اور زمین پر اس کے پتوں کی سوئیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ہم نے سرور سے آنکھیں بند کیں اور لمبے لمبے سانس لینے لگے کہ پاکیزہ معطر ہوا کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو پھیپھڑوں میں ذخیرہ کر لیں۔

میں اور فرید صبح روم سے نکلے تھے اور پر پیچ پہاڑی راستوں سے یہاں تک پہنچے تھے۔ ہمیں مہم جوئی کا اشتیاق کشاں کشاں پہاڑ کے سینے پر پھیلے جنگل میں لیے جا رہا تھا۔ سامنے ایک عمیق کھڈ دکھائی دیا جس کے کنارے قبل از تاریخ آتش فشانی کے نتیجے میں بہنے والی سیاہی مائل چٹانیں یوں لڑھک کر اٹکی ہوئی تھیں جیسے ابھی نیچے گہرائیوں میں گرنے والی ہوں۔ انہی میں ایک مقام پر چوبی قوی ہیکل دروازہ نظر آیا۔

"یار! یہ ان چٹانوں میں دروازہ کیسا ہے؟" میں نے حیرت سے فرید سے کہا۔

"پتہ نہیں۔ آؤ معلوم کرتے ہیں۔"

تجسس نے ہمارا ہاتھ پکڑا اور ہم قوی ہیکل چوبی دروازہ کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے کچھ دیر اس کا جائزہ لینے کے بعد اسے آہستہ سے دھکیلا تو وہ چرچراتا ہوا کھل گیا۔ میں اور فرید اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ درمیان میں کھائی ہے اور بائیں ہاتھ چٹانوں میں لکڑی کے کئی پست قامت دروازے لگے ہیں۔ فرید نے بڑھ کر پہلے دروازے کو دھکا دیا تو وہ بڑی آسانی اور خاموشی سے کھل گیا۔ اندر داخل ہونے تو معلوم ہوا کہ دروازہ چھوٹے سے حجرے میں کھلتا ہے۔ حجرہ چٹانوں کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ سامنے دیوار پر صلیب آویزاں تھی قریب ہی ایک طاقچے میں ادھ جلی شمع دھری تھی۔ زمین پر آرام کے لیے لکڑی کا تختہ پڑا تھا جس پر کمبل بچھا تھا۔ کمبل کی سلوٹیں ظاہر کر رہی تھیں کہ کوئی ابھی ابھی اس پر لیٹ کر اٹھا تھا۔ ایک کونے میں پانی کا گھڑا بھی رکھا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی راہب یا تارک الدنیا کا حجرہ ہے۔" فرید نے کہا۔

"ہاں لگ تو یہی رہا ہے" میں نے حجرے میں رکھی چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

"آؤ دیکھتے ہیں کہ دوسرے دروازوں کے پیچھے کیا ہے" فرید مڑ کر حجرہ سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

دوسرے دروازے بھی مقفل نہیں تھے اور ایک ہی قسم کی چٹانوں سے تراشے ہوئے حجروں میں کھلتے تھے۔ سب میں صلیبیں نصب تھیں اور زمین پر لیٹنے کے لیے تختے پڑے تھے۔ لیکن سوائے پہلے حجرہ کے کسی میں بھی نہ تو پانی کا گھڑا تھا، نہ طاقچوں میں کوئی شمع تھی، اور نہ لکڑی کے تختوں پر کمبل تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سوائے پہلے حجرہ کے سب غیر آباد تھے۔ البتہ آخری حجرہ میں کدالیں، بیلچے اور مختلف قسم کے اوزار رکھے تھے۔ غالباً یہ حجرہ بطور گودام استعمال کیا جاتا تھا۔

ہم گودام سے باہر نکلے تو سامنے ایک گہرا کھڈ تھا جس کی تہہ میں جھانکنے سے چکر سے آنے لگے۔ لیکن اس کی چوڑائی زیادہ نہ تھی۔ اس کھڈ کی چوڑائی پر لکڑی کا ایک مضبوط اور چوڑا تختہ رکھا تھا جو غالباً پل کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کھڈ کی دوسری جانب کھلی جگہ پتھروں سے بنی ایک بے ڈھب سی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ میں اور فرید لکڑی کے تختے پر احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے اس عمارت تک پہنچ گئے۔ اس کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ ہم ادھ کھلے دروازہ سے داخل ہوئے تو اندر نیم تاریکی تھی۔ بڑے سے کمرے میں گنتی کی بنچیں رکھی تھیں۔ سامنے دیوار پر بہت بڑی صلیب نصب تھی جس سے حضرت عیسیٰ کا مصلوب بدن مجسمے کی صورت لپٹا تھا۔ صلیب کے نیچے چبوترہ پر دو دیوقامت شمعیں روشن تھیں۔ جب سے ہم اس اجاڑ خانقاہ میں داخل ہوئے تھے یہ جلتی ہوئی شمعیں زندگی کے پہلے آثار تھے۔

"یا خدا! اس اجاڑ ویران خانقاہ کے چیپل میں یہ جلتی ہوئی شمعیں؟ کیا یہ بھوت پریت کی نگری ہے یا ہمارے تخیل کی کارفرمائی؟" فرید نے تعجب سے دھیمے سروں میں کہا۔

میں اور فرید جانے کس جذبے کے تحت پچھلی بنچوں پر مودب بیٹھ گئے۔ یہ شاید گرجے کے پیدا کردہ احساس تقدس کا اثر تھا۔ فضا میں باسی پھولوں کی اداس مہک بسی تھی۔ ہمارے چاروں طرف عجیب قسم کی خاموشی اور پراسراریت تھی۔ بظاہر نیم تاریک گرجے میں کوئی ذی روح دکھائی نہ دے رہا تھا، مگر یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے خاموشی کے ٹھہرے پانیوں میں کنکری پھینک کر ہلکا سا تلاطم پیدا کر دیا ہو۔ کسی کے سانس کی آواز آ رہی تھی۔ پہلے وہ مدہم سی تھی، لیکن آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی۔ عجیب سی آواز تھی جیسے کسی کا دم گھٹ رہا ہو اور وہ بڑی دقت سے سانس لے رہا ہو۔ "فرید۔ نجانے مجھے کیوں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ کسی کی روح قفس عنصری سے پرواز کرنے والی ہے" میں نے کہا۔

"شاید"، فرید نے متوحش نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

ہم نے نیم تاریکی میں چاروں جانب غور سے دیکھا۔ بظاہر وہاں کوئی نہیں تھا، مگر ہماری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ چبوترے کے ساتھ جڑے دائیں ستون کے پیچھے کوئی ہے۔ قریب جانے پہ معلوم ہوا کہ وہاں کوئی سیاہ ہیولا زمین پر ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، مگر واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ فرید نے لپک کر چبوترے سے شمع اٹھائی تاکہ وہ تاریک گوشہ روشن ہو سکے جہاں وہ شخص بیٹھا تھا۔ شمع کی زرد روشنی میں ہم نے دیکھا کہ وہ ایک عمر رسیدہ راہب تھا جس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ وہ راہبوں کے مخصوص سیاہ لبادے میں تھا۔ وہ اس قدر مدقوق تھا کہ چہرے کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں اور یوں لگتا تھا کہ گوشت پوست کے بجائے جلد کی پتلی سی جھلی اس کی کھوپڑی پر منڈھی ہو۔ البتہ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ان میں ایک کرب تھا۔ دم رخصت کا کرب۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کا استخوانی وجود بس چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔ ہمیں دیکھ کر اس نے اپنے وجود کی ساری بچی کھچی توانائی کے سہارے بولنے کی کوشش کی۔ "میرے بچو تم کون ہو؟"

میں اور فرید عرصہ دراز سے اٹلی میں مقیم تھے، اس لیے اطالوی سمجھتے بھی تھے اور بولتے بھی تھے۔ "ہم روم سے آئے ہیں۔ غیر ملکی ہیں، مگر بسلسلہ ملازمت اٹلی میں رہائش پذیر ہیں۔ آج اتوار ہے، سو صبح سے سیر کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ اس جنگل کی کشش یہاں خانقاہ تک کھینچ لائی ہے۔" فرید نے جواب دیا۔

"اچھا۔ تم پر خدا کی رحمت ہو"، راہب نے اپنے سینے کے زیروبم پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا، "میں فادر انٹونیو ہوں۔ اس خانقاہ کا نگران، اور" اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا اور ہمیں غور سے دیکھنے لگا۔

"اور ۔۔۔ [illegible] کیا" میں نے تجسس سے پوچھا۔

راہب کچھ دیر ہمارا جائزہ لینے کے بعد جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ "دیکھو، میرے بچو! میرا وقت رخصت قریب ہے۔ بہت قریب۔ مجھے لگتا ہے کہ میں کل کا سورج طلوع ہوتے نہیں دیکھ سکوں گا۔۔۔ شاید میں آج کا سورج غروب ہوتے بھی نہ دیکھ سکوں۔ وقت تنگ ہے۔ بہت تنگ۔۔۔ میرے نحیف و نزار جسم میں اتنی سکت نہیں کہ مرنے سے پہلے ایک اہم فریضہ سے سبکدوش ہو سکوں۔ لیکن شاید تم خداوند کی جانب سے بھیجے ہوئے فرشتے ہو جو انسان کے روپ میں دم مرگ اس اہم ذمہ داری کو سنبھالنے ۔۔۔ میرے معاون بننے کو آ پہنچے ہو۔"

راہب کا دم پھولنے لگا اور اس کی حالت پہلے سے بھی زیادہ غیر ہو گئی۔ میں کار سے اتر کر جنگل میں چہل قدمی کے وقت اپنے ساتھ چائے بھرا تھرمس لے آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جنگل میں کسی اچھی سی جگہ بیٹھ کر چائے سے لطف اندوز ہوں گے۔ میں نے راہب کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر تھرمس میں سے تھوڑی سی چائے تھرمس کے ڈھکن میں انڈیل کر اسے پلانے کی کوشش کی۔ غالباً اس کے کھانے کی نالی قریب المرگ ہونے کے باعث سکڑ چکی تھی۔ اس نے چسکی لینے کی ناکام کوشش کی۔ بمشکل چند قطرے کسی طور اس کے حلق تک پھسل گئے۔ اس کے لبوں پر بھی پپڑی ضرور تر ہوئی۔

راہب نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پھر بولنا شروع کیا۔ شاید احساسِ ذمہ داری اس کے ناتواں بدن میں چنگاری کی طرح سلگ رہا تھا۔ "میرے بچو! جب میں زندگی کی سرحد سے پرے نکل جاؤں تو چیڑ کے جنگل میں میری قبر کھودنا اور صندوقچی کو میرے ساتھ دفن کر دینا۔ میری قبر پر کوئی صلیب نہ لگانا، نہ جنگلی پھولوں کا کوئی گلدستہ رکھنا، بلکہ اس کا نشان تک مٹا دینا۔ زمین اس طرح ہموار کر دینا کہ قدرت خود ہی اس پر گھاس اور پودے اگا دے۔"

"آپ اپنی زندگی سے اس قدر ناامید کیوں ہیں؟ اللہ کرے گا آپ بھلے چنگے ہو جائیں گے۔" فرید نے کہنے کو تو یہ جملہ کہہ دیا، مگر وہ اور میں دونوں جانتے تھے کہ یہ محض طفل تسلیاں ہیں۔ ہمیں خود بھی احساس تھا کہ راہب کی واپسی کی گھڑی قریب تھی۔

"تم پر خداوند یسوع مسیح کی رحمت ہو، میرے بچو! میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم مجھے سہارا دینے اور یاس سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جسدِ خاکی سے جدائی کا لمحہ آن پہنچا ہے۔ جامِ زیست چھلک کر بہہ رہا ہے اور اس میں آبِ حیات کے چند قطرے۔ صرف چند قطرے باقی ہیں۔ میرے فرشتو! یہ لمحے بیش قیمت ہیں۔ ان کو بحث یا جھوٹی تسلیوں کی نذر نہ کرو۔ سنو اور غور سے سنو۔ وہ صندوقچی جسے میری لاش کے ہمراہ دفن کرنا ہے، چبوترے کے پتھریلے فرش تلے دبی ہے۔ جلدی سے جاؤ اور آخری حجرے سے کدالیں اور ضروری اوزار لاؤ کہ تمہیں چبوترے کے پتھروں کو اکھاڑنا ہے۔"

فرید جسمانی طور پر مجھ سے زیادہ چست تھا، سو اس نے مجھے راہب کے پاس بیٹھنے کو کہا اور خود لپک کر گودام سے کدالیں اور ضروری اوزار لے آیا۔ جب راہب نے دیکھا کہ سامان آ گیا ہے تو وہ بولا "چبوترے کے عین مرکز میں یسوع مسیح کے مجسمے کے سامنے سے چلنا شروع کرو۔ پانچ قدم چلنے کے بعد دائیں جانب مڑ جاؤ اور پھر دس قدم چلو۔ اس کے بعد سات قدم مرکز کی طرف اٹھاؤ، اور وہ بھی اس طریقے سے کہ ایک مثلث بن جائے۔ پھر اس مثلث کے مرکز میں کھڑے ہو جاؤ۔"

فرید نے چبوترے پر چڑھ کر راہب کی ہدایات پر عمل کیا تاآنکہ وہ راہب کی بیان کردہ مثلث کے مرکز میں گیا اور سوالیہ نظروں سے راہب کی طرف دیکھنے لگا۔

"میرے بیٹے، اس مرکز میں جو پتھر لگا ہے اسے اکھاڑو"

فرید نے کدال سے پتھر اکھاڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ پتھر سختی سے اپنی جگہ جڑا تھا۔ میں نے ری کدال سے فرید کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔ آدھ گھنٹے کی تگ و دو کے بعد پتھر اپنی جگہ سے کھسکا اور باہر نکل اس کے نیچے گہری جگہ تھی۔ اندھیرے کے سبب اس جگہ کے اندر کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ راہب نے شمع کی طرف ہ کیا جو چبوترے پر صلیب کے نیچے جل رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ شمع کی روشنی کی مدد سے گڑھے میں دیکھنے کو کہہ ہے۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق شمع اٹھائی اور گڑھے کے سرے پر دھر دی۔ فرید نے شمع کی روشنی میں ے کو ٹٹولا تو اس کا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا۔ مٹی ہٹانے پر معلوم ہوا کہ کوئی صندوقچی ہے۔ فرید اسے گڑھے سے باہر لایا اور اس پر سے مٹی جھاڑی۔ پتہ چلا کہ وہ ایک آبنوسی صندوقچی ہے جس پر کسی تیز دھار آلے سے کندہ تھا۔

"روم 1547"

راہب نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ صندوقچی اس کے پاس لائی جائے۔ وہ صندوقچی پر کھدے الفاظ پڑھ کر اور قفل پا کر مطمئن ہوا۔ اس کے چہرے پر موت و حیات کی کشمکش سے گزرنے کے باوجود یوں طمانیت کے آثار تھے جیسے وہ کسی بڑے فرض سے سبکدوش ہو گیا ہو۔ "شکریہ۔ میرے بچو، رحمت کے فرشتو! اب میں اطمینان سے ں گا۔ تم نے ایک بھاری سل میرے سینے سے ہٹا دی۔ خدائے برتر تمہیں اس کا اجر دے گا۔ اب یوں کرو کہ مجھے دے کر کسی طور میرے حجرے میں پہنچا دو ـــ اور اس صندوقچی کو بھی۔" فرید اور میں نے اس کی ہدایت پر ردار بچوں کی طرح عمل کیا۔ اسے زمین سے بڑی احتیاط سے اٹھایا۔ فرید نے اس کا ایک بازو اپنے کندھے پر اور دوسرا نے اپنے کندھے پر رکھا اور اسے آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے چیپل سے باہر لے آئے۔ شام گہری ہو کر رات میں ڈھلنے تھی۔ تیز اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ ہم دونوں نے راہب کے قریب المرگ بوجھل جسم کے ساتھ بڑی احتیاط سے اس ے کے تختے کو پار کیا جو گہرے کھڈ پر بطور پل کے کام دیتا تھا، اور بالآخر راہب کو اس کے حجرے میں پہنچا دیا۔ سے حجرے تک کا راستہ زیادہ نہیں تھا، مگر صدیوں پر محیط تھا۔ راہب کا مرتا ہوا جسم نحیف ہونے کے باوجود جانے ، اتنا بوجھل تھا۔ شاید زندگی کی حرارت ماند پڑتے ہی جسم بے جان مادے میں تبدیل ہو کر بھاری ہو گیا تھا۔

فرید نے حجرے میں پہنچ کر اپنا لالٹین روشن کر لیا۔ ہم نے اس کی روشنی میں راہب کو تختے پر نہایت آہستگی لٹا دیا، اتنی آہستگی اور احتیاط سے جیسے وہ کانچ کا نازک برتن ہو۔ پھر فرید نے اپنے لائٹر سے طاق میں رکھی ادھ جلی تی کو جلا دیا۔

راہب کی آنکھوں میں جو مدھم سی لو تھی وہ بس بجھنے کو تھی۔ اس کا جسم موت و حیات کی کشاکش سے ہلکورے لے رہا تھا۔ جانے کتنا وقت بیت گیا۔ فرید دھیرے دھیرے سگریٹ کے کش لگاتا رہا اور میں ـــ میں دم توڑتے ، کی جاں کنی کے باعث جو ذہنی اذیت محسوس کر رہا تھا اس سے فرار حاصل کرنے کے لیے روم میں بسر کیے ہوئے ، آور لمحوں کی یاد سے جی بہلاتا رہا۔

باہر ہوا طوفان کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ہمارا ذہن ساری صورت حال کی سنگینی میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ ہم

ے کے دروازے کو کنڈی لگانا بھول گئے تھے۔ اب ہوا کے زور دار تھپیڑوں سے دروازہ نیم وا تھا اور اس میں سے داخل ، چیختی سیٹیاں بجاتی ہوا نے طاق میں رکھی موم بتی کو گل کر دیا تھا۔ اسی گھڑی راہب کا تشنج زدہ وجود اچھلا اور ہمیشہ ، لیے سرد پڑ گیا۔ میں تیزی سے اٹھا اور کھلا ہوا دروازہ بند کر دیا۔ فرید نے بڑھ کر اپنے لائیٹر سے دوبارہ موم بتی کو ن کیا۔ کمرے میں دوبارہ روشنی ہونے کے بعد میں نے راہب کے سینے سے کان لگا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ واقعی اس کے دل نے دھڑکنا بند کر دیا ہے۔ پھر میں نے راہب کے سینے سے سر اٹھایا اور فرید کی طرف دیکھا وہ ی آنکھوں کے تاثر سے جان گیا کہ راہب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا ہے۔ اگرچہ ہم دونوں کے لیے راہب اجنبی تھا، بھی نجانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی برسوں کا آشنا چل بسا ہو۔ میں نے کمبل سے راہب کی نعش کو نپ دیا۔

"اس وقت تاریکی بھی ہے اور طوفان بھی۔" فرید نے کہا۔

"ہاں" میں نے بھی تائید کی۔

"ہمیں راہب کی لاش دفنانے کے لیے صبح تک انتظار کرنا ہو گا۔"

کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے، اپنے اپنے خیالوں میں گم جیسے دو سائے وقت کا کوہ گراں اپنے کندھوں ٹھائے ہوئے۔ اچانک فرید کو نجانے کیا سوجھی، کہنے لگا "یار کیوں نہ ہم اس صندوقچی کو کھول کر دیکھیں کہ اس میں کیا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے تمہیں شیطان نے بہکایا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیوں بھئی؟ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

ہمیں ایک مرنے والے کی وصیت کا احترام کرنا چاہیے۔"

"احترام تو ہم کریں گے۔ صبح ہم اس صندوقچی کو راہب کی لاش کے ساتھ دفنا دیں گے اور یوں اس سے کیے نے عہد کو پورا کر دیں گے۔"

"اُفوہ! اتنا اشتیاق کس بنا پر؟ صندوقچی میں ہیرے جواہرات تو ہونے سے رہے۔"

"ہاں یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ اس لیے ہم امانت میں خیانت تو کر ہی نہیں سکتے۔ آخر ہمیں کسی طرح وقت بھی گزارنا ہے صبح ہونے تک۔"

جب کچھ دیر فرید کے اسی طرح کے دلائل جاری رہے تو میرے اندر کا کمزور آدمی پسیج گیا۔ درحقیقت سچ تو یہ ہے ، میں خود بھی متجسس تھا کہ آخر صندوقچی کا قصہ کیا ہے۔

ہم نے صندوقچی کی طرف دیکھا تو اسے مقفل پایا لیکن فرید بھی باز آنے والا نہیں تھا۔ باہر نکل کر ایک پتھر اٹھا اور اس کی ضربوں سے بوسیدہ قفل توڑ ڈالا۔ صندوقچی کو کھولا تو اس کے اندر کرم خوردہ زرد کاغذوں کا ایک پلندہ رکھا تھا ربن۔ جب فرید نے کاغذوں کے ٹکڑوں کو احتیاط سے حجرے کے فرش پر بچھایا تو معلوم ہوا کہ سولہویں صدی کا کوئی سودہ تھا جو لاطینی میں لکھا تھا۔ یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ فرید کو اطالوی کے علاوہ لاطینی پر کافی دسترس حاصل تھی۔ سو اس نے پارہ پارہ کاغذوں کو ترتیب دے کر پڑھنا شروع کیا۔ وہ ساتھ ساتھ باآواز بلند میرے لیے ترجمہ کرتا جا رہا تھا۔ کاغذوں کا پلندہ سولہویں صدی کے کسی پوپ کی تحریر تھی۔

مسودہ میں لکھا تھا

"میں اپنے زریں تخت پر متمکن تھا جس کی پشت پر نورانی فرشتوں کی اڑان تھی اور پائیوں تلے ابلیس کے چیلے زیر تھے۔ میں نے ہیروں جڑی کلاہ اور زربفت کا لباس پہنا ہوا تھا' ہاتھ میں آبنوسی عصا تھا جس کے سر پر شفاف ترین شیشے کا گولا لگا تھا اور اس میں ایک ہلفت رنگ تتلی مقید تھی۔ شاید وہ مردہ تھی' لیکن اس کے پروں میں کبھی کبھی یوں بے بس سی لرزش ہوتی جیسے وہ زندہ ہو۔

میں تخت سے اتر کر اپنی آرام گاہ کی طرف چلا تو دربار میں موجود سینکڑوں امراء' کلیسا کے اکابرین اور عقیدت مند احترام سے جھک گئے' کئی دو زانو ہوئے' کئی سجدہ ریز اور بعض نے عبائے مبارک کو بوسہ دینے کی ناکام کوشش کی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ میرے چہرے پر پرغرور وقار اور چال میں طاقت کا سرور تھا۔ گردن یوں اکڑی ہوئی تھی جیسے کلف لگا ہو' آنکھوں میں سنجیدہ متانت تھی' لیکن دربار کے ایک کونے میں ایک ستون کے سائے میں روپوش برادر کلیمینٹ کو دیکھ کر میری آنکھوں کی سنجیدہ متانت تفکر میں ڈھل گئی۔

میں اپنی خواب گاہ میں پہنچ چکا تھا میں نے اشارے سے خدام کو باہر جانے کا حکم دیا' ہاتھ میں پکڑے عصائے آبنوسی اور اس میں لرزاں تتلی کو خوابگاہ کے کونے میں رکھا۔ پھر خود ہی اپنی کلاہ کو نہایت احترام سے اتار کر ایک اونچے طاق میں رکھا اور زربفت کی عبا کو ایک کرسی پر لٹا دیا۔ میں یہ سب کام خود کرتا تھا حتی کہ اپنے ملازم خاص کو بھی کلاہ اور عبا اتارتے وقت کمرے سے باہر بھیج دیتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان پرشکوہ ملبوسات کے بغیر میں محض اسی سال کا کرم خوردہ ضعیف ہوں جس کا سوکھا بدن کسی قسم کا احترام یا عقیدت پیدا کرنے کے بجائے تنفر یا شاید صرف رحم کے جذبات کو جنم دے سکتا ہے۔

آج بھی میں نے خود ہی کلاہ اور عبا اتارے پھر اپنے کمرے کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ روم کا عظیم شہر میری نگاہوں کے سامنے اپنے سینکڑوں عجائب روزگار گرجا گھروں اور تاریخی عمارتوں کے ساتھ کسی تصویر کی کینوس کی طرح کھلا تھا۔ عموماً میں اس منظر سے لطف اندوز ہوتا تھا' مگر آج ـــ آج ماتھے پر بل اور آنکھوں میں بدلیاں سی تھیں۔ احساس ذمہ داری سے میرے کندھے جھکے ہوئے تھے میں پوپ ہونے کے ناتے خداوند یسوع مسیح کا نائب تھا۔ اس لحاظ سے دنیا کے امن و سکون کی دیکھ بھال میرے فرائض منصبی میں سے تھی۔ اور آج ـــ اس وقت یہ دنیا بہت بڑے انتشار کا شکار ہونے والی تھی' اس کا امن اور سلامتی خطرے میں تھی۔ ویسے میرے لیے اصل دنیا یورپ کی سرحدوں تک محدود تھی۔ اس سے پرے صرف وحشی' نیم مہذب اور پسماندہ اقوام کے مسکن تھے۔

میں کھڑکی کے پاس بچھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بظاہر میں کھڑکی سے باہر کے منظر کو دیکھ رہا تھا' لیکن درحقیقت کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں وہیں کرسی پر بیٹھا سوچتا رہا۔ سوچتا رہا حتی کہ سورج روم کی چھتوں سے پرے افق کی قوس میں منہ چھپانے لگا۔ شام کے گجر کی آواز سے روم کے در و دیوار لرزنے لگے۔ میں استغراق سے نکل آیا۔ میں نے دوبارہ زربفت کی عبا زیب تن کی' سر پر کلاہ رکھا اور ہاتھ میں عصائے آبنوسی تھامے کمخواب کی سنہری پائیوں والی کرسی پر متمکن ہوا۔ پھر کمرے کی ایک دیوار سے لٹکی ہوئی رسی کھینچی۔ گھنٹی بج اٹھی۔ ملازم خاص دست بدستہ حاضر ہوا۔ تب میں نے برادر کلیمینٹ کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔

برادر کلیمینٹ کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی' لیکن مسلسل عبادت' ترک' نفس کشی اور خود اذیتی کی

وں کے سبب وقت سے پہلے بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کا جسم دبلا پتلا تھا' کندھے جھکے ہوئے تھے۔ چہرے پر جھریوں کا
تھا' رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں' آنکھوں کے نیچے گھرے حلقے تھے۔

برادر کلیمنٹ کمرے میں داخل ہوا تو جھک کر میری جبانے شانہ کے کونے کو بوسہ دینے کی کوشش کی۔ میں
، فوراً اپنا انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ اس کے سامنے پیش کیا۔ اس نے گھٹنوں کے بل اسے بھی بوسہ دیا۔ پھر میں نے
ب رکھے پست سٹول پر اسے بیٹھنے کا حکم دیا۔ یہ سٹول نے جان بوجھ کر پست بنوایا تھا تاکہ میری موجودگی میں اس پر
ے والا علامتی طور پر اپنے کمتر درجے کو فراموش نہ کر سکے۔

برادر کلیمنٹ سٹول پر بیٹھ گیا۔ میں جاہ و جلال سے مخاطب ہوا۔ "میرے بیٹے! جو کچھ میں نے سنا ہے کیا درست
ہے؟"

"جی۔ جلیل القدر پوپ۔ وہ صحیح ہے۔"

"اچھا تو مجھے ساری روداد الف سے ی تک سناؤ۔

کلیمنٹ کے چہرے پر کرب سا ابھرا۔۔۔ ایک ایسے شخص کا کرب جو جانتا ہے کہ اس کے بیان کو جھٹلایا جانے
۔ لیکن میرا حکم تھا سو بامر مجبوری اس نے نظریں جھکا کر اپنا قصہ شروع کیا۔

"مقدس باپ! آپ جانتے ہیں کہ میں تین سال پہلے مقدس مقامات کی زیارتوں کے لیے مشرق وسطیٰ روانہ ہوا۔
ت المقدس میں ایک سال قیام کے بعد لبنان اور مصر سے ہوتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں چٹانوں کی بلند
س میں زمردیں سمندر بند ہو۔ ان چٹانوں کے عقب میں صحرا ہو۔ اسی مقام پر سینٹ اینتھونی نے مراقبہ کیا تھا اور انہیں
یطان نے بہکانے کی کوشش کی تھی' مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ میں اس مقام کی زیارت کرنا چاہتا
ا۔ سو وہاں پہنچا اور چٹانوں میں واقع ایک غار کو اپنا مسکن بنایا۔ رات کو باہر ٹھنڈی ریت پر سوتا۔ قریب ہی کھجوروں کے
کچھ درخت اور زمین سے ابلنے والا ایک میٹھا چشمہ تھا جہاں سے مجھے کھجوروں کا کھاجہ اور ٹھنڈا میٹھا پانی پینے کو مل جاتا تھا۔
یں اکثر روزے سے ہوتا اور دن رات عبادت میں مشغول رہتا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک رات ریت پر میں جس جگہ لیٹا تھا مجھے
سامنے اندھیرے میں کسی لڑکی کا ہیولا نظر آیا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا تو وہ ہیولا اور واضح ہو گیا۔ میں انگشت بدنداں تھا نہ
صرف اس لیے کہ اس ویرانے میں ایک لڑکی کا کیا کام' بلکہ اس لیے بھی کہ وہ حیرت انگیز طور پر اس لڑکی سے ملتی تھی
جسے میں راہب بننے سے پہلے چاہتا تھا۔ مگر یہ تو بیس برس پہلے کی بات تھی اور یہ لڑکی تو مشکل سے بیس برس کی ہو گی۔

میرے دل میں پرانی محبت جاگ اٹھی اور میں دیوانہ وار اس کی طرف بڑھا' یہ فراموش کرتے ہوئے کہ میں اب
یک مقتدر راہب ہوں۔ میں جوں جوں آگے بڑھتا وہ پیچھے ہٹتی جاتی۔ اس کے حسن و جمال کے سبب میری پرانی وارفتگی
وٹ آئی تھی۔ آخر میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ ممکن تھا کہ میں اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتا اور میرا برسوں کا زہد و
تقویٰ پاش پاش ہو جاتا' مگر شاید میری کوئی نیکی کام آ گئی یا پھر یہ خدا کا کرم تھا کہ ابھی میرے بازو اس کے جسم
کے گرد حمائل ہونے ہی تھے کہ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں جو اب تک اس نے حیاء سے بند کر رکھی تھیں یا کم از کم میں
یہی سمجھا تھا۔ ان آنکھوں میں شیطنت لبالب بھری تھی۔ پھر وہ عجب شر انگیزی سے ہنسی' شاید اپنی کامیابی پر۔ اس پل
مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے اپنے بازو واپس کھینچ لیے۔ پلٹ کر غار کے منہ پر بیٹھ گیا اور اپنے رب کو یاد کرنے لگا۔ لڑکی کی
شبیہہ کچھ دیر اردگرد منڈلاتی رہی اور مجھے بہکانے کے تمام حربے استعمال کرتی رہی' لیکن میں اپنی عبادت میں مشغول رہا
تی کہ صبح کی سفیدی ہر سو پھیلنے لگی۔ تب وہ نازنین طرار رخصت ہوئی۔"

"تو تم جان گئے تھے کہ یہ سب شیطان کی جادوگری ہے۔" میں نے غور سے برادر کلیمینٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی، عزت مآب پوپ!"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"میں چالیس روز تک بلال نا چٹانوں میں واقع غار میں مقیم رہا۔ میری آرزو تھی کہ مجھے خدا کا جلوہ دکھائی دے۔ میں دن رات عبادت میں مشغول رہتا۔ میں نے سب کچھ بھلا کر اپنے خالق سے لو لگا لی۔ شیطان نے مجھے بھٹکانے کی ہر کوشش کی۔ جب میں فاقے سے ہوتا تو وہ سرخ سیبوں اور میٹھی ناشپاتیوں کے باغ میرے گرد اگاتا۔ خوش نما صراحیوں میں سے انگبیں پیش کرتا۔ کبھی میری یاد میں تڑپتے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی تصویریں دکھاتا۔ کبھی کسی حسینہ کے جال سے میرے زہد کا امتحان لیتا۔ بعض اوقات میں یوں محسوس کرتا جیسے میں اس کے چنگل میں گرفتار ہونے والا ہوں۔۔ مگر خداوند یسوع مسیح کی رحمت سے میں ہر مرتبہ بال بال بچ جاتا۔"

یہاں پہنچ کر برادر کلیمینٹ دم لینے کے لیے رکا لیکن میں نے فوراً اسے آگے قصہ بیان کرنے کو کہا۔

"اے کلیسائے ربانی کے پوپ، آخر خدا نے مجھے اپنی موجودگی اور قربت سے نوازنا شروع کیا۔ پہلے تو مجھے خود یقین نہ تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔ اس کا ایک سبب میرے Confessor کے پیدا کردہ شکوک تھے۔ اسے شبہ تھا کہ شاید خدا کی جو شبیہ مجھے دکھائی دی تھی وہ شیطان کا سحر تھا۔ اس لیے اس نے میرے لیے خود اذیتی کی عبادات تجویز کی تاکہ میں شیطان کی فسوں کاریوں سے چھٹکارا پا سکوں۔"

"ہاں میں نے سنا تھا۔ کیا تم نے اپنے confessor کی ہدایت پر عمل کیا؟"

"سو فیصد" مگر عزت مآب پوپ! مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آخر میں جس جلوے سے میری آنکھیں خیرہ ہوئیں وہ صرف رب کا ہے جو زمینوں اور آسمانوں کو عدم سے خلق کرنے والا ہے اور یسوع مسیح کا باپ ہے۔"

"لیکن نہ صرف تمہارا confessor بلکہ اور بھی بہت سے معززین کلیسا سمجھتے ہیں کہ تم شیطان کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس چکے ہو، اور یہ شبیہ جو تمہیں دکھائی دی ابلیس کا سحر ہے۔"

برادر کلیمینٹ کے چہرہ پر دکھ کا رنگ گہرا ہو گیا۔ "جی میں جانتا ہوں کہ یہی کہا جا رہا ہے مجھے اس سلسلے میں بہت ذلت اٹھانی پڑی ہے، مگر مجھے قسم ہے یسوع مسیح کی کہ یہ جلوہ شیطان کی فسوں کاری شمار نہیں کیا جا سکتا۔"

"تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟" میں نے متفکر لہجے میں دریافت کیا۔

"اے کلیسائے ربانی کے جلیل القدر پوپ! شیطان کی تخلیق کردہ تماثیل میں وہ حقیقت اور وضاحت نہ تھی جو خدا کے جلوہ میں ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بعد پشیمانی سی ڈسنے لگتی تھی اور احساس گناہ سے دل بوجھل ہو جاتا تھا۔ لیکن اس جلوہ ربانی کے بعد عجیب قسم کی ٹھنڈک اور طمانیت سارے وجود میں اتر آئی جیسے میں نے گوہر مقصود کو پا لیا ہو۔ اس جلوے کے بعد میرے اندر انقلابی تبدیلیاں ظاہر ہو رہی ہیں میں اپنے آپ کو نیا اور بہتر انسان محسوس کر رہا ہوں۔"

"ایک اور رائے یہ ہے کہ تم من گھڑت قصے بیان کرتے ہو۔" میں نے برادر کلیمینٹ کو اپنی باریک بین نگاہوں سے چھلنی کرتے ہوئے ایک اور ضرب لگائی۔

برادر کلیمینٹ کی آنکھوں میں اذیت سی جل اٹھی اور چہرے پر جھریاں سی تیرنے لگیں۔ وہ یکدم پہلے سے زیادہ بوڑھا اور خستہ حال دکھائی دینے لگا۔

"محترم پوپ، میں نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا، اگرچہ میں اور بہت سے گناہوں کا مرتکب ہو چکا ہوں۔"
جس خلوص سے برادر نے یہ الفاظ کہے، اس سے میرا دل موم ہو گیا، لیکن بظاہر میں نے غیر جذباتی اور خشک لہجے میں کہا۔ "اچھا تو میرے بیٹے، اب آسمانی باپ کی قسم کھا کر بتاؤ کہ تم نے چٹانوں کی ہلالی قوس میں بند زمردیں سمندر کے کنارے کیا دیکھا۔"
"عظیم المرتبت پوپ، جب چٹانوں کی ہلالی قوس میں بند زمردیں سمندر کے کنارے میری عبادت کو چالیس روز پورے ہونے تو رات کے وقت میں صحرا کی ٹھنڈی ریت پر لیٹا ستاروں کو تک رہا تھا، اس سمے ایک آواز کہ صراحی کی قلقل کی مانند تھی کہیں سے صحرا کی بسیط وسعتوں سے ابھری اور سرگوشی کی مانند ہوا کے دوش پر میرے ذہن کو تتلی کی طرح چھوا جیسے مضراب ساز کے تاروں کو مترنم کر دیتا ہے ـــ وہ سرگوشی میرے گرد منڈلانے لگی ـــ یا پھر شاید میرا وجود اس کے گرد یوں منڈلانے لگا جیسے شہد کی مکھی پھولوں کے گرد۔ پھر میرے کانوں نے سنا خدائے برتر کی شیریں آواز کو ـــ اس سرگوشی کو جو سمندر کی عمیق گہرائیوں اور صحرا کی بسیط پہنائیوں سے ابھر کر زمین و آسمان پر چھا گئی تھی اور میرا وجود اس میں غلطاں و پیچاں تھا۔"
"اس آواز نے تم سے کیا کہا؟" میں نے بیتابی سے سوال کیا۔
"اس نے کہا کہ قربت کے اس پل، قربت کی اس گھڑی میں ہم خوش ہیں۔ تم سے خاص طور پر۔ سو میرے بندے، اگر تیری کوئی تمنا ہے تو بتا۔" میں خضوع و خشوع سے گڑگڑا کر گویا ہوا کہ اے زمینوں اور آسمانوں کے خالق، مجھے اپنے جلوہ سے نواز۔ آواز آئی کہ ہماری تجلی نے تو موسیٰ کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا اور کوہ طور کو بھسم کر دیا تھا تو جو پیغمبر بھی نہیں، صرف ایک عام بندہ ہے، ہمارے جلوہ کی تابناکی کو بھلا کیسے سہار لے گا۔" مگر میں گڑگڑاتا رہا۔
نجانے کب تک، ایک گھڑی یا ایک صدی۔ آخری دھیمی سی سرگوشی نے میرے کانوں میں رس گھولا۔ "ہم نے سوچا ہے کہ تمہاری تمنا پوری کر دیں، لیکن تمہاری محدود بصارت لامحدود کا احاطہ نہیں کر سکے گی۔ سو ہم اپنے سارے وجود کے بجائے صرف ایک حصہ تم پر منکشف کریں گے اور اس کی جسامت بھی صرف اس قدر ہو گی کہ تمہاری محدود قوت بصارت اسے دیکھ سکے۔" اس کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے صحرا کی بے پناہ وسعتوں سے آندھی اٹھی، سمندر کی بے اتھاہ پہنائیوں سے بخارات کی ایک چادر جو تاحد نظر تن گئی اور آسمان سے ایک دیوزاد ہیولا اترنے لگا۔ پھر آندھی، بخارات اور ہیولا ـــ سب یک جان ہو گئے۔ ان کے منتشر اجزاء یکجا ہونے اور دیکھتے ہی دیکھتے دو ہاتھ نمودار ہونے جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہونے تھے ـــ یہ خدا کے ہاتھ تھے۔ ان کا رنگ سیاہ تھا۔ انگلیاں اور انگوٹھے چپٹے اور بھرے تھے۔ ناخنوں میں مٹی پھنسی ہوئی تھی جیسا کہ ہاتھ کی محنت کرنے والوں کا خاصہ ہے۔ جب میں نے ان ہاتھوں کا دیدار کیا تو مجھ پر ہیبت و رقت کی ملی جلی کیفیات طاری ہو گئیں۔ میں سجدہ ریز ہوا۔ مجھے یقین کامل تھا کہ بے شک یہ زمینوں، آسمانوں اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے اور ان پر جو کچھ بھی ہے ـــ ان سب کو مٹی سے بنانے والے کے ہاتھ ہیں۔"
یہاں پہنچ کر برادر کلیمنٹ رک گیا، لیکن اس کی آنکھوں میں یقین کی شمع تھی اور لہجے میں سچ کو پہچان لینے والے کا اعتماد۔ اسے یہ کہہ کر جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا کہ جو کچھ اس نے دیکھا وہ ابلیس کی شعبدہ بازی تھی۔ میری اور اس کی آنکھیں چار ہوئیں تو میں نے نگاہیں جھکا لیں۔ اب اس سے مزید کچھ کہنا بے سود تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کو کہا۔ وہ تعظیم سے جھکا اور پھر میری خوابگاہ کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔
اس طویل ترین، پراسرار اور فیصلہ کن رات میں نے سونے کے بجائے دو اہم کام کیے۔ ایک تو میں نے دو روز

میں نئی دنیا کے ایک نامعلوم حصے کی جانب روانہ ہونے والی مہم کے ساتھ برادر کلیمینٹ کی بطور Priest اور مشنری تقرری کا فوری حکم نامہ صادر کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ مہم جان لیوا اور سفر جان جوکھوں کا تھا۔ اول تو سفر کی طوالت اور صعوبت سے کلیمینٹ جانبر نہ ہو سکے گا، اور بالفرض ایسا نہ بھی ہو سکا تو میں نے اس دور افتادہ خطے کے نیم وحشی قبائل کے بارے میں سن رکھا تھا سو وہ ان کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

اس حکم نامے کو جاری کرنے کے بعد میں نے قلم اور کاغذ سنبھالے اور کلیمینٹ کی سرگزشت شروع سے آخر تک لکھ ڈالی۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا یہ تضاد نہیں تھا کہ ایک طرف تو میں کلیمینٹ کی تہلکہ خیز واردات کو سربستہ راز رکھنے کے لئے ایک لحاظ سے اس کی موت کے پروانے پر دستخط کر چکا تھا اور دوسری طرف میں خود اس راز کو باقاعدہ دستاویزی شکل دینے میں مصروف تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرا محرک کیا تھا۔ کیا یہ میرے ضمیر کی دبی دبی دستک تھی جس نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا یا پھر یہ میرے ہمزاد کی شرارت تھی جو میرے عمل کی کسی نہ کسی شکل میں نفی کرنے پر تلا ہوا تھا۔

بہرحال میں نے دستاویز مکمل کرنے کے بعد اسے ایک آبنوسی صندوقچی میں سربمہر ڈالنا ہے اور صندوقچی کو مقفل کر کے آج رات ہی اپنے ایک وفادار کارندے کے ہاتھ اطالیہ کے ایک دور دراز علاقے کی طرف روانہ کرنا ہے۔ جہاں بلند پہاڑوں اور دشوار گزار گھاٹیوں میں کہیں ایک چھوٹی سی خانقاہ واقع ہے جو دنیا سے کٹی ہوئی ہے۔ وہاں کے بڑے راہب کے سپرد یہ صندوقچی کر دی جائے گی اور اسے خانقاہ میں واقع چیپل کے متبرک چبوترے میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے گا۔ لیکن خانقاہ کے بڑے راہب کو یہ ہدایت کر دی جائے گی کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے جانشین راہب کو اس جگہ کے بارے میں بتائے گا جہاں صندوقچی دفن ہے؛ ہر جانشین اپنے جانشین کو موت سے پہلے صندوقچی کی جگہ کے بارے میں آگاہ کرے گا۔ یوں یہ راز سینہ بہ سینہ چلتا رہے گا، اگرچہ ان راہبوں میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ آخر اس آبنوسی صندوقچی میں کیا ہے، لیکن وہ عظیم المرتبت پوپ کی جانب سے سونپے ہوئے فریضے کو واجب الاحترام جانتے ہوئے ہمیشہ اس صندوقچی کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

اب میں اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں۔ پو پھٹنے والی ہے۔ ابھی مجھے صندوقچی کی روانگی کے لیے ضروری ہدایات جاری کرنی ہیں اور پھر اپنی بوڑھی ہڈیوں اور تھکے ہوئے ذہن کے ساتھ کچھ دیر بستر پر لیٹنا ہے۔ لیکن میں مطمئن ہوں۔ بہت مطمئن کہ میں نے دنیا کو ایک بہت بڑے انتشار سے بچا لیا ہے۔"

راقم پوپ

جب یہ دستاویز اختتام کو پہنچی تو میں نے اور فرید نے بڑی گمبھیر نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

باقی ماندہ رات ہم دونوں نے بحثنے میں صرف کی، لیکن اس ساری بحث وتمحیص اور دلائل و براہین کے باوجود صبح ہوتے ہی ہم جنگل میں ایک مناسب اور نگاہوں سے اوجھل مقام پر بوڑھے راہب کی قبر کھودنے، صندوقچی اور راہب دونوں کو دفنانے کے بعد واپس روم کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ہم نے قبر کے اوپر مٹی ڈال کر زمین ہموار کر دی تھی تاکہ قبر بے نشان ہو جائے۔ اس کے علاوہ ہم نے اس پر جھاڑ جھنکار اور گھاس پھوس پھیلا دیا تھا تاکہ تازہ کھدائی کے آثار چھپ جائیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ چند ہی روز میں گھاس اور خود رو پودے اس جگہ کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے کر ہمیشہ کے لیے اس قبر کے نشانات مٹا ڈالیں گے۔

میں اور فرید روم واپس جاتے ہوئے پوپ کی طرح مطمئن تھے اور ہم نے ایک بار پھر دنیا کے امن و آشتی اور انسانیت کے سکون و آرام کو غارت و تاراج ہونے سے بچا لیا تھا

ماما نوچیا

فرحت پروین (امریکہ)

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے بے دلی سے ریسیور اُٹھایا۔ میری نظریں بدستور کتاب پر تھیں۔ میں نے بے دھیانی سے ہلو کہا۔ لیکن نامانوس لہجے میں نامانوس سی آواز سُن کر مجھے پوری طرح متوجہ ہونا پڑا۔

یہ نوچیا تھی۔ میں اس سے صرف دو بار مل تھی۔ دوسری ملاقات نے میرے دل پر گہرے نقش چھوڑے تھے۔ ایک دو مجھے اس کی یاد آئی۔ پھر میں اپنی گوناگوں مصروفیتوں میں اُسے بھول گئی۔ ہاں اُس ملاقات کی یاد کا ایک ننھا سا خوبصورت دیا میں نے نے فخر و غرور کے طاق میں جلا کر رکھ دیا اور کبھی کبھی اُسے جھانک کر دیکھنے پر ایک مغرور مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر بکھر جاتی۔ میرا کچھ اور اونچا ہو جاتا اور چند لمحوں کے لئے میں روحانی سکون کی لہروں پر جھولنے لگتی۔

مگر آج نوچیا کی محبت اور عقیدت و احترام میں ڈوبی ہوئی آواز نے مجھے احساسِ جرم کے گہرے دلدل میں اُتار دیا ہے۔ فخر و غرور کے طاق میں جلتا ہوا وہ دیا اب شیطانی آنکھ کی طرح مُسکرا رہا ہے اور میرا قد بہت چھوٹا ہو گیا ہے۔ میں خود بالکل بونی محسوس کر رہی ہوں۔

یہ چھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ ہم سب دن بھر لان میں کام کرتے رہے۔ میں تھکی ہوئی تھی اور سب کو بہت بھوک بھی ہوئی تھی تو کھانا بنانے اور پکنے کا انتظار کرنے کے بجائے پیزا منگوانے پر اتفاق ہو گیا۔ میرے بڑے بیٹے نے کہا۔ "میں جاکر لے آتا ہوں۔ گھر پر ڈیلیور کرنے میں پون گھنٹہ ضرور لگ جاتا ہے۔ میں ابھی پانچ منٹ میں آیا۔"

پیزا بہت ہی لذیذ تھا۔ "اچھا بوجھو بھلا کہاں کا ہے؟" میرا بیٹا اترایا۔ ہم سب اپنے اندازے بتاتے رہے۔ ب اُس نے بتایا کہ وہ ماما نوچیا سے لایا ہے۔

"ماما نوچیا!" ہم سب نے حیرت سے دہرایا۔ ہم نے یہ نام آج تک کبھی نہیں سُنا تھا۔ میرے بیٹے نے بتایا کہ اُس کے ساتھ ایک اطالوی لڑکا انٹونیو پڑھتا ہے۔ یہ اس کے بڑے بھائی ماریو کی دکان ہے۔ ابھی اُسے دکان کھولے چند ہی ماہ ہوئے ہیں۔ ان کی ماں کا نام نوچیا ہے اور انہوں نے اپنی ماں کے نام پر اس کا نام ماما نوچیا رکھا ہے۔

"اچھا تو یہ لوگ اتنا خیال کرتے ہیں ماؤں کا۔" مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔

"ہاں امی۔ یہ لوگ بالکل ہماری طرح خاندان، رشتہ داریوں اور والدین کا بہت خیال کرتے ہیں۔ انٹونیو بہت اچھا لڑکا ہے۔ اُس کا بھائی بھی بہت اچھا ہے۔ اُن کی امی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ کہہ رہی تھیں کبھی اپنی امی کو لے آؤ یا پھر مجھے لے جاؤ۔ وہ روز شام کو دکان پر آجاتی ہیں۔ بہت اچھی خاتون ہیں۔"

"اچھا مل لیں گے کبھی" میں نے ٹال دیا۔

کوئی چار پانچ روز بعد شام کے وقت میں کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھی ٹی۔ وی دیکھ رہی تھی کہ میرے بیٹے کا فون آیا۔
"امی آپ گھر پر ہیں نا؟"

"ہاں۔ کیوں کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں انٹونیو کی ماما کو لا رہا ہوں۔"

"نہیں بھئی۔ سارا گھر بکھرا پڑا ہے۔ خود میرا بُرا حال ہے۔ پھر کبھی سہی!"

"نہیں امی پلیز!" وہ پریشان ہو گیا۔ "اب میں انہیں کیا کہوں۔ اچھا ایسا کریں۔ آپ آ جائیں۔ میں آ کر لے جاتا ہوں!"

"چلو ٹھیک ہے!" میں مجبوراً مان گئی۔

لوچیا اتنی محبت سے مل کر میں دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔ لیکن مجھ سے ملنے کے اتنے شدید اشتیاق کی وجہ میری سمجھ ں نہیں آ رہی تھی۔ دکان کے اندر گاہک بیٹھے تھے۔ ہم دونوں باہر جا بیٹھے۔

لوچیا امریکیوں کی طرح گورے رنگ، ستواں نقوش اور نیلی آنکھوں والی خاتون تھی۔ قد و قامت مناسب اور اسب تھا۔ اس کا چہرہ میک اپ اور آرائش و زیبائش سے بے نیاز تھا۔ وہ آسمانی رنگ کی سادہ سی لمبی سکرٹ اور سفید ؤز میں ملبوس تھی۔ اس نے اپنے بال مصر عورتوں کے انداز میں چھوٹے چھوٹے ترشوا رکھے تھے۔ اگر اس کے بال تھوڑے لمبے یا باب تے تو وہ بہت کم عمر لگتی۔ اب بھی وہ اتنے تنومند اور جوان بیٹوں کی ماں کے بجائے بہن لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت عتماد کی جگہ ایک سادگی اور بے بسی سی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی، مسکرا رہی تھی، لیکن اس عمل میں اس کی آنکھیں حصہ نہیں لے رہی یں۔ ہنستے مسکراتے میں بھی اس کی آنکھوں کی بے بسی قائم تھی۔ لگتا تھا یہ اس کے جسم کا حصہ ہی نہیں۔

رسمی گفتگو کے بعد اس نے بڑی انکساری سے کہا "ذرا میرا ہاتھ تو دیکھ دو۔ دیکھوں تو مستقبل کے پاس میرے لئے کیا ہے۔"

میں اس اچانک فرمائش پر حیران رہ گئی۔ اس نے ہتھیلی میرے سامنے پھیلا دی۔ مجھے اس کی سادگی پر پیار آ گیا۔ وہ سچ ادہ دل تھی۔ آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔ میں نے اس کے ہاتھ کو بڑی محبت سے تھام لیا اور معذرت خواہانہ انداز میں "مگر میں پامسٹری کے متعلق کچھ نہیں جانتی ڈیئر!"

"پلیز!" اس نے منت سے کہا اور امداد طلب انداز میں میرے بیٹے کی طرف دیکھا جو اس دوران ہمارے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

"دراصل امی پسند نہیں کرتیں کہ وہ لوگوں کے ہاتھ دیکھیں، اس لئے وہ اپنے اس علم کا چرچا پسند نہیں کرتیں۔ لیکن امی یہ کل میری ماما جیسی ہیں ان کا ہاتھ دیکھ دیجئے!" میں نے اسے گھورا مگر اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ تب دونوں یک ساتھ بڑی خوشامد سے کہا "پلیز!"

"تیری تو میں گھر جا کر خبر لوں گی پامسٹ کی اولاد!" میں نے اردو میں کہا۔

اس نے بھی اردو میں سمجھایا کہ "یہ بیچاری بہت سیدھی اور ضعیف الاعتقاد خاتون ہیں۔ اپنے بچوں کے مستقبل ے بہت پریشان رہتی ہیں۔ انہیں دو ایک اچھی سی باتیں بتا دیں۔ انہیں سوچ سوچ کر خوش ہوتی رہیں گی تو آپ کا کیا چلا ے گا۔"

بات میری سمجھ میں آ گئی۔ جب پتھریلی حقیقتیں ہر راستے میں پتھر اور دیواریں بن کر جسم اور روح کو زخمی کریں تو یہ چھوٹے نفسیاتی سہارے، چند سنہری امیدیں، کچھ سہانے خواب، ان چوٹوں کے درد کو سہنے میں مدد دیتے ہیں۔" اچھا

ہے۔ ابھی جانے سے پہلے دیکھ لوں گی۔" میں نے کچھ جھوٹ گھڑنے کے لئے تھوڑی سی مہلت چاہی۔ در اصل میں پامسٹری
سے بھی واقف نہیں کیونکہ میرا اِن باتوں پر اعتقاد ہی نہیں۔ خواہ مخواہ ذہن کو الجھاتی ہیں یہ چیزیں۔

اب اس کے اتنے شدید اشتیاقِ ملاقات کی وجہ میری سمجھ میں آگئی تھی۔ یہ میرے بیٹے کی شرارت تھی یا پوچھا کے مزاج
تے ہوئے اُسے تسلی دینے کی کوشش۔ بہر حال اب انکار کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے تین بیٹوں اور شوہر کے
اوسط درجے کی مطمئن زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک اس کا شوہر ہارٹ اٹیک سے چل بسا۔ بچے اچھے سکولوں میں پڑھ
تھے۔ "ہمارے پاس تھوڑا بہت پیسہ جمع تھا ہم یقیناً ایک دو سال میں مکان خریدنے کے بھی قابل ہو جاتے۔ ابھی تو انھوں نے
تھا۔ ابھی تو اس نے ریٹائرمنٹ پلیننگ بھی نہیں کی تھی۔ ہم نے بہت کم عمری میں شادی کی تھی۔"

"ہاں وہ تو تمہیں دیکھ کر لگ ہی رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تو ابھی نویں جماعت میں تھی۔ پھر میں نے تو سکول چھوڑ دیا لیکن انھوں نے ہائی سکول پورا کیا اور کچھ پروفیشنل کورسز
۔ وہ ریئل اسٹیٹ کا کام کرتا تھا۔ اچھی بھلی گزر بسر ہو رہی تھی۔ یہاں پبلک سکول بہت اچھے ہیں مگر ہم نے اپنے بچوں کو
ویٹ سکولوں میں بھیجا تھا۔ انھوں کو بہت شوق تھا کہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتے" اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

تھوڑی دیر ضبط کی کوشش میں وہ اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ پھر بولی "تمہیں معلوم ہے کیا ہوا؟ میرے بڑے بیٹے کو پڑھائی
نی پڑی۔ ابھی وہ صرف اکیس سال کا ہے۔" اس نے بڑے پیار سے اندر کام کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو دیکھا اور اس کی آنکھیں ایک
ر بھر گئیں۔ "جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو یہ چودہ سال کا تھا۔ دوسرا بیٹا دس سال کا اور چھوٹا سات سال کا تھا۔" وہ اچانک اٹھ
یرے لئے کوئی ڈرنک لینے اندر چلی گئی۔ غالباً اُسے ڈر تھا کہ وہ آنسو جو وہ بڑی مشکل سے ضبط کئے ہوئے تھی، میرے سامنے ٹپک
ڑیں۔

وہ لوٹی تو مسکرا رہی تھی اب میں جان چکی تھی کہ اس کی آنکھیں اس کی مسکراہٹ کا ساتھ کیوں نہیں دیتیں۔ اب اُس نے
وع بدل دیا۔ وہ میرے لباس کی تعریف کر رہی تھی۔ جوتوں کو حیران ہو کر دیکھ رہی تھی۔ میں شلوار سوٹ اور کھسہ پہنے ہوئے تھی۔

"میں سوچ رہی ہوں۔ میں اِس لباس میں کیسی لگوں گی۔" وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس دی۔

"بہت اچھی لگو گی۔ کبھی میرے پاس آنا تو اپنے لئے ایک آؤٹ فٹ لے جانا۔"

"سچ!" اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ تو تم پارٹی ڈریس پہنے ہوئے ہو نا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں تو۔ یہ عام پہننے کا ہے۔"

"اوہ۔ ونڈرفل۔ بالکل پارٹی ڈریس لگتا ہے۔ بہت گریس ہے اس ڈریس میں۔"

میں بھی اپنے ملک کے لباس کی تعریف سن کر پھول گئی اور خوش ہو کر بولی۔ "لاؤ تمہارا ہاتھ دیکھیں اور پھر چلتے
ں، کافی دیر ہو گئی ہے۔"

وہ تو انتظار ہی میں بیٹھی تھی۔ جلدی سے ہاتھ پھیلا دیا۔ میں بڑے ماہروں کی طرح اس کے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر مختلف
اویوں سے دیکھتی رہی اور وہ بہت مؤدب ہو کر سانس روکے بیٹھی رہی۔ "ہوں" میں نے گہری فکر سے نکلتے ہوئے ہنکارا
بھرا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کو تھا۔ اس کا اعصابی تناؤ بڑھتا جا رہا تھا اور وہ بڑی نروس دکھائی دے رہی تھی۔

"بس۔ تم نے جتنی مشکل کاٹنی تھی کاٹ لی۔ اب تمہارے اچھے دن آنے والے ہیں۔" میں نے اس کے چہرے کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔
وہ منظر میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کا سفید چہرہ صرف ایک لمحے میں یوں گلابی ہوگیا جیسے کسی نے رنگ میں ڈبو دیا ہو۔ اس گلابی رنگ میں اس کی نیلی نیلی آنکھیں کانچ کی گڑیوں کی طرح بہت واضح ہوکر چمکنے لگیں۔ "سچ؟" اس نے بے یقینی سے کہا
"بالکل سچ۔" میں نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔
لیکن جلد ہی اس کی کیفیت نارمل ہوگئی۔ "مجھے تو کسی نے بتایا تھا۔" اور وہ خاموش ہوگئی غالباً وہ اپنی وقتی خوشی یا خوش فہمی میں کسی ناگوار بات کا ذکر نہیں کرنا چاہتی تھی۔
"کیا بتایا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔ یہی کہ ..... بس کچھ نہیں۔" اس نے نہ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔
میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ "ادھر آؤ۔ تم بھی اپنا ہاتھ دکھاؤ۔" ماریو نے اپنا تندرست مضبوط ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی کہ وہ ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا صرف ان کے کہنے پر آگیا ہے۔
"یہ میرا بہت اچھا بیٹا ہے —— بڑا محنتی۔"
"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔
اور اس کے جواب دینے سے پہلے اس کی ماں بولی۔ "یہ بتاؤ۔ اس کے لئے یہ کاروبار اچھا رہے گا جو اس نے شروع کیا ہے؟"
"خوب چمکے گا۔" میں نے بڑے یقین سے کہا اور اس نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔
"آپ ماما کو بتائیں" اور وہ واپس چلا گیا۔ ماں پکارتی ہی رہی کہ اچھی طرح دکھا لو۔ اتنے میں منجھلا انٹونیو ہمارے پاس آکر کھڑا ہوا۔ ماں نے اسے بھی ہاتھ دکھانے کو کہا۔ اس نے بڑے آرام سے کہا کہ وہ مستقبل کے متعلق نہیں جاننا چاہتا۔ وہ سرپرائز پسند کرتا ہے۔ پہلے سے جان لینے اور پھر انتظار کرنے میں لطف ختم ہو جاتا ہے۔
اب تو جیا میرے سر تھی کہ نہیں کچھ تفصیل سے بتاؤ۔ میں نے اسے بتانا شروع کیا کہ پچھلے کافی عرصے سے ان پر خاصا وقت گزرا ہے لیکن اب وہ وقت کٹنے والا ہے۔ اور محض رعب گانٹھنے اور بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے میں نے مزید ذکر کیا کہ مستقبل قریب میں ان پر کچھ پریشانی آنے والی ہے لیکن وہ پریشان بالکل نہ ہو کیونکہ وہ پریشانی جب کٹ جائے گی اور ضرور کٹے گی تو سمجھ لینا کہ اب اس کے بعد اور کوئی پریشانی نہیں آئے گی اور تمہارے اچھے دن شروع ہو گئے ہیں۔
"کس قسم کی ہوگی وہ پریشانی؟" وہ ابھی سے پریشان ہوگئی۔
میں پچھتانے لگی کہ یہ میں نے کیا بک دیا ہے لیکن اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے کہہ دیا کہ بس کاروباری یا مالی ہوگی۔ کوئی فکر کی بات نہیں جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔
"اچھا۔" اس نے فکرمندی سے کہا۔
میں اٹھنے لگی تو اس کی جیسے ابھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ جلدی سے بولی۔ "ذرا دیکھ دو میرا چھوٹا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا؟"
مجھے اس کی سادگی پر ہنسی آگئی "وہ تمہارے بیٹے کے ہاتھ سے پتہ چلے گا۔ اس کی قسمت تمہارے ہاتھ پر کیسے لکھی ہوئی ہے۔ کیا ہے تمہارے بیٹے کو؟" میں نے پوچھا۔

"بیمار ہے۔ ہسپتال میں ہے۔" اور پھر اس نے ایکدم موضوع بدل دیا۔ "میرے پاس آجایا کرو کبھی۔ میرا کوئی دوست نہیں۔
بہت اکیلی ہوں اسی لئے شام کو بچوں کے ساتھ آجاتی ہوں۔"

"میری طرف آجایا کرو۔ میں تمہیں بور نہیں ہونے دوں گی۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔ لیکن اس کے شکریے میں دوستانہ بے تکلفی
بجائے عقیدت و احترام کا رنگ غالب تھا۔

یہ اپریل کا مہینہ تھا۔ موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ امریکہ کے مشرقی ساحلوں پر شدید اور طویل سردیوں کے باعث خوشگوار موسم
دورانیہ بہت قلیل ہوتا ہے اس لیے اس موسم سے لطف اندوز نہ ہونا کفرانِ نعمت کے مترادف ہوتا ہے۔ میں بھی جوگنگ شوز پہن کر
موسم سے لطف اندوز ہونے اور سیر کرنے کے لیے دروازے سے باہر نکلی۔ عین اسی وقت ٹوچیا مجھے ڈرائیو وے میں آتی دکھائی دی۔
اس خوشگوار سرپرائز پر مسکراتی ہوئی استقبال کے لئے بڑھی۔

"مجھے افسوس ہے میں فون کئے بغیر آگئی۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ آپ کہیں جا رہی تھیں۔ میں آپ کے پروگرام میں حارج ہوئی!"

"نہیں بھئی۔ میں صرف ٹہلنے جا رہی تھی۔ تم نے میرے جوتے نہیں دیکھے؟"

اسے کچھ تسلی ہوئی۔ میں اسے اندر لائی اور بیٹھنے کو کہا۔ وہ صوفے کے کونے پر ٹک گئی۔ وہ بہت مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا بات ہے تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

اور وہ ایکدم صوفے سے اتر کر میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ دعائیہ انداز میں جڑے ہوئے تھے۔ اس کا
سارا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا جیسے وہ سسکیوں کو روکے بیٹھی ہو۔ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ میں کچھ نہ سمجھ سکی۔ "یہ
کیا کر رہی ہیں آپ؟ آئیں ادھر بیٹھیں۔" میں نے شرمندہ سی ہو کر کہا۔

لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں اور پھر جیسے کسی ندی کا بند ٹوٹ جائے۔
آنسو اتنی تیزی سے اس کی آنکھوں سے بہنے لگے کہ مجھے لگا، کانچ کی وہ نیلی گولیاں بھی پانی بن کر بہہ جائیں گی۔ میں گھبرا گئی۔ "کیا بات ہے
ٹوچیا۔ کچھ تو بتاؤ۔" لیکن لگتا تھا وہ اپنی حسِ سماعت کھو بیٹھی ہے۔ بڑی مشکلوں سے میں نے اسے اٹھا کر صوفے پر بٹھایا اور کچن
سے اس کے لیے پانی لینے چلی گئی تاکہ اسے خاموش کرا سکوں۔

جب میں لوٹی تو وہ پتھر کی طرح ساکت و صامت بیٹھی تھی۔ میں نے اسے ڈرنک پیش کی۔ اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "پی
لو۔" میں نے اصرار کیا۔ اس نے گلاس اٹھایا میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ گلاس ٹیبل پر رکھ کر ایکدم پھر دو زانو ہو گئی اور ہاتھ جوڑ دیئے۔

خدایا میں کیا کروں! میں پریشان ہو گئی۔ آخر یہ کچھ بولے بھی تو۔

اور پھر وہ بولنے لگی۔ "تم میرے لئے کچھ کرو۔ مجھے معلوم ہے تم کر سکتی ہو۔ تم ہی کر سکتی ہو۔ تم سب جانتی ہو۔ تم نے بالکل سچ
کہا تھا۔ وہ کاروباری اور مالی مصیبت آچکی ہے۔ اب تم ہی ہمیں اس سے نکالنے کے لئے کچھ کر سکتی ہو۔ کچھ کرو پلیز۔" اور وہ نیلے کانچ
پھر پانی بن کر ندی کی روانی سے بہنے لگے۔

"اچھا پلیز اس طرح نہ کرو۔" مجھے شدید احساسِ جرم ہونے لگا تھا۔ "میرے پاس بیٹھ کر آرام سے بتاؤ کہ قصہ کیا ہے؟"

تب اس نے دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ "میرا یہ بیٹا بہت اچھا ہے۔ اتنی کم عمری میں اس نے اتنی محنت کی ہے۔ وہ
چاہتا تھا کہ بجائے اس کے کہ سب مزدور بنیں، وہ قربانی دے گا اور باقی دو بھائیوں کو پڑھائے گا۔ چودہ سال کی عمر ہی کتنی ہوتی ہے۔
وہ تب سے کام کر رہا ہے۔ کم عمری کی وجہ سے اسے کام بھی تو نہیں ملتا تھا۔ تب یہ اخبار بانٹتا تھا۔ لوگوں کے لان سے گرمیوں میں

تے اور سردیوں میں ٹماٹیو وصے سے برف صاف کرتا تھا اور پھر جب یہ اٹھارہ سال کا ہوا تو اس نے دو جگہوں پر کام کرنا شروع کر
یا اُسے معلوم تھا کہ اِن کاموں سے وہ اتنا نہیں کما سکتا کہ بھائیوں کو کالج میں پڑھا سکے۔ ہم نے کفایت شعاری سے کام لینا شروع کیا اور
ں طرح ہم کچھ پیسے بچانے کے قابل ہو گئے۔ اب ایک پارٹنر کے ساتھ مل کر پیزا کی دکان کھولی ہے۔ ہم اٹیلین ہیں۔ پیزا تو ہماری
سپیشلٹی ہے۔ پارٹنر نے کہا ڈاؤن پے منٹ تم کر دو۔ قسطیں اور بل میں دیتا رہوں گا۔ میرے بیٹے نے ساری دکان سیٹ کی۔
ہرا بیٹا کم عمر ہے، ناتجربہ کار ہے، اب جب کہ سب کچھ ہو چکا ہے تو اُس نے کوئی پیسہ نہیں دیا۔ وعدوں پر ٹال رہا ہے۔ دکان
بھی نئی ہے۔ اتنی آمدنی نہیں کہ بل بھی دیئے جائیں اور قسطیں بھی۔ تین مہینے ہو گئے ہیں۔ پارٹنر نے بل نہیں دیئے اور بتایا بھی
ہیں۔ آج گیس اور بجلی کٹ گئی ہے۔ کام رک گیا ہے۔ اب تم بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے!"

میں کیا کروں، میں نے سوچا۔ یہ تو بہت مشکل اور اُلجھا ہوا معاملہ تھا۔

"میرے بیٹے کی خون پسینے کی کمائی تھی اُس نے برسوں کی بچت لگا دی تھی۔ اب تو وہ کہیں اور کام بھی نہیں کرتا۔"

"منجھلا بیٹا کیا کرتا ہے؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"وہ کالج میں پڑھتا ہے تمہارے بیٹے کے ساتھ۔ وہ بھی شام کو بھائی کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔"

"اور چھوٹا کون سی کلاس میں پڑھتا ہے؟" میں نے پوچھا۔ میں چاہتی تھی کہ اس کا تھوڑا دھیان بدل جائے اور مجھے بھی کچھ
دچنے کا موقع مل جائے۔

"چھوٹا؟" اور اس کی آنکھیں ایکبار پھر جل تھل ہو گئیں۔ "چھوٹا بیمار ہے۔ ہسپتال میں ہے۔" اس نے پرس کھول کر اس
تصویر نکالی۔ "وہ سب سے خوبصورت تھا" ——

"تھا!" میں چونکی۔

"اب وہ بالکل بدل گیا ہے۔ اس تصویر جیسا بالکل نہیں۔"

میں نے ایک لمبی سانس لی۔ "بیمار ہے نا اسلئے —— ٹھیک ہو جائے گا تو پھر پہلے جیسا ہو جائے گا۔ ابھی اس کی
رہی کیا ہے!"

"پتہ نہیں ٹھیک ہو گا کہ نہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"کیوں کیا ہے اُسے؟" میں نے فکرمندی سے کہا۔

"اُسے؟" وہ تھوڑا سا جھجکی کہ مجھے بتائے یا نہ بتائے اور پھر غالباً فیصلہ کر لیا۔ "وہ بہت حساس تھا۔ بہت
یادہ۔ چھوٹا تھا نا تو اس لئے لاڈلا بھی تھا۔ وہ ایک بہت اچھے پرائیویٹ سکول میں پڑھتا تھا۔ جب ہمارے مالی حالات
اب ہوئے تو ہم نے اُسے وہاں سے اٹھا لیا۔ اُسے بہت دکھ ہوا۔ حالانکہ یہاں پبلک سکول بھی بہت اچھے ہیں لیکن وہ
نے سکول میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر سکا۔ وہ بہت کم گو اور کم آمیز تھا۔ پتہ نہیں اسے دوستوں سے چھٹنے کا غم تھا۔ ماحول
لنے کا یا باپ کی کمی کا۔ وہ کچھ بتاتا ہی نہیں تھا۔ اپنے اندر ہی اندر سوچ سوچ کر۔ معلوم نہیں اس کے دل اور ذہن پر کیا
باتیں گزریں کہ وہ ڈرگز پر چلا گیا۔ اب وہ ہسپتال میں ہے۔ اس کی ذہنی حالت اچھی نہیں۔ اس کی صورت تک بدل گئی
ہے۔ پتہ نہیں وہ ٹھیک بھی ہو گا کہ نہیں۔" اُس نے فوٹو دوبارہ پرس میں رکھ لیا۔

اس کی کتاب زندگی کا تو ایک ایک ورق دکھوں سے پٹا پڑا تھا۔ اگر یہ عورت پڑھی لکھی ہوتی اور اپنے کنبے کو سنبھالنے کی
بیت رکھتی تو حالات شاید کچھ مختلف ہوتے۔ فطامال اسکی سادہ دلی ... ہوگا ہوتا۔ اس کے معصوم بچے کی محنت یہ ہی نظر کی ہوگی۔

مجھے کچھ توجہ ہی نہیں رہا تھا۔ میں چلتے جانے چلی گئی۔

اب وہ باقاعدہ خوشامد کر رہی تھی "اب تم کچھ کر دینا"

"کچھ کر دینا" سے اس کی کیا مراد ہے۔ میں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس بھولی بھالی خاتون نے خود ہی وضاحت کر دی۔ "تم مسلم ہو نا۔ تو تم سب کچھ کر سکتے ہو مجھے کوئی تعویذ لکھ دو۔ بیٹے کے لیے۔ دکان کے لیے"

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ مسلم تعویذ لکھ دیتے ہیں" میں نے پوچھا۔

اس نے اپنا پرس کھول کر میری طرف بڑھایا اس کے اندر ایک چھوٹا سا بٹوہ تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں اس کو نکال لوں اور اسے کھول کر دیکھوں۔ "اس میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ وہ خود اس لئے نہیں چھو رہی تھی کہ اس کے ہاتھ ناپاک تھے۔ میں نے کھول کر دیکھا۔ کاغذ کی ایک لمبی سی کترن پر کچھ آیتیں لکھی ہوئی تھیں۔

"یہ تم نے کہاں سے لیا؟"

"میری ایک مسلم دوست تھی۔ اس نے دیا تھا۔ میرا کام ہو گیا تھا۔ تب سے یہ میرے پاس ہے۔ وہ تو پچھلے سال دوسری سٹیٹ میں چلے گئے ہیں۔ اب تم لکھ دو نا"

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے صحیح معنی آج میری سمجھ میں آئے۔ بیچاری اپنے دکھوں کے جلتے ریگزاروں میں کیسے چھوٹے چھوٹے سائے، چھوٹے چھوٹے سہارے ڈھونڈتی پھرتی ہے۔

"تمہیں پارٹنر نے کتنے پیسے دینے تھے"

"وعدہ تو بیس ہزار کا تھا مگر سب ایکدم تو نہیں چاہئیں تھے۔ اس وقت پانچ ہزار بھی دے دیتا تو سب ٹھیک ہو جاتا۔ دکان چلنی تو شروع ہو گئی ہے۔ نام بننے میں تھوڑا وقت لگتا ہے۔ چند مہینوں کی بات ہے۔ پھر تو آمدنی ہونے لگے گی کہ دکان کے بل اور سامان کی قسطیں آسانی سے ادا کی جا سکیں۔ دراصل ہمارے گھر کا خرچ بھی تو اسی میں سے جا رہا ہے اور ہمارا مکان بھی کرائے کا ہے۔ ہمیں پتہ ہوتا پارٹنر دھوکا دے گا تو ہم ابھی کام ہی شروع نہ کرتے۔ اچھا خاصا دوسری جگہ پر کام کر رہا تھا میرا بیٹا وہ بہت محنتی ہے۔ جہاں پہلے وہ کام کر رہا تھا وہ اس سے اتنا خوش تھا کہ چھوڑتا ہی نہیں تھا۔ میرے بچے کی اتنے برس کی خون پسینے کی کمائی خاک میں مل گئی" وہ پھر رونے لگی۔

میں پہلے ہی ہاتھ دیکھ کر کافی جھوٹ بول چکی تھی۔ نفسیاتی سہارے کے لیے ہی سہی مگر مجھ میں مزید جھوٹ بولنے کی تاب نہ تھی۔ میں آخر کہاں تک اس کھوکھلی بے ستون عمارت کو سہارا دیتی۔ میں نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا کہ مجھے اس طرح کے تعویذ لکھنے نہیں آتے۔ تم خدا سے دعا کرو۔ وہ سب کی سنتا ہے اور ایک دکھی معصوم خاتون کی دعا تو اسے ضرور سننی چاہیئے۔

میں نے پرس میں سے چار سو ڈالر نکالے اور کہا "دیکھو برا بھی نہ ماننا اور انکار بھی نہ کرنا۔ یہ رکھ لو۔ بجلی اور گیس کے بل کی قسطیں کرا کر دکان دوبارہ چالو کر لو"

"نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں اس لیے نہیں آئی تھی" وہ بہت شرمندہ ہو رہی تھی۔

"دیکھو۔ تم میری بہن ہو نا۔ یا تو کہہ دو۔ نہیں ہو یا پھر رکھ لو"

وہ مجبور ہو گئی۔ کہنے لگی "میرا بیٹا خفا ہو گا"

"نہیں ہو گا۔ وہ میرا بھی تو بچہ ہے" میں نے سمجھایا۔

"اچھا دعا کرو۔ میں جلد ہی تمہیں واپس کر دوں گی۔"
"اس کی کوئی ضرورت نہیں" اور میں نے اُسے بہت سی دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔
وہ اتنی ممنون ہو رہی تھی کہ مجھے دل میں ایک عجیب سے غرور آمیز سرور کا احساس ہوا۔ اور پھر یہ احساس بڑھتا گیا، پھیلتا گیا اور مجھے یوں لگنے لگا کہ کمرہ بہت تنگ ہو گیا ہے یا پھر میرا وجود ہی اتنی وسعت اختیار کر گیا ہے کہ اس کمرے میں سمانا مشکل ہو رہا ہے۔ ہاں یہ جگہ مجھے اپنے وجود کے لیے بہت تنگ —— بہت کم محسوس ہو رہی تھی۔ میں گھر سے باہر نکل آئی۔ مجھے ساری جھاڑیاں اپنے سامنے لوچیا کی طرح دونا لو نظر آئیں۔ درختوں پر پتے لوچیا کے جڑے ہوئے ہاتھوں کی طرح نظر آئے۔ میرے پیروں تلے پتے چرمرائے اور مجھے ایسا لگا میں زمانہ قدیم کی کوئی مغرور ملکہ ہوں۔ کنیزیں میری راہ میں زمین بوس ہیں اور میں خشک پتوں کو نہیں ان کے بالوں، ان کے لباسوں کو قدموں تلے روندتی ہوئی گزر رہی ہوں۔ میں نے خوشبو سے لدی ہوئی خشک ہوا کو ایک گہری سانس کے ساتھ اپنے اندر اُتارا۔ ہوا میں خوشگوار خنکی اور خوشبو کے ساتھ ایک مٹھاس رچی ہوئی تھی۔ طمانیت کے گہرے احساس کے ساتھ میں نے آسمان پر نگاہ دوڑائی۔ سفید سفید روئی جیسے چھوٹے چھوٹے بادل ڈوبتے سورج کی روشنی میں گلابی گلابی سے لگ رہے تھے۔ مجھے اس روز کا لوچیا کا چہرہ یاد آگیا اور پھر یہ گلابی شفق میرے چہرے پر بھی اتر آئی۔ کچھ پرندے اتنے اونچے اُڑ رہے تھے کہ لگتا تھا بادلوں میں سے گزر جائیں گے یا پھر بادل ہی نیچے اُتر آئے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اگر میں ذرا سا ایڑیاں اُٹھاؤں تو بادل کو چھو لوں گی۔ تب میرا دل چاہا کہ میں اس بادل کو پکڑ لوں اور اس پر سوار ہو کر سارے شہر پر اُڑتی پھروں کہ دیکھو لوگو۔ تم کتنے بے خبر ہو لوگوں کے دکھوں سے غموں سے۔ تم انسانیت سے کتنے بے بہرہ ہو۔ اِدھر دیکھو۔ یہ میں ہوں۔
کافی دیر گھومنے کے بعد میری کیفیت نارمل ہو گئی۔ اور میں اپنے آپ میں آگئی۔ بچوں کے لئے کھانا لگا رہی تھی کہ میرا بڑا بیٹا بھی آگیا۔ "امی آپ نے انٹونیو کی امی کو چار سو ڈالر دیئے ہیں؟"
"ہاں" میں نے بے پروائی سے کہا۔
"وہ بہت شکریہ ادا کر رہی تھی۔"
"کوئی بات نہیں بیٹے۔" میں نے بڑی متانت سے کہا۔ "چلو کھانا کھاؤ۔"
ایک مہینے بعد میرے بچوں نے بفلو سے ساٹھ میل دور راچسٹر یونیورسٹی میں ٹرانسفر لے لی اور ہم وہیں منتقل ہو گئے۔
اور آج اچانک لوچیا کا فون آیا۔ اس نے پتہ نہیں کہاں سے میرا فون اور پتہ حاصل کیا تھا۔ انتہائی عقیدت و احترام سے شکریہ ادا کرنے کے بعد اُس نے بتایا کہ اُس نے چار سو ڈالر کا چیک میل کر دیا ہے۔ وہ میری بہت ممنون ہے اور مجھے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ اس نے اصرار کیا کہ ہم جب بھی بفلو آئیں تو اسے میزبانی کا شرف ضرور بخشیں۔ میں نے اس سے کاروبار کے متعلق پوچھا۔ اب وہ اس صدمے کو سہہ چکی تھی۔ اس نے مجھے بتایا "روپے کا انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ قانوناً سامان ضبط کر لیا گیا اور میرا بیٹا پھر سے وہیں کام کر رہا ہے جہاں پہلے کرتا تھا۔ شکر ہے اس نے دوبارہ رکھ لیا۔"
ماریو کی معصوم صورت میرے ذہن میں آئی ہے۔ اس کے خون پسینے کی کمائی اپنی آنکھوں کے سامنے لٹتے دیکھ کر میں عرقِ ندامت میں غرق ہوئی جا رہی ہوں۔ میں لوچیا کی نیلی آنکھوں کی ندیوں میں ڈوبتی جا رہی ہوں۔
بڑی آزردگی سے میں نے ریسور واپس کریڈل پر رکھا ہے تو میری انگوٹھی کا نگینہ جھلملا اُٹھا ہے۔ ست رنگی شعاعیں اس سے پھوٹ نکلی ہیں اور صرف اسی انگوٹھی کی قیمت پانچ ہزار ڈالر سے زیادہ ہے!

سفر کا فرق

حمید قیصر

میں اور ڈاکٹر اورنگ زیب کباب ہاؤس پہنچے تو وہ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو ہال کی روشنیوں اور دھیمے سُروں
موسیقی نے ہمارا استقبال کیا۔ کباب ہاؤس شہر کی بڑی مارکیٹ میں اچھا اور صاف ستھرا ریسٹورنٹ تھا۔ اس کے کھانوں کے اعلیٰ معیار اور
لقوں کا شہر بھر میں چرچا تھا۔ شام ہوتے ہی اطراف میں میلہ سا لگ جاتا۔ ریسٹورنٹ کے اندر تو کیا باہر بھی سڑک کے کنارے دن ڈھلے
ڑ کاؤ کے بعد تھوڑے تھوڑے فاصلے پر میز کرسیاں لگ جاتیں۔ سات آٹھ بجے کے بعد بازار کی اس سمت ٹریفک نہ ہونے کے برابر رہ جاتا۔
بتہ اگر کوئی گاڑی ادھر آتی تو کباب ہاؤس کے باہر روشنیوں کے سیلاب میں تیار ہوتے چپل کباب، سیخ کباب، چکن تکے اور چکن روسٹ
خوشبو اور نظارہ ایسا نہ تھا جو دیکھنے والوں کو آسانی سے گزر جانے دیتا۔ چنانچہ سرِ شام شروع ہونے والا خورد و نوش کا یہ میلہ رات کو
ے دن کی سرحد پر چھوڑ کر تمام ہوتا، رات دیر تک کھلا رہنے کی وجہ سے یہ میرا پسندیدہ ریسٹورنٹ تھا۔ اس لیے میں اپنے دوستوں
ے ساتھ اکثر یہاں آتا۔

ہال میں پہنچ کر ہم بازار کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے ساتھ لگی اپنی پسندیدہ میز کی طرف بڑھے، جو اتفاق سے ابھی کچھ ہی دیر پہلے
خالی ہوئی تھی۔ مجھے بہت اطمینان ہوا۔ اس میز کی خصوصیت یہ تھی کہ وہاں سے بیٹھے بیٹھے پورا ریسٹورنٹ نظر میں رہتا اور جب اندر کے
ماحول سے جی گھبرانے لگتا تو کھڑکی سے باہر جھانک کر بازار کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ ہماری میز کی دائیں جانب پورا ہال اور سامنے مین گیٹ
ے ساتھ کاؤنٹر تھا۔ بائیں ہاتھ بازار کی سمت کھلنے والی کھڑکی تھی جہاں زندگی متحرک نظر آتی۔

زیب میرا کزن ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا دوست بھی تھا تاہم دو سال چھوٹا ہونے کی وجہ سے مجھے بھائی جان کہہ کر پکارتا۔ اب
ے وہ کافی عرصہ بعد میرے ہاں آیا تھا۔ ابھی دس روز پہلے میڈیکل فائنل ایئر کا امتحان دے کر وہ بور ہو گیا تو چلا آیا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ
ہاؤس جاب یہیں مکمل کرے بلکہ وہ یہیں مستقل قیام کرنا چاہتا تھا۔

"یار ڈاکٹر! اپنا گھر چھوڑ کر تمہارا یہاں کا ہاؤس جاب میری سمجھ سے بالاتر ہے" میں نے ہال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے
پوچھا۔

"آپ یہ راز نہیں پا سکتے بھائی جان" اس کی آنکھوں میں خاصی چمک تھی۔

"پھر بھی پتہ تو چلے آخر ایسی کون سی خوبی ہے اس شہر میں؟" میں نے اُسے کریدا۔

"آپ بھی بہت بھولے ہیں —— نیلم کو بھول گئے، جو پنگی میرے بارے میں فون کر کر کے آپ کے کان کھاتی ہے" مسرت تھی
ر ڈاکٹر کے چہرے سے پھوٹی پڑتی تھی اور وہ باوجود کوشش کے اسے چھپا نہیں پا رہا تھا۔

"ہوں —— تو یہ بات ہے بچو —— میں ابھی اسے فون کیے دیتا ہوں کہ تم چھپکے چھپکے اس کے شہر میں داخل ہونے کے بعد یہاں

پڑاؤ ڈالے بیٹھے ہو۔" میں نے مصنوعی انداز میں کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں —— ابھی نہیں۔ میں دراصل اسے سرپرائز دینا چاہتا ہوں" وہ شریر بچوں کی طرح میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

اتنے میں ویٹر مینیو کارڈ رکھ کر چلا گیا۔

"ہاں تو زیب کیا چلے گا؟" میں کارڈ زیب کی طرف سرکا کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ بازار کی رونق ابھی باقی تھی۔ سامنے سڑک کے پار بیکری والا سٹول پر بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا —— میڈیکل سٹور کا سیلز مین جلدی جلدی دوائیں لفافوں میں ڈال کر رقم وصول کر رہا تھا —— سٹیشنری کی دکان میں خواتین اور بچوں کا رش کچھ زیادہ تھا —— صوفی حلوائی دودھ کے کڑاہو میں چمچہ چلانا روک کر بار بار ناک صاف کر رہا تھا —— فٹ پاتھ پر دونوں ٹانگوں سے معذور بھکاری کی دیہاڑی شاید پوری نہیں ہوئی تھی، جبھی تو وہ پُرامید نگاہوں سے ہر آنے جانے والے کو تکے جا رہا تھا۔

"ایک روپے کا سوال ہے بابا ....." اچانک سامنے فٹ پاتھ پر دو لڑکوں نے میری نگاہیں جکڑ لیں۔ چھوٹے کی عمر آٹھ سال اور بڑا اس سے ایک ہی سال بڑا لگتا تھا۔ شکل و صورت سے دونوں بھائی معلوم ہوتے تھے۔ بڑے لڑکے نے سر پر کپڑے کا پیوند زدہ بڑا سا تھیلا اُٹھا رکھا تھا جس کے سوراخوں میں سے سکول کی ردی کاپیاں اور کتابیں جھانک رہی تھیں۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سٹیشنری کی دکان کے سامنے سے گزرے۔ چھوٹے نے لپک کر شوکیس کے ساتھ انگلی لگا دی اور دوزانوں ہو کر بڑی حسرت بھری نگاہ سے رنگ برنگی خوبصورت سٹیشنری کی چیزوں سے بھرے شوکیس کو دیکھنے لگا۔ وہ بڑے بھائی کو مخاطب کرنا چاہتا تھا جو اس سے چند قدم آگے نکل گیا تھا۔ کچی عمر میں بھی اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی عود کر آئی تھی لیکن چھوٹے کے چہرے پر متحرک برقی نیون سائن کی طرح شادمانی کی تحریریں بآسانی پڑھی جا سکتی تھیں۔ وہ شاید کسی خوبصورت قلم یا جیومیٹری بکس کی خواہش ظاہر کر رہا تھا لیکن بڑے بھائی کو جو سر پر رکھے بوجھ سے پہلے ہی ہلکان دکھائی دیتا تھا، چھوٹے کی یہ معصوم خواہش شاید ناگوار گزری تھی۔ جبھی تو وہ تیزی سے مڑا اور چھوٹے کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

"بھائی جان! رات کے اندھیرے میں کیا کسی کہانی کی تلاش ہے؟" زیب نے میگزین کی ورق گردانی چھوڑ کر مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

"کچھ نہیں یار! آتے جاتے لوگوں کو دیکھنا اور ان کے چہروں کی تحریریں پڑھنا اب ایک عادت سی بن گئی ہے —— اور ایک تم ڈاکٹر لوگ ہو کہ مریض کو اپنا مرض خود ہی بتانا پڑتا ہے —— تم لوگوں میں تو حکمت نام کی کوئی چیز باقی ہی نہیں رہی ....." میں نے ڈاکٹر پر گویا طنز کیا۔ وہ چونکہ ابھی پورا ڈاکٹر نہیں بن سکا تھا اس لیے کھسیانا ہو کر مسکرا دیا۔

"ابھی تک کھانا نہیں آیا ....." زیب نے غیر ارادی طور پر گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ میں جواباً کچھ کہنے ہی والا تھا کہ "ڈبل ایکشن ڈور" ویٹر کا دباؤ پڑنے سے چرچرایا اور وہ اس میں سے برآمد ہوا۔ کھانے کی ٹرے سامنے آئی تو سیخ کباب، چکن تکوں اور روغنی نانوں کی خوشبو نے میری بھوک کو بہت تیز کر دیا۔ ہم نے کھانا شروع کر دیا۔ ایسے میں ریسٹورنٹ کا "ڈبل ایکشن ڈور" پھر چرچرایا مگر اب کے اس کی چرچراہٹ میں پہلے جیسی تیزی اور روانی نہ تھی، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بھوکا اور کمزور ہاتھ اسے دھکیل رہا ہو۔ میری متجسس نگاہیں وہیں اٹکی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے دو لڑکے دروازے کے پریشر کو بمشکل تمام دھکیل کر اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے پہلی ہی نظر میں انہیں پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکے تھے جنہیں میں نے تھوڑی دیر پہلے کھڑکی سے باہر فٹ پاتھ پر دیکھا تھا جب انہوں نے کپڑے کا بڑا سا بوسیدہ تھیلا اٹھا رکھا تھا، اب وہی خالی تھیلا بڑے لڑکے نے چرائی ہوئی مرغی کی طرح بغل میں داب رکھا تھا۔

دونوں نے لمحہ بھر کے لیے ریسٹورنٹ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جہاں ہر میز پر انواع و اقسام کے کھانے سجے تھے۔ ان کی پھٹی پھٹی ویران آنکھوں میں بھوک مست ہو کر کبڈی ڈالنے لگی —— میرا نوالہ حلق میں ہی رہ گیا۔ البتہ ڈاکٹر حسبِ عادت اپنی دائیں ٹانگ ہلاتے ہوئے بڑے مزے سے کھانا کھا رہا تھا۔ دونوں بھائیوں نے ٹاٹ سکول کی مخصوص یونیفارم پہن رکھی تھی، پرانی ہو جانے کی وجہ سے اس کے رنگ کو بھی کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ بغیر بٹنوں کے کھلے کف اُن کی غربت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں دونوں جھجکتے ہوئے کاؤنٹر تک پہنچ کر منیجر سے کچھ کہہ رہے تھے۔ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ میں نے سوچا ممکن ہے وہ اپنے یا کسی پڑوسی کے لیے روٹیاں لینے آئے ہوں ....

"بھائی جان! کھائیے نا۔ آپ تو ہاتھ چھوڑ کر بیٹھ گئے ہیں؟" زیب شوخی سے بولا۔

"نہیں یار! ایسی تو کوئی بات نہیں، میں دراصل کھانا آہستہ کھانے کا عادی ہوں" میں نے کھانا جاری رکھا۔ میں نے دیکھا کہ دونوں لڑکے کاؤنٹر کے برابر تنی لکڑی کی خوبصورت چلمن کے عقب میں ایک ویٹر کے ساتھ غائب ہو گئے۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ تو روٹیاں لینے آئے تھے، پھر اُدھر کیا کرنے گئے ہیں؟ ممکن ہے انہیں زیادہ روٹیاں درکار ہوں اور وہ وہاں سے ملتی ہوں .... میں یونہی سوچوں میں غلطاں کھانا کھاتا رہا۔ ڈاکٹر کی دائیں ٹانگ موسیقی کے نرم سُروں کے ساتھ ساتھ بدستور لرزاں تھی۔ کبھی کبھی اس کا پاؤں میرے پاؤں سے ٹکرا جاتا تو میری توجہ بٹ جاتی۔

"ہاں تو ڈاکٹر! کل تم ڈاکٹر سعید کے ہاں جا رہے ہو نا، ہاؤس جاب کے سلسلے میں!" میں نے زیب سے یونہی سلسلۂ کلام جوڑنے کے لیے پوچھا۔

"جی! ڈاکٹر سعید صاحب نے صبح دس بجے پولی کلینک پہنچنے کو کہا تھا" زیب بولا۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ صرف میڈیکل سٹور کھلا تھا اور حلوائی کی دکان کا چکناہٹ اور دھوئیں سے اٹا مدھم سا بلب ابھی تک جل رہا تھا۔ صوفی حلوائی نے اب پورے کپڑے پہن لیے تھے۔ فٹ پاتھ پر پڑے بھکاری کو کوئی بڑی بڑی مونچھوں والا شخص ہتھ گاڑی میں ڈال کر لے جا رہا تھا۔ اندر ہال میں اب "لو سٹوری فار ٹو" کی تیز جھنکار بج رہی تھی۔

"یار ذرا گرما گرم نان لانا۔ یہ تو پڑے پڑے ٹھنڈے ہو چکے ہیں۔" زیب نے قریب سے گزرتے ہوئے ویٹر کو مخاطب کر کے کہا۔ تھوڑی دیر بعد گرم نان کی خوشبو نے مجھے پھر سے کھانے کی طرف راغب کیا۔ میں بظاہر کھانا کھا رہا تھا لیکن میرا ذہن متواتر بھٹک رہا تھا۔ کھانا ختم کر کے ہم الائچیوں والا پشاوری قہوہ سِپ کرنے لگے مگر دونوں لڑکے ابھی تک چلمن کے پیچھے سے برآمد نہیں ہو سکے تھے۔ میں کچھ نہ سمجھ پا رہا تھا کہ وہ عقب میں کیا کرنے گئے ہیں —— ممکن ہے وہ دوسری جانب جھوٹے برتن مانجھنے گئے ہوں —— لیکن وہ تو روٹیاں لینے آئے تھے —— شاید برتن مانجھنے کے عوض انہیں روٹیاں ملیں، مگر ان کی ظاہری حالت تو ایسی نہ تھی، وہ ٹاٹ سکول کے ہی سہی مگر وہ تھے تو طالب علم ہی! میں نے تمام ممکنات پر غور و خوض مکمل کر ڈالا لیکن کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ میرا اضطراب برقرار رہا۔

میں نے زیب کی طرف دیکھا قہوے کے آخری گھونٹ کے بعد اس کے چہرے پر شکم سیری کی کیفیت نمایاں ہو گئی۔ ویٹر قریب سے گزرا تو میں نے اسے بل لانے کو کہا۔ چلمن کے عقب میں دروازہ کھلا اور تیز روشنی کا ایک بھپکا آیا۔ دونوں لڑکے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باہر کاؤنٹر پر آ گئے، مشقت کے بعد ملنے والی مزدوری کی مسرت ان کے چہرے پر نمایاں تھی۔ ان کے پیچھے وہی ویٹر کمرے کی لائٹ بند کر کے کاؤنٹر پر آ گیا۔ بڑے بھائی نے دونوں ہاتھوں سے شاید روٹیوں سے بھرا تھیلا سنبھال رکھا تھا۔ ہمارا بل ابھی کاؤنٹر پر تیار ہو رہا تھا۔ میرے تجسس کو کوئی ٹھکانا نہیں مل رہا تھا۔ میں میز پر بیٹھ کر انتظار کرنے کی بجائے اٹھ کر کاؤنٹر پر آ گیا۔ ڈاکٹر زیب واش روم کی طرف چلا

گیا۔ ریسٹورنٹ کا ہال بدستور بھرا ہوا تھا۔ لوگ کھانے اور موسیقی دونوں سے جسم و روح کو سیراب کرنے میں مصروف تھے۔ چھوٹا لڑکا منہ میں انگوٹھا دیئے حسرت سے ہال کی جانب مڑ کر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بڑے لڑکے نے تھیلے سے ٹھوکا دے کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا جیسے کہہ رہا ہو "مجھے پتہ ہے منے بھائی، بس تھوڑا سا صبر اور —— گھر تو پہنچ لیں" اب روٹیوں والا تھیلا چھوٹے بھائی نے تھام لیا تھا۔ بڑے نے قمیض کی جیب سے دس کا ایک مڑا تڑا سا نوٹ نکال کر ویٹر کی طرف یوں بڑھایا جیسے چوری کا ہو۔ کاونٹر مینجر ابھی تک ہمارا بل بنانے میں مصروف تھا۔

"ابے او! یہ دس کا نہیں چلے گا، پانچ اور نکال —— پورے تین کلو ٹکڑے ہیں، اور ہیں بھی روغنی کے" بیرا تحقیر آمیز لہجے میں گرجا۔

"لیکن انکل! پہلے تو دس روپے میں آتے تھے....." بڑا بھائی مجھ سے نگاہیں چراتے ہوئے آہستگی سے بولا۔ میں ان کی انا کا خیال کرکے بظاہر لاتعلق سا ہو کر مینجر کی طرف دیکھنے لگا۔

"پہلے آتے تھے پر اب نہیں! اب تم لوگوں نے رُوکھے سُوکھے چھوڑ کے روغنی جو چبانے شروع کر دیئے ہیں —— لا نکال پانچ روپے اور، نہیں تو جا کر اندر واپس پھینک آ، ہمارے جانور کھا لیں گے....." بیرے کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

چھوٹا دانتوں سے ہونٹ کاٹنے لگا تھا، بڑے کے چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ میرا بل ایک سو پچاس —— بنا تھا اور ان کا پندرہ روپے۔ میرے اور ان کے درمیان محض ایک صفر کا ہی تو فرق تھا مگر صفر کا یہ فرق ایسی خلیج کی مانند تھا جسے پاٹنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ میں اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگا۔ میں تھیلے سے جھانکتے خشک ٹکڑوں اور ان معصوم بچوں کی ویران نگاہوں کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا۔ میں اپنا اور بچوں کا بل ادا کرکے ریسٹورنٹ میں سے تیز قدموں سے نکل آیا۔

تماشبین

محمد حمید شاہد

عورت اور خوشبو ہمیشہ سے میری کمزوری رہے ہیں۔ شاید مجھے یہ کہنا چاہیئے تھا کہ عورت اور اس کی خوشبو میری کمزوری رہے ہیں۔

اب اگر میں عورت کو بغور دیکھنے یا نظر سے نظر ملا کر بات کرنے سے کتراتا ہوں تو میں شروع سے ایسا نہیں ہوں۔

اس روز جب وہ میرے آفس میں داخل ہوئی تو عورت کو چہرے کی بجائے نیچے سے اوپر قسطوں میں دیکھنے کی خواہش میرے اندر شدت سے مچل رہی تھی۔ ہوا یوں کہ میں نے جیفرے آرچر کی کہانیوں کی کتاب "اے ٹوسٹ ان دی ٹیل" رات ہی ختم کی تھی اور اس کی وہ کہانی جو ایمینڈا کرزن نامی دلکش دوشیزہ کے گرد گھومتی تھی، میرے حواس پر بری طرح چھائی ہوئی تھی۔

میں رات بھر وقفے وقفے سے خواب دیکھتا رہا تھا۔۔۔ نامکمل خواب ـــــ! نامکمل کی بجائے مجھے تشنہ کہنا چاہیئے۔ پہلے سارے میں دھند ہی دھند ہوتی۔ پھر اونچی ایڑی والے سیاہ جوتوں اور سٹاکنگ سے جھانکتی گوری گوری سڈول ٹانگیں نظر آتیں۔ پھر مجھے یوں لگتا کوئی شطرنج کی چال چل رہا ہو اور اس کے ساتھ ہی خواب ری وائنڈ ہو کر ری پلے ہونے لگتا۔ ایک ہی منظر بار بار دیکھ کر میں خواب میں جھنجلاہٹ کا شکار ہوتا اور لڑکی کا پورا ہیولا دیکھنا چاہتا مگر ہر بار میرا تصور ٹوٹ ٹوٹ جاتا۔

جب وہ میرے آفس میں داخل ہوئی تب تک میں اس کہانی کے چنگل سے نہ نکلا تھا۔ اس کی آواز سن کر چونکا تو اس کا چہرہ دیکھنے کی بجائے نگاہ اس کے قدموں کی طرف لپکی۔ میں نے یہ بتایا ہی نہیں کہ میں عموماً لڑکیوں کو کس ترتیب سے دیکھنے کا عادی رہا ہوں۔ ٹھہریئے! مجھے سوچ لینے دیجئے۔ شاید میں پہلے ہونٹ دیکھتا ہوں گا۔ رس بھری قاشوں کی طرح سرخ، تر و تازہ چھوٹے بڑے "وا" سے کھلتے، آپس میں جڑتے ہونٹ، یا پھر آنکھیں دیکھتا ہوں گا، گہری جھیل جیسی آنکھیں، بڑی بڑی آنکھیں کہ جن میں کائنات سما جائے ـــ کالی، نیلی یا پھر بھوری آنکھیں ـــ نہیں میرا خیال ہے میں چہرہ لخت لخت نہیں بلکہ مکمل دیکھتا ہوں دیکھتا رہا ہوں اور اگر کوئی چہرہ مجھے متاثر کرتا ہو گا تو اسے مفصل دیکھتا ہوں گا۔

لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ میں نے کسی کو قدموں سے دیکھنا شروع کیا ہو مگر جیفرے آرچر کی کہانی کے زیر اثر میری نظر اس کے قدموں پر پڑی۔ ایمینڈا کرزن جب اس کلب کی عمارت میں داخل ہوئی تھی جہاں شطرنج کا ٹورنامنٹ ہو رہا تھا تو اس نے اونچی ایڑی والے سیاہ ویلوٹ کے جوتے پہن رکھے تھے۔ میں گذشتہ رات انہی سیاہ جوتوں کے اوپر گوری سڈول پنڈلیاں دیکھتا رہا تھا۔ مگر میں نے جب اس کے قدموں کو دیکھا تو مجھے پہلا دھچکا لگا۔

اس کے پاؤں میں جو سینڈل تھے وہ کبھی سیاہ رہے ہوں گے لیکن کثرتِ استعمال اور پالش نہ ہونے کے سبب اب ان کا کوئی رنگ نہ تھا۔ دوسرا دھچکا مجھے اس وقت لگا جب میں نے بے رنگ سینڈلوں میں سے جھانکتے سانولے

پاؤں اور ٹخنے دیکھے۔ میں بے دلی سے اوپر دیکھتا چلا گیا۔ راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی جو میری نظر کو گرفت میں لیتی۔ ہاں یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ جب میں نے جھولتے پائنچوں کے نیچے اس کے سانولے ٹخنوں کو دیکھا تھا اور گوری شفاف جلد کا تصور ٹوٹ گیا تھا تو میرا باطن مشتعل ہو گیا تھا۔ دل کرتا تھا اُٹھوں اور اُس کے پائنچے نیچے کھینچ کر اس کے سانولے ٹخنے، پاؤں اور بے رنگ جوتے ان میں چھپا دوں۔

میں جانتا ہوں یہ ایک بے ہودہ خیال تھا مگر میں اس شاعرانہ خیال کا شدت سے حامی رہا ہوں کہ:

"وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"

ایسے رنگ جو میں گذشتہ رات خواب میں ادھورے ادھورے دیکھتا رہا تھا: اب دھنک کی طرح ادھر ادھر بکھرے دیکھنا چاہتا تھا۔

غالباً میں یہ بتا چکا ہوں کہ ٹخنوں سے اس کے چہرے تک بیچ میں رکنے کا کوئی مقام نہ آتا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور میرے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔ "جی میں بشریٰ ہوں ——— شاہنواز کی بیوہ"۔

شاہنواز کو میں جانتا تھا میں کیا دفتر کا ہر فرد جانتا تھا۔ اس تعارف کے بعد میں نے بشریٰ کو غور سے دیکھا۔ وہ کیا بات تھی کہ کمہاروں کی اس لڑکی کے لیے شاہنواز کو اپنے خاندان کی لڑکی سے منگنی توڑ کر عزیزوں کی ناراضی مول لینا پڑی۔ میں نے آنکھوں میں جھانکا۔ بظاہر آنکھیں کالی تھیں مگر بغور دیکھنے پر بھورا رنگ غالب آنے لگتا تھا۔ پلکیں اُٹھا کر جب وہ اوپر دیکھتی تھی تو کوئی بھی دل والا ان میں ڈوب سکتا تھا۔ چہرہ نہ گول نہ ہی لمبوترا، بھرا بھرا، سانولا مگر شفاف۔ دہانہ چھوٹا تھا۔ ہونٹوں پر عمدہ نفاست سے بنی لکیریں یوں جیسے پیمانہ رکھ کر اور مناسب فاصلے دے کر کھینچی گئی ہوں۔ وہ بات ٹھہر ٹھہر کر کرتی تھی۔ ایسی کہ سیدھی دل میں جا اترتی۔ یہ تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ بشریٰ جیسی لڑکی کے لیے کچھ ناراضیاں مول لی جا سکتی تھیں۔ شاہنواز سے سب ناراض تھے، مگر وہ بشریٰ کے ساتھ خوش تھا۔ یہ بات اُس نے کوئی ڈیڑھ برس پہلے تب بتائی تھی جب اس کی شادی کو صرف دو ماہ گزرے تھے۔ تب وہ میرے پاس صدر دفتر میں کام کرتا تھا جب اسے کوئی کام ہوتا تھا تو وہ بار بار سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا۔ منہ سے کچھ نہ کہتا حتیٰ کہ میں خود پوچھنے پر مجبور ہو جاتا۔ ایک روز وہ حسبِ معمول تیسری بار میرے سامنے چپ چاپ کھڑا ہو گیا تو میں نے معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھا۔ اس نے جیب سے تہہ کی ہوئی درخواست نکالی، اسے سیدھا کیا اور میرے سامنے رکھ دی وہ کینٹ برانچ میں تبادلہ چاہتا تھا۔

میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا: "وہ جی یہاں سے روز گاؤں جانا مشکل ہو جاتا ہے"۔ اس نے یہ اس قدر شرماتے ہوئے کہا تو میں ہنسے بنا نہ رہ سکا۔

اس کا تبادلہ کینٹ برانچ ہو گیا۔ یہ تبدیلی اس کے حق میں بہتر ثابت نہ ہوئی۔ کینٹ برانچ میں دن دہاڑے ڈاکہ پڑا۔ گولی چلی اور وہ مزاحمت کرتے ہوئے گولی کا نشانہ بن گیا۔ برانچ لٹنے سے بچ گئی۔

مجھے شاہنواز کے مارے جانے کا بڑا دکھ تھا۔ میں نے مناسب امدادی رقم کا کیس بنا کر اعلیٰ حکام کو بھیجا۔ جو منظور ہو گیا۔ میں نے مرحوم کی بیوہ کی اطلاع کے لئے چٹھی لکھ دی۔ جب وہ آئی تو میں نے جیفرے آرچر کی کہانی کے زیرِ اثر اسے ایک نئے ڈھنگ سے دیکھا۔ پھر جب وہ سامنے بیٹھ گئی اور دھیرے دھیرے گفتگو کرنے لگی تو مجھے اس کے ہونٹوں کی جنبش بہت اچھی لگی تھی۔

اس قدر اچھی کہ میں نے اس روز اسے چیک نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ دل چاہتا تھا وہ ایک بار پھر آئے، بیٹھے، باتیں کرے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا میں نے اس سے کیا گفتگو کی تھی۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ جب اس کے شوہر کی ہمت اور جرأت کی تعریف کی

تھی تو اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ یوں کہ مجھے اس کے ہونٹوں پر توجہ مرکوز رکھنے میں وقت ہو رہی تھی۔ پھر جب اس کے اور شاہنواز کے عزیزوں کا تذکرہ چھڑا تو اس نے بتایا اسے منحوس گردانا جا رہا تھا اور یہ کہ وہ بالکل اکیلی ہو گئی تھی۔ سارے زمانے کے خراب ہونے کا بھی گلا تھا۔ وہ اکیلی شہر آنا نہیں چاہتی تھی مگر کسی کو ساتھ لاتی تو کیسے کہ جوان جہان تھی اور لوگ تو ایسے موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ لوگوں کی زبانیں بھلا کیسے بند کی جا سکتی تھیں لہٰذا وہ احتیاطاً کسی کو بھی ساتھ نہ لائی تھی۔

جب وہ زمانے کی خرابی کا ذکر کر رہی تھی تو میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میں خراب نہ تھا۔ میری خواہشات ہمیشہ سے بے ضرر رہی ہیں۔ میں فقط پھول کو دیکھتا اور اس کی خوشبو سے مشامِ جاں معطر کرتا ہوں۔ ہنستی مسکراتی تر و تازہ چہروں والی لڑکیاں کسے اچھی نہیں لگتیں، مجھے بھی اچھی لگتی ہیں۔ میں ذرا ہمت والا ہوں اور ان سے راہ و رسم بڑھا لیتا ہوں کہ ان سے باتیں کر سکوں۔ ان کی آنکھوں میں جھانک سکوں اور ان کے کھنکتے قہقہوں کے پھولوں سے سماعت کی کارنس کو سجاؤں۔

غالباً میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ بشریٰ اس روز جلدی میں تھی۔ اسے خدشہ تھا، گاؤں جانے والی آخری گاڑی نکل جائے گی ــــــ مجھے اس کی یہ بات اچھی نہ لگی تھی۔ جی چاہتا تھا وہ کچھ اور بیٹھے۔ مگر جب وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تو میں نے اس سے معذرت چاہی کہ چیک اپ آج نہ ہو سکے گا۔ میں نے اسے آئندہ بدھ کو آنے کا کہا تو وہ نہایت لجاجت سے کہنے لگی: "اس روز چیک ضرور ہو جانا چاہیے کہ بار بار شہر آنا ممکن نہیں۔"

میں نے اسے یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا۔ مگر جب اگلا بدھ آیا، میں دفتر میں کچھ فائلیں نکال رہا تھا اور بشریٰ ابھی تک نہیں آئی تھی کہ شکیلہ کا فون آ گیا۔ وہی شکیلہ جو بات کرتی ہے تو اس کے گال اوپر کو اچھلتے ہیں، ہنستی ہے تو آنکھیں میچ لیتی ہے اور بولتی ہے تو پہروں بولتے ہی چلی جاتی ہے۔ اس کا فون بہت دنوں بعد آیا تھا۔ وہ شہر سے باہر تھی۔ اب آئی تھی تو چاہتی تھی اسی وقت دفتر سے نکلوں، اسے پک کروں اور کہیں بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں سنوں۔ مجھے اس کی آفر اچھی لگی۔

میرے فرائض میں شامل ہے کہ میں وقتاً فوقتاً ذیلی دفاتر کو سپروائز کروں۔ ان کی کارکردگی چیک کروں لہٰذا میرا دفتر سے بغیر اطلاع غائب ہو جانا بھی اسی زمرے آتا ہے۔ پھر یوں ہوا کہ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا اور وہ بیت گیا۔ شکیلہ جیسی لڑکی کا ساتھ ہو تو وقت پلک جھپکتے میں گزر جاتا ہے۔ اس روز دوبارہ دفتر نہ جا سکا۔

اگلے روز جب میں دفتر پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ کل بشریٰ آئی تھی اور یہ کہ وہ دفتر بند ہونے تک انتظار کرتی رہی۔

"مگر اس کی آخری گاڑی تو ساڑھے تین بجے جاتی تھی؟"

"جی۔ وہ بھی یہی کہتی تھی، پھر بھی انتظار کرتی رہی۔"

"پھر کہاں گئی وہ؟"

"جی پتہ نہیں۔"

میں رات دیر سے سونے اور صبح دیر سے اُٹھنے کے باعث جلدی جلدی دفتر کے لیے تیاری کرتا ہوں۔ یوں نہ تو ناشتہ سکون سے کر سکتا ہوں اور نہ ہی اخبار پڑھ پاتا ہوں لہٰذا دفتر آتے ہی پہلے اخبار پڑھتا ہوں۔ اخبار میرے سامنے تھا جو روزمرہ کی طرح سیاستدانوں کے بیانات، حادثات، قتل و اغوا کی خبروں سے اٹا ہوا تھا۔ من چلے نوجوان، جو راہ چلتی لڑکیوں پر آوازے کستے ہیں، نئے نئے طریقوں سے ستاتے ہیں، جدید ماڈل کی کاروں میں لفٹ دیتے ہیں یا پھر سائلنسر اترے شور مچاتے موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر گاتے ہیں اور پرس لے اُڑتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں بھی اخبارات کے چوکھٹوں میں جگہ پانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ میں نے اخبار تہہ کر کے ایک

طرف رکھ دیا اور ہاتھ فائیلوں کی طرف بڑھایا تھا کہ بشریٰ آگئی۔

اب کے وہ آئی تو میرے اندر اسے نیچے سے اوپر قسط در قسط دیکھنے کی مطلق خواہش نہ تھی مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر دیکھ رہا تھا اور دل سینے کے اندر ہی کہیں گہرا اور گہرا ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس نے دروازے سے کرسی تک کا فاصلہ یوں طے کیا تھا جیسے اس پر صدیوں کی مسافت طے کرنے کی تھکن ہو۔ وہ کرسی پر گر گئی، نظر سیدھی اس کے ہونٹوں پر پڑی تو کلیجہ منہ کو آگیا۔ ہونٹ ـــــ یوں لگتا تھا کسی نے چبا ڈالے تھے۔ اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ سوجی اور ابھری ہوئی آنکھوں سے آنسو کب کے خشک ہو چکے تھے۔

میں بے قرار ہو گیا "خیریت تو ہے نا ــــ خاتون؟"

"خیریت ــــ" وہ سامنے خلا کو دیکھ رہی تھی۔

میرے اندر بے شمار وسوسے سر اٹھانے لگے مگر پوچھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ میں نے گھنٹی دے کر چپراسی کو بلایا، اسے چیک لانے کو کہا اور جب وہ چیک لے آیا تو اسے تھمانے کے لئے بڑھایا "یہ رہا آپ کا چیک"

وہ سسک پڑی، منہ ہی منہ میں بڑبڑائی "چیک ــــ معاوضہ ــــ کس بات کا ــــ میرے شوہر کے مارے جانے کا ــــ یا پھر ــــ"

وہ اور کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اپنے کٹے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا لیا۔

اور مجھے یوں لگا جیسے اس کے گاؤں جانے والی آخری گاڑی مجھے روندتی کچلتی گزر رہی تھی اور میرے سامنے آخری بازی جیتنے والی ایمیلڈا نہیں آخری بازی ہارنے والی ایک دوسری عورت بشریٰ تھی۔

شیطان کی موت

گلزار جاوید

کسی بھی شخص کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ اُس کے عمل سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کے اپنے اندر یہ خواہش سر اُبھارتی ہے کہ وہ خود کو کسوٹی پر جانچے اور پرکھے۔ زندگی کے رویّوں کے بارے میں اپنی اپروچ کو سچ جھوٹ، اچھائی برائی، نیکی بدی کی ترازو میں تولے مگر چند ہی ساعتوں میں اُس کے حوصلے پست اور ہمّت جواب دے جاتی ہے اور وہ اپنے ماضی میں کھو جاتا ہے۔ گزرے ہوئے لمحات کا لمس اُس کے انگ انگ میں آشکار ہونے لگتا ہے۔ کوشش کے باوجود فیصلہ کرنا بس میں نہیں رہتا۔

اِس وقت سکول کے زمانے کے مناظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ ماسٹر حفیظ کا نورانی چہرہ اور لیکچر کی "بینت" کے علاوہ اشفاق صاحب کے پیریڈ میں باجماعت مرغا بننے والے ایڈووکیٹ، ڈاکٹر، انجینئر، بیوروکریٹ، مدرس، صنعتکار کے طور پر کام کرنے والوں میں بچپن کے دوستوں کی شبیہیں نمایاں ہونا شروع ہو گئیں ہیں۔ یکایک ٹیلی ویژن سکرین پر اشتہاری فلم کی حسینہ نے نوعمری کے وہ قصے یاد دلاتے ہیں جب صبح کہیں شام کہیں اور رات کہیں والی کیفیت طاری تھی۔ دل تھا کہ قابو میں نہیں آتا تھا۔ کبھی چھت پر، کبھی گھر کے پچھواڑے، کبھی ویران گلی میں کبھی ریسٹورانٹ سنیما کلب میں یا کافی ہاؤس میں۔ کبھی چاندنی راتوں اور کبھی بھیگی برساتوں میں گھنٹوں محوِ گفتگو رہنا۔ آج ایک نقطہ کہنا محال تب سو طریقے حالِ دل عیاں کرنے کے۔ اب شعر و ادب سے بیزاری کی کیفیت، تب کسی کے لمس سے آشنا ہو کر قرطاس و قلم کا بے محابا استعمال۔!

خیالوں کا سلسلہ ایک بار پھر ٹوٹا کانوں میں مسحور کن آواز نے پھر سے ٹیلی ویژن سکرین کی جانب متوجہ کر دیا۔ کتنی نوخیز حسین و دلکش ماں ہے جو گاگا کر بچے کو اپنے دودھ کی جگہ خشک پاؤڈر پانی میں ملا کر پلا رہی ہے اور اُسے ماں کے دودھ کے قریب تر بتلا رہی ہے۔ اتنا بڑا دھوکا اس شیر خوار کے ساتھ کوئی غیر نہیں اُس کی اپنی ماں کر رہی ہے!

خدا معلوم کس دل سے میری ماں شیر خواری میں مجھے چھوڑ کر، میرے باپ سے طلاق لے کر گوروں کے دیس چلی گئی اور میرے باپ نے اسی خشک دودھ کے بل بوتے پر مجھے کڑیل جوان بنا ڈالا —— ہاں مگر یاد آیا، بقول دادی ماں کے، ماں کی موجودگی میں بھی میری خوراک یہی درآمدی خشک دودھ تھا۔ یورپ میں پروان چڑھی میری ماں کو اپنی خوبصورتی کا بڑا خیال تھا۔ اسی ڈر سے اُس نے اکلوتے بیٹے کو اپنی چھاتی سے بہنے والے دودھ کے ایک قطرہ کا بھی حق دار نہ جانا۔

میرا باپ چستی پھرتی کے علاوہ چہرے کی رنگت کا بڑا قائل تھا۔ نوجوان چہروں پر شگفتگی اور شادابی اُس کے نزدیک صحت مندی کا سائن بورڈ تھا۔ بقول اُس کے جس کمپنی کا سائن بورڈ بھدا اور بے جان ہو اُس کی پراڈکٹ سے بہتری کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔ اسی غرض سے وہ میرے سونے جاگنے کھانے پینے ورزش اور روزمرہ کیلریز کا باقاعدہ حساب رکھتا۔ میری صحت

ے متعلق اپنے باپ کی فکرمندی میری سمجھ سے بالا تھی۔ کیونکہ وہ میرے لیے مفید کم مضر زیادہ ثابت ہو رہی تھی۔ بہتر نشو و نما کے ساتھ سرکشی اور بے باکی بھی پروان چڑھ رہی تھی۔ ابھرتی جوانی، دلکش نین نقش، مناسب قد کاٹھ، گھنی اور سیاہ زلفیں، گرد و پیش کی حسیناؤں کی نیندیں اڑانے کے لیے کافی تھے۔ آنے والا ہر دن نئی کہانی کا موجب بننے لگا۔ رسوائیاں عام ہونے لگیں۔ رائی کا پہاڑ بنانے والوں کی مرادیں بر آئیں۔ گھر گھر چرچے ہونے لگے۔ بے چینی بے قراری اور اضطراب رنگ دکھلانے لگا۔ نئے تعلق بننے اور پرانے ٹوٹنے لگے۔ اطمینان کسی طور نصیب نہ تھا۔ گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آتا یا آ کر نکل جاتا۔ کسی کی باہنوں میں ڈوب جانے —— غرق ہو جانے کو جی مچل مچل جاتا۔ کوئی پیمانہ کوئی معیار عشق کی کوئی انتہا نہ تھی۔ نوعمر نوخیز حسیناؤں سے دل اچاٹ ہو رہا تھا۔ متناسب جسم اپنی جانب متوجہ کرنے لگے تھے۔ یہی شوق اشتیاق پارٹی میں جا بجا بکھرے نوخیز جلوؤں کو چھوڑ کر چالیس کے پیٹے میں پہنچی حسینہ صادقہ کے گرد کھینچ کر لے گیا۔

اُس کا سراپا، اُس کے مزاج کی سادگی، سلیقہ مندی اور حسن پسندی کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ پارٹی میں شامل ہوتے ہوئے بھی سب سے الگ منفرد اور باوقار نظر آ رہی تھی۔ کٹورا سی اداس آنکھیں کاجل کی آمیزش کے بعد اُس جھیل کا منظر پیش کر رہی تھیں جس میں تازہ تازہ کسی نے خودکشی کی ہو۔ وہ امیر کبیر بیوہ یا مطلقہ نہ تھی۔ علاقے کی با اثر سیاسی و سماجی حیثیت کی حامل باعزت اور باوقار خاتون تھی جو اپنے آبائی گھر میں کئی ملازموں کے ہمراہ تنہا رہا کرتی۔ شوہر مشرقِ وسطیٰ میں گارمنٹس کا وسیع کاروبار کرتا تھا جو سال چھ مہینے بعد ہفتہ دو ہفتہ کے لیے آتا اور ہر بار صادقہ کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کرتا۔ صادقہ ہر بار اُسے اپنی اہمیت اور مرتبہ کا احساس دلا کر تنہا واپس بھیج دیتی۔ شادی کے ابتدائی سالوں میں ماں بننے کے مرحلے کے دوران پیچیدگی کے باعث زچہ و بچہ میں سے کسی ایک کی جان بچائی جا سکتی تھی۔ صادقہ کے شوہر نے ڈاکٹروں سے محبوب بیوی کی زندگی مانگ لی جو کبھی باپ نہ بننے کی قیمت پر مل سکی۔

"تقریر بہت عمدہ کرتی ہیں آپ۔ ایک ایک لفظ موتی کی مانند لڑی میں پرو دیتی ہیں گویا۔"

"شکریہ۔" میری جھوٹی تعریف کے جواب میں اُس نے مختصر جواب دیا۔ "آپ کی تعریف ——؟" میرے سراپے کو جانچتے ہوئے اُس نے سوال کیا۔

"خاکسار کو شکیل کہتے ہیں۔"

"کیا شغل ہے آپ کا؟"

"مطالعہ۔" اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں نے کہا۔

قدرے جھجکتے ہوئے اس نے کہا —— "اچھا شغل ہے۔ مگر میں آپ کی مصروفیات کے بارے میں معلوم کر رہی تھی۔"

"ایم۔ اے کے بعد جاب کی تلاش ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا ارادہ بھی ہے۔"

"گویا آج کل فارغ ہیں۔"

"کہہ سکتے ہیں۔"

"رفاہِ عامہ سے دلچسپی ہو تو ہمارے دفتر تشریف لائیے۔ انسانی خدمت سے بہتر، وقت کا کوئی مصرف نہیں۔ خدا کرے گا جاب کی بھی کوئی صورت نکل آئے گی۔"

یہ ہمارے تعلق کی باقاعدہ ابتدا تھی۔ واپسی پر میں اپنے اندر خاصی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ پارٹی میں کچھ نہ کھانے

پینے کے باوجود بھوک کے ساتھ نیند بھی غائب تھی۔ جسم میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا جس میں تکلیف کے بجائے سرور کی کیفیت نمایاں تھی۔

دوسری صبح میں صادقہ سے پہلے اس کے دفتر میں موجود تھا۔ چند ساعت کے لیے اُس کے چہرے پر خوشگوار حیرت کا تاثر اُبھرا، پھر وہ ورکنگ ومین کی طرح بالکل نارمل ہو گئی۔ کچھ دن آنے جانے اور ہلکی پھلکی گفتگو کے علاوہ ڈھنگ کی کوئی بات نہ ہو سکی۔ قریباً ایک ہفتہ بعد اُس نے مجھے آٹھ دس ڈسپنسریوں کا نگران مقرر کر دیا۔ عملہ کی جانچ پڑتال، دوائیوں کی کمی بیشی، صفائی ستھرائی کے علاوہ مریضوں کی دیکھ بھال، سیریس مریضوں کے لیے ہسپتال میں علاج کا بندوبست میری ذمہ داری کا حصہ تھے۔ صادقہ تمام ڈسپنسریوں میں ہفتہ وار وزٹ کیا کرتی جس میں مختلف اوقات میں مختلف کارندے اُس کے ہمراہ ہوا کرتے۔ کچھ عرصہ بعد اس ہفتہ وار وزٹ میں صادقہ کے ساتھ میری ڈیوٹی لگا دی گئی۔ اس طرح میرا کچھ وقت اُس کے ساتھ گزرنے لگا۔ تھوڑے عرصے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ سیاسی میٹنگوں میں بھی لے جانے لگی اور بہت سے امور پر مجھ سے مشورہ بھی لیا جانے لگا۔ فون پر گفتگو کے علاوہ کبھی کبھی ہمارا کچھ وقت ریسٹورنٹ میں بھی گزرتا۔ ایسا موقعہ تب ہی آتا جب کسی میٹنگ سے بروقت فراغت مل جاتی یا کسی گیدرنگ میں چائے بدمزہ ہوتی۔

ایک دن میں نے اپنی بیکاری کا گلہ کیا تو مجھے بہ غور گھورتے ہوئے بولی۔ "تمہارا مقصد فقط نوکری ہے تو میں بندوبست کیے دیتی ہوں۔ مگر میری خواہش ہے کہ تم تھوڑا تجربہ حاصل کر لو تو بہتر ہے۔"

صادقہ جہاں دیدہ، بردبار، ٹھنڈے مزاج کی مالک، ایک مہذب عورت تھی۔ جلد بازی میں کبھی کوئی قدم نہ اُٹھاتی جبکہ مجھ میں برداشت کا یارا نہ تھا۔ میری گرمجوشی اکثر اسے شاکی کر دیتی۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود اُس کی جانب میرا والہانہ التفات اُس کے لیے خوشی کے ساتھ کبھی کبھی فکرمندی کا باعث بن جاتا۔ اور وہ کافی دیر گُم سُم اور کھوئی کھوئی رہتی —— پہلے کی نسبت میری پذیرائی میں اتنا فرق ضرور آیا کہ گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے پچھلی سیٹ پر اس کے برابر بیٹھنے کا حق دار بن گیا۔ اب ہماری گفتگو سیاسی سماجی کے علاوہ زیادہ تر ذاتی ہوا کرتی۔ دورانِ گفتگو کبھی ہم دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہو جاتے کہ دیکھنے والے کو ہم پر شادی شدہ جوڑے کا گمان ہونے لگتا۔ اب میری حیثیت صادقہ کے مشیرِ خاص یا سیکرٹری کی ہو گئی تھی۔ کوئی بھی مسئلہ مجھ سے ڈسکس کیے بغیر کبھی کوئی قدم نہ اٹھاتی۔ اب ہماری بیشتر ملاقاتیں اُس کے گھر ہوا کرتیں جہاں وہ کام سے واپسی پر مجھے اپنے ساتھ لے جاتی۔ رات کا کھانا اکثر میں اس کے ساتھ کھایا کرتا۔ کھانے کے بعد چائے کافی اور گفتگو گھنٹوں جاری رہتی اور ہمیں وقت کا احساس نہ ہوتا۔ ہماری گفتگو میں بیشتر جملے ذومعنی اور دوہری معنویت کے حامل بھی ہوتے —— بلکہ اب تو مجھ میں اتنی جرأت پیدا ہو گئی تھی کہ میں گاہے بگاہے براہِ راست اظہارِ عشق بھی کر بیٹھتا جس کا وہ قطعی بُرا نہ مانتی البتہ گفتگو کا موضوع بدل دیتی۔

وہ دن بڑا لُو اور حبس والا تھا۔ الیکشن کی آمد آمد تھی۔ سارا دن کارز میٹنگوں کی نذر ہو گیا۔ تھکن کے مارے مجھے ایک کے بجائے دو نظر آنے لگے۔ کچھ اثر موسم کا بھی تھا۔ میں نے اُسے اُس کے گھر کے باہر ڈراپ کر کے واپس جانا چاہا جس کی اُس نے اجازت نہ دی —— کھانے کے بعد میں چائے پینے کے حق میں نہ تھا۔ خراب موسم اور موسلا دھار بارش کے باعث جلد از جلد وہاں سے روانہ ہونا چاہتا تھا کیونکہ میرے اندر کا شیطان آہستہ آہستہ مجھے ننگے رقص پر اُکسا رہا تھا جس کی وہ مجھے ہرگز اجازت نہ دیتی۔ رات ڈھلتی گئی گفتگو طول پکڑتی گئی۔ وہ سکون و اطمینان کی چادر میں لپٹی چاند پری کی مانند ہمہ تن گوش اور میری ساری توجہ اس کے ڈھلکے ہوئے آنچل کی مہربانیوں پر تھی۔ وہ اپنی ناآسودہ زندگی کے رازوں میں

بھی کھل کر مجھے شریک کر رہی تھی۔ اور میں اُس سے لپٹنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ باہر کے مہذب انسان پر اندر کا شیطان پوری طرح قابو پا چکا تھا۔ میں نے صاف صاف آج یا پھر کبھی نہیں کے انداز میں دھمکی آمیز مطالبہ پیش کر دیا۔

گھبراہٹ، شرمندگی، رسوائی —— سب خوف عارضی مزاحمت ثابت ہوئے۔ ایک طوفان گھر کے باہر بپا تھا اور ایک گھر کے اندر۔ باہر کے طوفان کی شدت نے بادلوں کو پانی کی شکل میں برسا کر زمین کا سینہ ٹھنڈا کر دیا تھا مگر اندر کا طوفان کسی کو سیراب کیے بغیر ماند پڑ چکا تھا —— میرے اندر کا شیطان مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ میں ایک بزدل انسان یکایک معصوم بچے میں تبدیل ہو چکا تھا، جسے صادقہ کے قرب میں دنیا جہان کی آسودگی میسر آگئی تھی۔

ننگی سائیکل

یوسف چودھری

پہلا رُخ — ایک خط

پیاری ہلڈا! تمہارا محبت نامہ پاکر بے حد راحت ملی۔ تمہارے لیے دو انتہائی اہم خبریں ہیں پہلی یہ کہ میں اسپتال سے فارغ کردی گئی ہوں اور یہاں اس پرائے ملک میں اپنے ہم وطن سفارت کار مسٹر تھامس کے ہاں مقیم ہوں۔ دوسری خبر یہ ہے کہ جس مقامی آدمی نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی اُسے عدالت نے فوری طور پر قید بامشقت کی سزا سنا کر جیل بھیج دیا ہے۔ تمہارے محبت نامے میں اتنے زیادہ سوالات در آئے ہیں کہ یہ سوالنامہ بن گیا ہے۔ پیاری ہلڈا! کہیں تم اوروں کی طرح میرے اس واقعے کو مزے لے کر سننا تو نہیں چاہتیں۔ آخر تم اپنی کونسی اندرونی حِس کو تسکین دینا چاہتی ہو؟ تم بچپن کی دوست ہو لہٰذا اس خط میں دل و ذہن کی درزوں میں رینگنے والے سب خیالات و جذبات آشکارا کر رہی ہوں۔ ویسے کہیں تم ڈی۔ ایچ لارنس کے اقوال سے تو متاثر نہیں ہوگئیں؟

میری پیاری: جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرے نزدیک ڈی ایچ لارنس سے لے کر سماعت کرنے والے جج تک کے مردانہ چہرے عورت کے معاملے میں عجیب پُراسرار سازشی خاموش جیسے جذبات کے عکاس نظر آتے ہیں مجھے پتہ ہے کہ تم میری رائے سے اختلاف کرو گی۔ دراصل میں ابھی نفسیاتی طور پر سنبھل نہیں پائی۔ امید ہے میری طرف سے ارسال کردہ واٹر کلر تصاویر تمہیں موصول ہو چکی ہوں گی۔ اتفاق سے یہ تصاویر جائے واردات ہی کی ہیں جس میں قدرت کا حسن رنگتے رنگتے میں خود بھی رنگی گئی ہوں۔ تم واٹر کلر سینری کھول کر دیکھو۔ میں ذرا کافی بنا کر پی لوں۔ ذرا کی ذرا میرا انتظار کرنا — او کے ......!

تو پیاری ہلڈا! تم نے تصویر کھول کر اپنے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ یہ منظر ایک وسیع و عریض وادی کی مختصر سی پہنائی میں بہنے والے نیلگوں پانی والے نالے کا ہے جس کے دونوں اطراف میں چیڑھ، دیودار اور صنوبر کے درختوں کے مختصر سے جنگلات ہیں نیلگوں نالے کے پیٹ میں خوبصورت اور عجیب حجم و ساخت کے پتھروں کے داغ نمایاں نظر آرہے ہیں۔ سب سے بڑے پتھر پر جسے مختصر سی چٹان کہنا مناسب ہوگا میں بیٹھی ہوں۔ میرے دائیں جانب میری سرخ سپورٹس سائیکل نے اپنا بایاں کان اس پتھر سے لگا رکھا ہے۔ مگر آہ میری سائیکل — بے چاری! افسوس تمہاری متجسس آنکھیں اور تسکین طلب اندرونی حِس اس پتھر کو دیکھنے سے محروم رہیں گی۔ ہاہاہا۔ اس کھردرے اور بے رحم پتھر کا کیا خوب مصرف نکلا کہ ابتدائے آفرینش سے ہی اس کے بدن سے میرے جسم کا رگیدا جانا لکھا گیا۔ ہو ہو ہو ——
پیاری ہلڈا! اس حادثے نے مجھے غیر معمولی طور پر بے ہنگم مزاج کا حامل بنا دیا ہے اور تم سے بھی استہزائیہ انداز میں گفتگو کرنے لگی ہوں اچھا اب آؤ سینری کی طرف: یہ علاقہ چاروں طرف بلند و بالا پہاڑوں اور درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ دور دو پہاڑوں کی چوٹیوں کے درمیان اُبلتے چشمے کے دودھیا پانی کی دھار کا پل بنا ہوا ہے۔ زمین کی حرکت کے سبب جب یہ چوٹیاں سورج کے چہرے کے نیچے سے سرکتی ہیں تو اُس کی شعاعیں قوس قزح کے سات رنگوں والی کمان بن کر دودھیا پانی کے پل پر چند منٹوں کے لیے ٹک جاتی

ہے۔ پھر پانی کی دھار آہستہ آہستہ اس کمان کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے چوٹیوں کے عقب میں کہیں پرے پھینک دیتی ہے۔ دودھیا پانی کی پتلی دھار پر موسموں کی ہجرت کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ پانی انتہائی سردی میں بھی نیم گرم ہوتا ہے۔ نالے کے کناروں پر اُگے جڑی بوٹیوں کے پودے اور گھاس دیکھ رہی ہو؟ یہاں گلہریاں اور جنگلی پرندے بھاگتے پھدکتے رہتے ہیں۔ دائیں جانب کلوز اپ میں ایک درخت کے تنے سے چمٹا چڑی ترکھان اپنی مضبوط لمبوتری چونچ سے اس میں سوراخ کر رہا ہے تاکہ درخت کے اندر چھپے کیڑے مکوڑے کھا سکے۔ ہلڈا! کیا بتاؤں اس پرندے نے کیا کچھ نہیں سیکھا؟ محنت سے لے کر مکاری تک یہ اپنی مثال آپ ہے۔ صبر و تحمل اور توانائی کا بھرپور اور بروقت استعمال کوئی اس سے سیکھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس دنیا کے انسانوں کی اکثریت ان اوصاف سے محروم ہے۔ کوئی دو دن قبل میں یہاں دوربین آنکھوں سے لگائے بیٹھی تھی کہ میں نے ایک بوڑھے پوپلی ترکمان کو جس کی گردن کے وسط سے چند بال اُڑے ہوئے تھے، درخت کے نیچے بے سدھ لیٹے پایا۔ اتنے میں درخت کے نیچے سے چیونٹیوں کی ایک قطار اُتری اور اُسے مردہ سمجھ کر پل پڑی۔ ان صاحب نے بھی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی زبان چونچ سے باہر لٹکائی ہوئی تھی۔ جب چیونٹیوں کے اچھے خاصے جھنڈ سے زبان اور منہ بھر گیا تو یک لخت آنکھیں کھولیں اور زبان کو چونچ کے اندر کھینچ لیا۔ اور ایک پھریری سی لے کر جسم اور پروں سے چیونٹیوں کی باقی ماندہ قطار کو جھاڑا اور یہ جا وہ جا — مجھے حسرت رہے گی کہ دیکھ سکوں کہ چیونٹیوں کی اتنی بڑی تعداد کی غذا اُس کے جسم سے کس رنگ روپ اور حجم میں خارج ہوگی۔ پیاری ہلڈا! میں شاید اصل موضوع سے کافی ہٹ گئی ہوں۔ دیکھ رہی ہو میری ذہنی کیفیت! تاہم اسے بھی ایک سیاح کے مشاہدات کا ایک حصہ سمجھ کر قبول کرلو۔ ہاں تو تم جس چڑی ترکھان کو درخت سے چمٹا دیکھ رہی ہو۔ یہی میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا عینی شاہد ہے۔ اس کے سر اور کلغی کا رنگ اونٹ جیسا جبکہ چونچ کالی اور دُم اور پر زیبرے کی طرح دھاری دار ہیں۔ دیکھو تو میں نے اسے کیسا پینٹ کیا ہے، تمہیں یقیناً پسند آیا ہوگا! میں اس کا بغور معائنہ کرتی رہی ہوں۔ یہ بار بار اُڑ کر آتا اور چونچ کے ٹھونگوں سے درخت کے تنے کا نرم کھوکھلا حصہ تلاش کرتا۔ بالآخر چونچ کی مسلسل ضربوں سے درخت کے تنے میں سوراخ کر دیا تو اس نے چونچ سوراخ میں ڈال کر کیڑے مکوڑے کھانا شروع کر دیئے۔ پھر میں نے واٹر کلر پینٹنگ کا کام ختم کرکے تمام متعلقہ سامان چمڑے کے بیگ میں سنبھال کر رکھا اور ماحول کا تجزیہ کیا تو درخت پہاڑ اور پتھر ٹھوس شکل اور ہوا اور کھلا آسمان لطیف صورت میں نظر آئے۔ جبکہ کیڑوں، مکوڑوں اور پرندوں اور خود کو گوشت پوست کی مخلوق کے روپ میں دیکھ کر حیرت ہوئی کہ قدرت نے کیسے سارے ماحول کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ وادی تو طلسمات سے لبریز ہے۔ میں ڈوبتے سورج کی جانب منہ کرکے لطیف سوچوں میں گم ہوگئی۔ معاً ایک بھاری سوچ کا کوندا لپکا۔ کیا واقعی سورج ڈوب رہا ہے؟ — نہیں — یا زمین اُس کے چہرے سے پرے گھوم رہی ہے۔ زمین کا اُس کے گرد گھومنا ہی بہت بڑی حقیقت اور بڑا رومان ہے۔ وگرنہ یہ کائنات تو ایک مسلسل دن ہی کی گرفت میں تو ہے۔ ایک ایسا دن جس کی ابتدا کا علم نہیں اور انتہا —!
اوہ میرے خدا یہ سب کچھ کہاں جا رہا ہے؟

وقت اور فاصلے کا تصور حد درجہ اذیت ناک لگنے لگا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کئی ایک طویل کش لیے۔ مجھے اپنے ارد گرد فضا میں بوجھل پن اور اجنبیت کا احساس سا ہوا۔ پھر ایک انسانی ہاتھ بڑھا اور میرے منہ سے سگریٹ اچک کر پرے پھینک دیا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا نوجوان تھا۔ اس سے پہلے کہ میں صورت حال سمجھتی، اُس نے مجھے دبوچا اور پتھر نما چٹان پر رگیدنا شروع کر دیا۔ میں نے بھی مزاحمت شروع کر دی۔ اسی درخت کے تنے پر اب ایک چڑی ترکھان چمٹا بڑی شد و مد سے ٹھونگے لگا رہا تھا۔ وہ ہم دو انسانوں کی کش مکش سے بے نیاز اپنے کام میں مگن رہا۔ میں مزاحمت کے دوران بھی اُسے نظر انداز نہ کر پائی تھی۔ ہے نا کتنی عجیب بات!

کیا میں واقعی مزاحمت کر رہی تھی ؟ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے ـــــ اس نے پہلے کہ مجھ پر خود سپردگی کا طلسماتی لمحہ آتا، وہ غیر تربیت یافتہ درندہ اپنے وحشی جذبے کی تکمیل کر بیٹھا تھا اور پتھر نما چٹان سے نیچے لڑھک کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میرے اندر بے شمار آوازیں چیخنے لگیں مجھے اپنا سر گھومتا نظر آنے لگا۔ شدید نفرت اور غصے سے بے بس ہو کر میں اٹھی اور اُس کا منہ چڑا کر ناچنے لگی۔ شاید میں کچھ گا بھی رہی تھی۔ ہاں میں بڑے ترنم یا بے ترنم سے اُسے گالیاں بک رہی تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ اور میں وحشت کا ناچ ناچ رہی تھی مجھے اس ماحول کی ہر چیز سے نفرت ہو رہی تھی۔ وادی، پہاڑ، درخت، نالہ اور چڑھی ترکھان تک مجھے اجنبی دکھائی دینے لگے ـــ لگتا تھا ماحول نے میرے خلاف سازش کر رکھی تھی۔ بس اُس لمحے مجھے اپنی سائیکل ہی ہمدرد نظر آئی۔ میں پتھر نما چٹان سے کودی اور اُس کے ہینڈل کو چوما۔ بس یہیں سے بات بگڑ گئی۔ اُس درندے نے کلہاڑا اٹھایا اور سائیکل پہ برسانا شروع کر دیا میں چیختی چلاتی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ پیاری ہلڈا! اُس شخص نے میرے سامان کی کسی اور چیز کو بالکل نہیں چھیڑا۔ بس سائیکل لی، ایسی تیسی کر دی۔ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ مگر ذرا جلدی سمجھ کر مجھ سے نفرت کی گئی ہے۔ ہلڈا! میں اس بھیانک واقعے کو بھولنا چاہتی ہوں۔ تم ایسا کرو وار ڈکر سینسری کو جلا دو ـــ جلا دو گی نا ؟ ـــ میں بھی وعدہ کرتی ہوں کہ اس واقعے کے نقوش ذہن سے کھرچ سکوں تاہم مجرم کو عدالت نے سزا سنا دی ہے۔ مگر میں اُسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ ہو سکتا ہے میں کبھی اپنے دل اور ذہن بڑا کر کے اس کا قصور معاف کر دوں ـــ مگر اپنی پیاری جیتی جاگتی سائیکل کا قتل! میں اُسے حشر تک معاف نہیں کروں گی!

فقط تمہاری اور صرف تمہاری

نورما جونز

(جیل میں سُنائی گئی گفتگو) "دوستو اور بھراؤ! جب تقدیر کھوٹی ہو تو تدبیر کی چمک بھی کام نہیں آتی۔ پوچھتے ہو میں یہاں کس جرم کی پاداش میں آیا؟ اب کس بات کا پردہ؟ اس حمام میں ہم سب ننگے ہیں۔ جو بات آپ سب کو کل کلاں کو معلوم ہو جائے گی وہ آج میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔ بس میرا ایک گوری چٹی غیر ملکی میم سے منہ کالا ہو گیا۔ جی ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ منہ کالا کیا جاتا ہے، ہوتا نہیں۔ مگر یقین کریں کہ میرے معاملے میں واقعی منہ کالا ہی ہو گیا۔ اس موسمِ بہار میں وہ پہلی میم تھی جو ہمارے پہاڑی علاقے میں گھومنے آئی۔ میں سڑک کے کنارے پتھر پر بیٹھا بڑے مزے سے بانسری بجا رہا تھا کہ وہ ریسٹ ہاؤس کی جانب سے اپنی پتلی بدیسی سائیکل پر سوار ہوا کے جھونکے کی طرح میرے قریب سے گزر گئی۔ مجھے دیکھے اور محسوس کئے بغیر وہ بالکل ناک کی سیدھ میں سائیکل چلاتی گئی۔ صبح کا وقت تھا۔ سورج بادشاہ کا دربار لگا ہوا تھا۔ میرے سامنے دور اونچائی پر بڑے پہاڑ کی چوٹی سے چشمے کے پانی کی دھار چھوٹے پہاڑ کی چوٹی پر گر رہی تھی۔ ہمارے علاقے کے بڑے بوڑھے کہا کرتے کہ بڑا پہاڑ چھوٹے پہاڑ پر تھوکتا رہتا ہے۔ میم نے پتلی سی سرخ شرٹ اور مختصر سا جانگیہ پہنا ہوا تھا۔ وہ خود بھی آدھی ننگی تھی۔ اُس کی سائیکل کے ننگے پتلے پتلے ٹائر دیکھ کر بھی بہت ہی حیا آئی۔ وہ سائیکل اس لگن اور مزے سے چلا رہی تھی کہ ہوا میں اُس کے سنہرے بال تیرتے ہوئے گویا درختوں کے تنوں کو کاٹتے محسوس ہوتے۔ ابھی علاقے میں معمولی سی ٹھنڈک تھی مگر اُسے ٹھنڈک محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس کے اندر بہت گرمی تھی۔

دوستو اور بھراؤ! سچ پوچھو تو اُسے دیکھ کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ اور حلق خشک ہونے لگا۔ بانسری کو پھونک ماری تو اُس میں سے مری ہوئی آواز کے سوا کچھ برآمد نہ ہوا۔ میم نے میرا ہر شے سے دل اچاٹ کر دیا۔ میں نے بانسری ڈب میں اُڑسی اور سڑک کے نیچے اتر کر قدرے گہرائی میں بہنے والے نیلے نالے کی جانب اترتا چلا گیا۔ نالے کے صاف ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوئے۔ ایک دو گھونٹ پانی سے حلق تر کیا تو حواس بجا ہوئے۔ بانسری کو پھونک ماری تو ٹھیک سُر نکلا۔ میں

نالے کے بڑے پتھر پر بیٹھ گیا اور بانسری کے سروں سے کھیلنے لگا۔ نالے کا نیلا پانی پتھر سے ٹکرا کر دودھیا ہو جاتا۔ چند ایک پرندے دائیں بائیں اُڑ کر شور مچانے لگے۔ گھاس میں گلہریاں اور ٹڈے اچھلنے لگے۔ بانسری کی آواز میں جادو ہوتا ہے جادو ـــــ اتنے میں گاؤں سے دو تین سنگی ساتھی آ گئے اور میم کے بارے میں شرمناک سی باتیں کرنے لگے۔ اُنھوں نے میم کو دیکھ لیا تھا اور اُن کے ارادے بھی کچھ نیک نہ تھے میں اُن کے روکنے کے باوجود نہ رکا اور تیزی سے گھر چلا آیا۔

کوئی دو دن بعد میں کلہاڑا اٹھائے کسی درخت کو کاٹنے کے چکر میں پھر نیلے نالے کی طرف جا نکلا تو وہ میم بڑے پتھر پر بیٹھی سگریٹ پی پی کر ڈوبتے سورج کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی پتلی سرخ سائیکل بڑے پتھر کے ساتھ ٹکی تھی اور دودھیا پانی اُس کے ننگے ٹائیروں کو نہلا رہا تھا۔ میم ہمارے علاقے میں بلا روک ٹوک گھوم رہی تھی اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔

دوستو اور بھراؤ! مجھے وہ اُس وقت کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ سیاہ بڑے پتھر پر وہ سفید ننگی کلائیوں اور رانوں سمیت بیٹھی یوں لگتی تھی گویا پتھر سے گوشت کا پھول اُگ آیا ہو۔ میری بات پر ہنستے ہو؟ ہنس لو ـــــ مگر محسوس تو کرو ـــــ کہ گوشت کا پھول ـــــ!

ہاں تو آگے کی سنو۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو وہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ سورج بادشاہ کا دربار اُجڑ رہا تھا۔ پرندوں کی ایک ڈار میرے سر پر سے گذری اور میرے ہوش و حواس کو پتہ نہیں کیا ہوا کہ میں میم پر پل پڑا اور اس کی چیخ پکار کی پروا کیے بغیر اسے پتھر پر رگیدنے لگا۔ شاید میں نے اُسے گالیاں دی ہوں ایک دو ہاتھ بھی جمائے ہوں مجھے کچھ خاص یاد نہیں۔ مجھ پر تو کوئی اور ہی طاقت سواری کر رہی تھی۔ پھر اُس نے مزاحمت کم کر دی۔

پہلے تو میں اپنے کیے پر پچھتانے لگا اور گم سم سا ہو کر پتھر سے نیچے لڑھک گیا۔ پھر دوستو اور بھراؤ! میم نے عجیب سا ناچ ناچنا شروع کر دیا ـــــ وہیں پتھر پر ـــــ ننگا ناچ اور اپنی زبان میں کوئی گیت گا گا کر میرا منہ چڑانے لگی۔ پتھر پر اگا گوشت کا پھول اب ننگا لہراتا ہوا شعلہ بن کر میری طرف لپک رہا تھا۔ پھر وہ ننگا شعلہ پتھر سے کودا اور پتھر سے ٹکی سائیکل کو لپٹنے چومنے لگا۔

نالے کے دودھیا پانی سے نہاتی ہوئی سائیکل دیکھ کر مجھے حد درجہ حیا اور غصہ آیا۔ میں نے کلہاڑا اٹھایا اور مار مار کر سائیکل کے ٹکڑے اڑانے لگا۔ میم چیختی چلاتی اوپر سڑک کی جانب بھاگ گئی۔ بس پھر دوستو اور بھراؤ! مجھ پر مقدمہ چلا اور میں یہاں بھیج دیا گیا۔ سچ ہے تقدیر کھوٹی ہو تو تدبیر کی چمک بھی کام نہیں آتی۔ جی کیا کہا؟ اب میں تمہاری اس بات کا کیا جواب دوں کہ میں نے خواہ مخواہ کیوں سائیکل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ہائے! تم نہیں سمجھ سکتے ـــــ نہ اس ننگی سائیکل پر میم سوار ہو کر آتی ـــــ اور نہ میرے ایمان اور نیت کو داغ لگتا ـــــ"

نئی تصویر

نصیر احمد ناصر

کاسنی کپڑوں میں ملبوس، بنفشے کے پھول جیسی وہ لڑکی آرٹ گیلری میں میرے ساتھ ہی داخل ہوتی ہے۔ آرٹ گیلری میں تصویریں بنانے اور دیکھنے والوں کا ہجوم ہے۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ ساتھ شوکیسوں میں سجی اور دیواروں پر آویزاں تصویریں دیکھنے لگتا ہوں۔ سامنے ہندو دھرم کی ایک تصویر شوکیس میں رکھی ہے "رادھا پتوں کی سیج پر کرشن کا انتظار کر رہی ہے" میرے اندر انتظار کی نیلی، پیلی اور سرخ روشنیاں جلتی بجھتی ہیں اور مجھے اکیلے پن کا شدید احساس ہوتا ہے میں ہجوم میں کسی شناسا چہرے کی تلاش میں نگاہوں کی دوربین گھماتا ہوں تو نہ جانے کیوں میری نظریں دور کونے میں کاسنی کپڑوں والی لڑکی پر رک جاتی ہیں۔ رنگ برنگی روشنیوں کی پھوار میں کینوس پر جھکی، تصویر بناتے ہوئے وہ خود بھی کسی تصویر کی طرح لگ رہی ہے۔ میں اس کے پاس جاکر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ وہ کینوس پر برش پھیرتے ہوئے میری طرف دیکھتی ہے اور میرے ہموار چہرے پر اپنی پہچان کی لکیریں ڈھونڈتی ہے۔

"تم کون ہو؟" وہ جیسے خود سے سوال کرتی ہے۔

"مجھے روشنی کی تلاش ہے"—— میں بظاہر اپنے آپ سے لیکن اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہوں۔

پھر جیسے وہ سب کچھ سمجھ جاتی ہے اور فلسفیوں کی طرح ہاتھ اُٹھا کر کہتی ہے "تم وہی ہو نا——!! وہ جو اندھیری گلیوں میں بیٹھ کر روشنیوں کی کہانیاں لکھتا ہے —— وہ جو شام کے نیلگوں اندھیروں میں آسمان پر طلوع ہونے والے پہلے ستارے کو ہر روز دیکھتا ہے —— تم جو آنے والی نسلوں کے لئے ہر صبح روشنی کی فصل بوتے ہو لیکن لوگ اسے شام ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیتے ہیں —— روشنی پیدا ہوتے ہی مر جاتی ہے"۔ اور وہ مجھ سے یوں بے تکلف ہو جاتی ہے جیسے ہم صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

وہ پھر کینوس پر جھک جاتی ہے اور میں لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہوئے ہجوم کو دیکھنے لگتا ہوں —— یہ سب لوگ بظاہر کتنے پرسکون ہیں لیکن ان کے اندر خواہشوں کے شیشوں میں فریم کی ہوئی کئی تصویریں ٹوٹتی جا رہی ہیں۔ یہ سب ادھورے ہیں اور ان کے وجود تکمیل کے آخری مراحل میں گر جانے والی عمارتوں کی طرح ہیں —— یہ چلتی پھرتی بے رنگ اور بے معنی تصویریں —— منظر اور پس منظر —— روشنی اور سایہ —— روح اور جسم —— خالق اور مخلوق —— بنانے والا تاریکی میں گم ہے ——!!

وہ ابھی تک کینوس پر رنگ بکھیر رہی ہے۔ میں اس کے چہرے پر ڈھلک آنے والے بالوں کو اپنے ہاتھ سے پرے ہٹاتا ہوں تو وہ ایک طویل سانس لے کر محویت سے چونکتی ہے۔ "وہ دیکھو ایک پہاڑی لڑکی——!!" میں اس کی توجہ سامنے لگی ہوئی تصویر کی طرف مبذول کراتا ہوں۔ برش کی الٹی سائیڈ منہ میں لے کر وہ اس طرف دیکھتی ہے —— "ایک پہاڑی لڑکی

کسی اجنبی اپنے کی دی ہوئی یاد ننھی منی سی بچی کو سینے سے لگائے، شہر سے آنے والی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر بیٹھی ہے۔ پگ دور تک سنسان ہے اور بستی میں شام پھیلی ہوئی ہے ـــــ تم نے اس پہاڑی لڑکی کی آنکھوں میں انتظار کی روشنی وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہتی ہے "ہاں ـــــ مگر پس منظر میں گہری شام چیخ رہی ہے۔"

میں اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہتا ہوں "پہاڑی لڑکی کا انتظار بے سود ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ زندگی کتنی مہ ہے اور کوئی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اسے جس کا انتظار ہے وہ شہر کے کلب میں چوبی فرش پر کسی سنہری بالوں والی عورت کی میں تھرک رہا ہوگا یا پھر زیادہ باوفا ہوگا تو ضمیر پر بزدلی کا بوجھ لیے نشے میں چور، اندھیری گلیوں میں دستکیں دے رہا ہوگا

اور وہ میری طرف یوں حیرت سے دیکھتی ہے جیسے اس تصویر کے پس منظر میں، میں ہوں۔

وہ ایک بار پھر رنگوں میں اُلجھ جاتی ہے۔ میں بوریت دور کرنے کے لیے اپنی سال خوردہ پتلون کی جیبیں ہوں۔ میرے ہاتھ میں سگرٹوں کا خالی پیکٹ آتا ہے میں ایک کونے میں پھینک دیتا ہوں اور بے بسی سے اس کی دیکھتا ہوں۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ڈالے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مختلف تصویریں دیکھنے لگتے ہیں۔ اُ انگلیوں سے پھوٹنے والی ان دیکھی شعاعوں کی حدت میرے ہاتھ کو گرماتی ہوئی آہستہ آہستہ مجھ میں منتقل ہونے لگتی ہے۔ اِ تصویر کے سامنے وہ رک جاتی ہے۔ "یہ دیکھو ـــــ! مکان کی چھت جھکی ہوئی ہے سیلن زدہ دیواروں کا پلستر اُکھڑ چکا ہے میلے کچیلے بستر ہیں۔ بوڑھی بیمار عورت کھانس رہی ہے۔ اس کی جوان بیٹی سلائی مشین پر جھکی ہوئی کسی دلہن کا احمریں لباس سی رہی ہے۔ چھوٹا لڑکا اپنے وزن سے زیادہ کتابیں اٹھائے سکول جا رہا ہے۔ شاید روشنی کی تلاش میں۔ پس منظر میں ملے جلے رنگ پھیلے ہوئے ہیں۔"

"روشنی کہاں ہے؟" میں سوال کرتا ہوں

وہ پس منظر میں پھیلی ہوئی بے رنگ لکیروں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

"لیکن یہ تو چند نادیدہ شعاعوں کا غیر واضح عکس ہے اور وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔" میں کہتا ہوں "بوڑھی عورت مر جائے گی۔ جوان لڑکی دلہنوں کے لباس سیتے سیتے بوڑھی ہو جائے گی ـــــ"

ہم وہیں ٹھہرے رہتے ہیں اور لمحے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ اور پھر ہمارے دیکھتے دیکھتے شکستہ دیواروں کا پلستر نیچے گر پڑتا ہے۔ بوڑھی عورت مر جاتی ہے۔ جوان لڑکی بوڑھی ہو جاتی ہے۔ لڑکا ہاتھ میں روشنی کی سند لیے شہر کی سڑکوں پر آنے والی تاریک ساعتوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہے ـــــ اور وہ گھبرا کر سامنے لگے ہوئے قد آدم آئینے میں اپنے سر پر اُگ آنے والے چاندی کے بال دیکھنے لگتی ہے۔

وقت گھڑیوں کی سوئیوں سے لٹکا ہوا مجھے گھورتا ہے اور میں اس کا ہاتھ تھامے ہوئے ہجوم کے سینے میں شگاف ڈالتا، تصویریں (جو ابھی موقلم اور رنگوں کے درمیان خلا میں ہیں) دیکھتا جاتا ہوں۔ تب اچانک مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں تنہا ہوں۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے لیکن وہ ـــــ! حیرت اور تجسس سے میری آنکھوں کی پتلیاں گھومنے لگتی ہیں اور پھر میں اسے دیکھ لیتا ہوں۔ دور ایک گوشے میں شیشے کے شوکیس کے پاس کینوس پر جھکی ہوئی وہ موقلم اور رنگوں کے درمیانی خلا کو عبور کرنے کی کوشش میں ہوتی ہے۔ میں تیز تیز چلتے ہوئے اس کے پاس پہنچتا ہوں تو وہ کہتی ہے "انتظار کرو، میں روشنی کی تصویر بنا رہی ہوں تاریک اور سیلن زدہ دیواروں کے اس پار روشنی ہوگی۔ انتظار کرو۔"

میں اس کے ہاتھ کی طرف دیکھتا ہوں۔ اس کی نرم و نازک مخروطی انگلیاں کھردرے ہاتھ میں جکڑی ہوئی ہیں۔ انگلیوں کے یہ رشتے الوٹ ہیں، اس لمحے میں سوچتا ہوں۔

لمحوں پر محیط صدیاں گزر جاتی ہیں۔ میں انتظار کرتا ہوں۔ وہ تیزی سے برش چلا رہی ہے۔ کینوس پر نیلے پیلے اور سرخ رنگ بکھر رہے ہیں لیکن وہ نہیں جانتی کہ یہ سب منعکس ہو کر تاریک ہیولے بنا رہے ہیں۔ پیش منظر اور پس منظر دونوں تاریک ہیں روشنی نہیں ہو سکتی۔

اور اچانک مجھے یاد آتا ہے کہ میری ماں بیمار ہے اور مجھے اس کے لیے دوائی لے کر جانا ہے۔ "میں انتظار نہیں کر سکتا" میں کہتا ہوں لیکن وہ چپ ہے۔ اس کی لانبی مخروطی انگلیاں دائرہ در دائرہ پھیل کر میرے ہاتھ سے پھسلنے لگتی ہے اور ان پر میری گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ "اپنا ہاتھ واپس لے لو" میں دکھ سے چیختا ہوں لیکن وہ پورے انہماک سے تصویر بنا رہی ہے۔ اور اسی انتظار کو بوجھل کر دیتی ہے اور میں اُس کا ہاتھ شوکیس کے پاس فرش پر پھینک دیتا ہوں۔

وہ ایک ہاتھ سے نیلے پیلے اور سرخ رنگ بکھیر رہی ہے اور اس کا دوسرا ہاتھ فرش پر تڑپ رہا ہے ــــ شوکیس کا شیشہ اوپر اُٹھتا ہے اور آرٹ گیلری میں ایک تصویر کا اضافہ ہو جاتا ہے ــــ میں آرٹ گیلری کے خارجی دروازے کی طرف چل پڑتا ہوں۔ باہر دبیز تاریکی پھیل رہی ہے اور اندر نیلی پیلی اور سرخ روشنیاں جل رہی ہیں۔

ادھوری لڑکی

منیرہ احمد شمیم

"امثل"

"ہوں!"

"چلو اُٹھو، باہر چلتے ہیں!"

"باہر کہاں؟" امثل بیزاری سے پوچھتی ہے۔

"کہیں ——— کسی چھوٹے سے ریستوران میں چائے پئیں گے!"

امثل چارپائی پر اپنا بکھرا ہوا وجود سمیٹ لیتی ہے، بیزاری سے جماہی لیتی ہے اور اپنے آپ کو تیار کرتی ہے۔

امثل بکھرے ہوئے وجود کی لڑکی ہے۔ یا مجھے بکھری ہوئی نظر آتی ہے، شاید وہ خود بھی یہ جانتی ہے یا شاید وہ نہیں جانتی۔ لیکن میں نے اُسے اس لمحے کی گرفت میں دیکھا ہے جب وہ اپنے بکھرے ہوئے وجود کو دیکھ لیتی ہے۔ پھر وہ امید کے ٹیپ سے اپنے وجود کو جوڑ لیتی ہے۔ کبھی کبھی آنسوؤں سے یہ ٹیپ بھیگ جاتا ہے، اور پھر ادھڑ جاتا ہے ———!

امثل میری روم میٹ ہے۔ ہم آخری سال میں ہیں۔ یونیورسٹی کا یہ آخری سال خود فریبی یا آزادی کا آخری سال ہے، ——— آگے کیا ہوگا؟ آگے کیا ہوگا؟ ——— کبھی کبھی تشویش اپنے بھاری ہاتھوں سے دروازے پر دستک دیتی ہے لیکن یہ وقت ان باتوں کا نہیں ——— امثل کو میں چار سال سے جانتی ہوں، یا شاید چار صدیوں سے، کیونکہ میں نے اس کی کھوکھلی روح میں اُتر کر اس تنہائی کی گونج سنی ہے، جسے وہ سگریٹ، اور پھر راکٹ سے دبانے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔

معمولی بے حد معمولی شکل و صورت کی امثل ایک گونج ہے اور اس گونج کا ایک دائرہ ہے، اس دائرے کا ایک مرکز ہے اور اس مرکز میں میں نے امثل کو دیکھا ہے ——— لیکن یہ اور بات ہے!

امثل کپڑے بدل کر تیار ہو گئی ہے، وہ اپنے پرس میں سگریٹ کی نئی ڈبیہ اڑس رہی ہے۔ امثل نے اپنے وجود پہ بے نیازی کا ایک خول چڑھا دیا ہے۔ اسے میں جانتی ہوں، اور میں نے یہ خول اتار دیا ہے، اور امثل کو اپنے اصلی روپ میں دیکھ کر لذت لیتی رہی ہوں ——— شاید میں ہر آدمی کی طرح کمینی ہوں۔ لیکن ایسے بھی لمحے آتے ہیں جب میں امثل کے لئے سراپا ہمدردی بن جاتی ہوں، اور کیا پتہ میں نے یہ سب کچھ اس کی ہمدردی میں کیا ہو۔ ہماری ہر بات میں دو رُخ ہوتے ہیں ——— بعض اوقات ہم صرف ایک ہی رُخ دیکھ لیتے ہیں، اور دوسرا رخ ہمیں کبھی نظر نہیں آتا ———!

"چلو جان، امثل تیار ہے۔"

باہر دھوپ ہے ڈھلتی ہوئی۔ مال روڈ کے پرلے سرے پر چھوٹا سا ریستوران ہے۔ ہمیں وہاں جانا ہے۔ یہی ہمارا ٹھکانا ہے،

یہاں ہم تھوڑے سے پیسوں میں بہت سا عیش کرتے ہیں یا عیش کا تاثر حاصل کرتے ہیں۔ اسی عیش سے امتل کی کہانی وابستہ ہے۔ لیکن یہ کوئی اتنی بڑی کہانی بھی نہیں!

ریستوران میں لوگ ——— اکا دکا لوگ بیٹھے ہیں۔ ایک کونے میں وہ بھی بیٹھا ہے جو اس کہانی کا ایک کردار ہے۔ مجھے اس کا نام معلوم ہے، لیکن نام میں کیا رکھا ہے۔ اس کا کوئی سا بھی نام رکھ لیجئے۔ کوئی بھی خوبصورت نام، مثلاً سرمد ——— سرمد ایک کونے میں بیٹھا ہے، باہر اس کی کار ——— لمبی کالی کار کھڑی ہے۔ اس کار کی چمک اس کی شخصیت میں بھی ہے۔ سرمد خوبصورت ہے، دراز قد ہے پائپ پیتا ہے، اور اس وقت بھی پائپ پی رہا ہے۔ پائپ سے تمباکو کی بھینی بھینی خوشبو چاروں سمت پھیل رہی ہے۔ میں اس خوشبو کو اپنے وجود کے ریشے ریشے میں اتار رہی ہوں۔ مجھے اچھے تمباکو کی خوشبو اچھی لگتی ہے۔ ہمیشہ سے اچھی لگتی ہے!

امتل کونے میں بیٹھے ہوئے سرمد کے مقابل والی میز پر بیٹھ جاتی ہے۔ میں بھی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ جاتی ہوں۔ ہمیشہ یونہی ہوتا ہے۔ امتل اپنے پرس میں سے سگریٹ نکالتی ہے۔ سگریٹ کو جلاتی ہے اور ایک لمبا کش لیتی ہے۔ جیسے ساری کائنات کو اپنے اندر اتار رہی ہو۔ سرمد اس کی کائنات ہے۔ وہ بالکل اس کے سامنے بیٹھا ہے اور پائپ سے نکلے ہوئے دھوئیں کی خوشبو بکھیر رہا ہے مگر میں اس سارے کھیل میں کہاں ہوں لیکن مجھے اس سارے الجھاوے میں اپنے آپ کو ڈالنے کی ضرورت نہیں ——— کیونکہ یہ کہانی امتل کی ہے۔

سرمد امتل سے محبت کرتا ہے۔ کم از کم امتل کا یہی خیال ہے۔ اس کا ثبوت وہ خط ہیں جو سرمد نے امتل کو لکھے ہیں جنہیں اس نے مجھ سے چھپایا ہے لیکن مجھے ان خطوں کا علم ہے۔ کیسے علم ہے، یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔ سرمد کی محبت امتل کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا رہی ہے ——— سمجھ لیجئے کہ امتل اندر سے کھوکھلی ہے، اور کسی دن کسی وقت وہ کھوکھلے درخت کی طرح گر جائے گی۔

سرمد اور امتل کی خاموش محبت کو میں چھ ماہ سے دیکھ رہی ہوں ——— اور بیرے بھی اس خاموش کھیل سے حظ اٹھانے لگے ہیں۔ وہ چپکے سے آتے ہیں، پانی کا گلاس سرمد کی میز پر رکھ دیتے ہیں۔ سرمد جواب میں تشکر سے مسکراتا ہے۔ پھر بیرا چائے لاتا ہے۔ دو آدمیوں کے لئے لیکن دوسری پیالی ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ اسی طرح صاف شفاف، جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو ——— امتل دور سے پیالی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے، اور پھر خوابوں میں کھو جاتی ہے جیسے چائے کی پیالی میں اتر رہی ہو تاکہ سرمد ایک ہی گھونٹ میں اسے پی جائے!
لیکن اس میں میں کہاں ہوں۔ مگر مجھے اس الجھاوے میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی سرمد سامنے کی ٹیبل پر بیٹھا ہوا ہے۔ بیرا مسکرا کر پانی کا گلاس اور دو آدمیوں کی چائے ٹیبل پر رکھ کر جا چکا ہے۔ امتل چائے کی خالی پیالی میں اترنے والی ہے۔ وہ آنکھیں بند کرنے ہی والی ہے، جب ریستوراں کا دروازہ کھلتا ہے، ایک خوبصورت سمارٹ سی لڑکی داخل ہوتی ہے اور بڑی گرم جوشی سے سرمد کی طرف بڑھتی ہے۔ سرمد کھڑا ہو کر اس سے ہاتھ ملاتا ہے ———

"ہائے ———" لڑکی کہتی ہے۔

"ہائے ———" سرمد کہتا ہے۔

پھر دونوں قہقہوں میں چائے ملا کر پینے لگتے ہیں۔ امتل کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ وہ جیسے چائے کی پیالی میں غوطے کھا رہی ہو، خوفزدہ ہو۔ وہ فوراً اٹھتی ہے اور باہر نکل جاتی ہے۔ میں بھی باہر آ جاتی ہوں۔

باہر اندھیرا چھا چکا ہے ——— بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں ——— خزاں کی زد میں آئے درخت کے زرد پتوں کو گرا رہی ہیں ——— امتل نے جھک کر پتوں پر یوں ٹھوکر ماری ہے جیسے اپنی بیتی زندگی پر ٹھوکر مار رہی ہو۔

"امتل ـــــ، میں پوچھتی ہوں۔

"ہوں ـــــ" وہ جواب دیتی ہے۔

"کیا ہوا تمہیں ـــــ؟"

"جھوٹا، کمینہ" وہ غصے میں کہتی ہے۔

"کون؟" میں پوچھتی ہوں۔

"وہ مجھ سے محبت کرتا تھا ـــــ" وہ بڑبڑاتی ہے

آنسو اس کی آنکھوں میں تیر رہے ہیں اور وہ عشق کے پانیوں میں یوں اُتر رہی ہے جیسے شہر سیلاب کے پانیوں میں غرقاب ہو جاتے ہیں۔

"نہیں امتل ـــــ .جزاویت تم نے دیکھی نہیں اُسے تخیل کی مدد سے کیوں اس قدر جان لیوا کر رہی ہو۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہتی ہے۔

"میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں۔ تمہارا دل بڑا ہمدرد ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے تم میری زندگی میں بڑا اہم رول ادا کر رہی ہو۔ پتہ نہیں کیوں ـــــ مجھے محسوس ہوتا ہے تم مجھے بچا لوگی، کبھی کبھی، کسی آفت سے ـــــ!"

"تمہیں سرمد سے محبت ہے؟" میں پوچھتی ہوں۔

"ہاں: وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔"

"نہیں امتل ـــــ!"

"ہونہہ ـــــ میرے پاس ثبوت ہے!"

"خط؟" ـــــ میں پوچھتی ہوں۔

"ہاں ـــــ"، وہ جواب دیتی۔

"مجھے معلوم ہے" میں کہتی ہوں۔

"تجھے کیسے معلوم ہے؟" وہ پوچھتی ہے۔

"تم وہ خط مجھ سے چھپاتی رہی ہو، لیکن مجھے معلوم ہے۔"

"کیسے؟" ـــــ امتل حیرت سے پوچھتی ہے۔

میں اس کی طرف دیکھ رہی ہوں جیسے میں اسے ابھی قتل کرنے والی ہوں، میں خوفزدہ ہو کر دوسری طرف دیکھتی ہوں۔

"کیسے معلوم ہے تجھے؟" امتل مجھ سے پوچھتی ہے۔

"اس لئے کہ وہ خط تجھے میں نے لکھے ہیں!"

امتل مجھے ڈراؤنے خواب کی طرح دیکھ رہی ہے۔

مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے سارے سچے الفاظ ریت پر گر کر گم ہو گئے ہوں۔

میں امتل سے آنکھیں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگتی ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ کچھ لوگوں کو ایک دن کے لئے بھی تو اپنا من چاہا سرمد نہیں ملتا!

مختصر کہانیاں

کلیم خارجی

اُجالا

شام کے دُھندلکے میں چند اجنبی بستی میں داخل ہونے تو وہ انہیں مہمان بنا کر اپنے گھر لے گیا۔ دستر خوان پر بیٹھتے ہی اس نے اپنے بیٹے کو آواز دے کر کہا "حاکم کی دیوار گرا دو"۔
یہ سن کر مہمان خوف سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور سوچنے لگے کہ دستر خوان پر بیٹھا شخص بیٹھے ہوئے اندھیرے میں اپنے بیٹے کو حکم دے رہا ہے۔ لیکن ــــ اگلے ہی لمحے مہمان خانے میں اجالا پھیل گیا!

بُت کی سرگوشی

بھوک اور افلاس سے نڈھال ہو کر اس نے بت کے پیروں میں سر رکھ دیا۔ بت نے سرگوشی کی، "لوگوں نے مجھے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اس لیے وہ مجھے غذا اور دولت سے مالا مال رکھتے ہیں۔" یہ سن کر وہ بھی بت بن گیا۔ لوگوں نے اس کے پیروں میں بھی اناج کے ڈھیر لگا کر گلے میں سونے اور چاندی کی زنجیریں ڈال دیں۔ ایک روز کسی نے اس کے چہرے پر تھوک دیا۔ پھر کسی نے اپنے غلیظ ہاتھ اس کی پشت پر رگڑ ڈالے۔ اس نے اپنے خیرخواہ بت سے اس کی شکایت کی تو بت نے آہ بھرتے ہوئے آہستہ سے کہا،
"یہ سب کچھ میں اکیلے کب تک برداشت کرتا!"

گوتم ثانی

بہت دنوں تک اس کی پرستش کرنے کے بعد وہ بولا، "میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہیں اپنی پسلی سے نکالتا لیکن اب یہ کر سکتا ہوں کہ اپنی پسلی تمہاری پسلی سے جوڑ دوں"۔
وہ غصے سے لرز اٹھی اور جبڑا دباتے ہوئے بولی، "تمہاری پسلی تو مہاتما کی پسلی سے بھی زیادہ کمزور اور مخدوش ہے۔ مجھے فاقہ کشی اور روحانی ریاضت کا کوئی شوق نہیں۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے مضبوط، طاقت ور، لہو اور غذا سے بھرپور

پسلیوں کی ضرورت ہے۔"
ایک عرصے کے بعد وہ عجائب گھر گئی اور مہاتما کے سامنے کھڑے ہو کر رونے اور بڑبڑانے لگی۔ عجائب گھر کے ملازم نے آ کر اسے چپ کرایا اور دلاسا دیتے ہوئے بولا" عجائب گھر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ آپ نے اگر ان سے باتیں کرنی ہیں تو باہر دروازے پر چلی جائیں۔ یہ ابھی باہر نکل آئیں گے۔"
وہ چونک گئی۔ اسے پہچان لیا اور پھر پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے تیزی سے عجائب گھر سے باہر آ گئی۔

سردی اور سناٹا

رات کے پچھلے پہر دور سے بلکتے ہوئے پلے کی تیز چیخوں نے میری نیند نگل لی تو میں نے پلے کو ڈھونڈ کر خاموشی محفوظ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک مکان کے اندھیرے کونے میں سردی اور بھوک کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کمزور سا پلا چاند کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر بین کر رہا تھا۔ میں نے اس پچکارا اور روٹی کا ٹکڑا اس کے نتھنوں پر رگڑا لیکن اس کی چیخیں بند نہ ہوئیں۔ تنگ آ کر میں نے ساتھ والے مکان پر دستک دی۔ کئی دستکوں کے بعد اونگھتا ہوا ایک شخص باہر نکلا۔ میں نے اسے ملامت کرتے ہوئے کہا"میری دستکوں کی آواز پلے کی چیخوں سے زیادہ تکلیف دہ نہیں تھی۔ میں دو سے اس کی چیخیں سن کر اسے خاموش کروانے یہاں تک پہنچا ہوں۔ تم اتنے بے حس ہو اور اتنی گہری نیند سو رہے تھے؟
یکایک میرے اردگرد چند سایے لہرانے اور پھر سب مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ درد سے کراہتے ہوئے میں نے پلے کی طرف دیکھا کہ شاید اب وہ پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ چیخے گا لیکن وہ چپ ہو چکا تھا۔
اور میرے نیم جان جسم سے چمٹ کر سو گیا تھا۔

بھاری پاؤں

مے خانے کے دروازے پر ایک شخص نے مجھے زبردستی روک لیا اور میرے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد بولا' مے خانے میں داخل ہونے سے پہلے اپنے اندر کے بزدل ' کمینے اور مکار شخص کو باہر نکال جاؤ۔ تم اتنی گندی حالت کے ساتھ اندر نہیں جا سکتے۔"
مجھے اس شخص کا وعظ سن کر بے حد غصہ آیا اور میں نے مکاری سے کام لیتے ہوئے اسے بلند سیڑھیوں سے نیچے دھکیل دیا۔ میخانے کے اندر مدھم روشنی میں دھیمے سروں پر رقص کرتی ہوئی دوشیزہ میرے قریب آئی اور جھڑکتے ہوئے بولی' "تم اپنے اندر کی خباثتیں باہر چھوڑ کر نہیں آئے۔ تم پر شراب کا اثر نہیں ہو رہا۔ اگر تمہاری یہی حالت رہی تو میں کسی کو بھی بہلا نہ سکوں گی۔"
میں نے کمینگی سے اسے گھورا تو وہ تحمل سے بولی' "میں چاہتی ہوں تم بھی نشے میں ڈوب جاؤ۔ مدہوش ہو جاؤ

میں عریاں ہو جانے کے بعد بھی محفوظ رہوں۔"

میری بھوکی نظریں اس کے لباس کے اندر اتر گئیں۔ اس کے اصرار پر میں نے اسے تسلی دی اور دروازے کی ب لوٹ آیا۔ باہر سے اک اور شخص اندر آنے لگا تو میں نے اسے روک لیا اور کہا۔ "تم اپنے اندر کی گیلنگی اور سلگتے پن ے ساتھ اندر نہیں جا سکتے۔ پہلے تمہیں میری طرح صاف اور پاکیزہ ہونا پڑے گا۔" وہ شخص میری باتیں سن کر خاموشی سے ورتے ہوئے مجھے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ چنانچہ اس ڈر سے کہ کہیں وہ مجھے دھکا نہ دے دے، میں نے بلند بڑھیوں سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ اب میرے دونوں پاؤں بہت بھاری ہو گئے ہیں۔ ان پر میرے اپنے وزن اور جسامت سے زیادہ پلستر چڑھا ہوا ہے۔

دعا محفوظ ہے

بڑے سیاہ اور گول پتھر سے لپٹ کر وہ خوب رویا اور پھر قدیم انسانوں کی طرح ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی زبان بھڑک اٹھی اور وہ لوگوں کے نام لے کر دعائیں مانگنے لگا۔ اسی لمحے ایک فرشتہ اس کے سر پر نازل ہوا اور بولا "دعائیں خاص لوگوں اور خاص چیزوں کے حق میں قبول ہوتی ہیں۔ تم اپنے لوگوں کے لیے دعائیں مانگنا چھوڑ دو۔ اس سے تمہارے کرب میں اضافہ ہو گا۔"

"میں کیسی دعا مانگوں؟" وہ گڑگڑایا۔

"تم آگ کے بھڑکنے کی دعا مانگ سکتے ہو کیونکہ آگ خاص ہے۔ تم اس پتھر کے لیے دعا مانگ سکتے ہو کیونکہ یہ خاص پتھر ہے۔"

"لیکن مجھے تو ان لوگوں کے لیے دعا مانگنی ہے جن سے مجھے محبت ہے، جو میری ضرورت ہیں۔" اس کے ہاتھ ابھی تک ہوا میں اٹھے ہوئے تھے۔

فرشتہ پھر بولا "تم جن لوگوں کے لیے دعا مانگ رہے ہو، انہی جیسے ہو جاؤ تاکہ تمہاری اذیت اور محرومی ختم ہو جائے۔"

فرشتہ غائب ہوا تو وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔ تھک کر چپ ہوا تو پتھر پر بیٹھ گیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ جلتی ہوئی دیا سلائی دیکھ کر اس نے ایک دم ہاتھ اوپر کیا اور التجا کرتے ہوئے چیخا "اے آسمانی طاقتو! یہ آگ بھڑک اٹھے۔ پھیل جائے۔ چاروں طرف دور دور پھیل جائے۔ اے خدا اس آگ کو پھیلا دے۔"

آگ بھڑک گئی اور تیزی سے بلند ہو کر پھیلنے لگی۔ وہ خوف سے تھرتھر کانپ اٹھا۔ آگ کی تپش سے اس کا بدن جھلسنے لگا تو وہ چیخ اٹھا "بس اے خدا! بس۔ اب یہ آگ بجھ جائے۔ یہ آگ بجھا دے میرے خدا! یہ آگ بجھا دے۔"

فرشتہ اس کے سر پر دوبارہ نازل ہوا اور اسے ڈانٹتے ہوئے بولا "تم نے جو دعا مانگ لی ہے، اب وہ واپس نہیں پلٹے گی۔ دعائیں واپس نہیں کی جاتیں۔ یہ دنیا کا سودا نہیں ہے۔"

"یہ آگ کیسے بجھے گی؟" وہ دکھ اور تکلیف سے کراہتے ہوئے چیخا۔

"اب یہ آگ تمہاری دعا سے نہیں بجھے گی۔ اب یہ اسی وقت بجھے گی جب کوئی تمہاری طرح اس کے بجھنے کے لیے دعا مانگے گا۔ اس وقت تک یہ پھیلتی اور بلند ہوتی رہے گی۔"
پھر فرشتہ ہمدردی سے بولا "تمہاری پوشاک جل رہی ہے۔ تمہارے پاس ایک دعا محفوظ ہے۔ تم دعا مانگو کہ پتھر تمہیں لے اڑے کیونکہ آگ تمہارے چاروں طرف سمندر کی طرح پھیل رہی ہے۔"
لیکن وہ کراہتے ہوئے بولا "میں تنہا جی کر کیا کروں گا" اور پھر جلتی ہوئی پوشاک میں جھلستے ہوئے وہ پتھر سے نیچے گر پڑا۔

سودا

کھڑکی کھول کر اس نے باہر جھانکا اور بھوکے کمزور آدمی سے بولی "تمہارے چہرے پر آنکھیں بیکار ہیں۔ مجھے دے دو۔ میرا سنگھار ہر روز ضائع ہو جاتا ہے۔ میرے شوہر نے آج تک مجھے ایسے نہیں دیکھا جیسے تم دیکھتے ہو۔"
آدمی بولا "تم صرف آنکھیں مانگتی ہو۔ میں رزق اور لباس کے لیے ہاتھ پاؤں سب کچھ دینے کے لیے تیار ہوں۔"
"ہاتھ پاؤں تو میرے شوہر کے بھی بہت ہیں۔ میں تمہیں آنکھوں کے بدلے بسکٹوں کے پیکٹ اور ایک ورزشی سوٹ دیتی ہوں۔"
اس نے آنکھیں دے دیں اور بدلے کی چیزیں لے کر غلاظت کے ڈھیر میں جا گرا۔
ایک روز عورت نے دیکھا کہ اس کا شوہر روزانہ صرف پیٹ لے کر گھر میں داخل ہوتا ہے۔ اس اچانک انکشاف پر پہلے تو اسے حیرت ہوئی۔ پھر سخت غصہ آیا۔ اس نے شراب کی بوتل اس کے پیٹ پر دے ماری اور پرس سے آنکھیں نکال کر غلاظت کے ڈھیر کی طرف چل پڑی۔

٭

ادا جعفری

○

ہے درد ابھی جادو اثر، ٹھہرو ذرا
یراں نہ ہو جائے یہ گھر، ٹھہرو ذرا

سوچو ذرا، شاید کوئی ہے منتظر
کیوں خواب ہوں نامعتبر، ٹھہرو ذرا

شاید کوئی پہچان لے، اپنا کہے
ہیں بے صدا آنکھیں، مگر ٹھہرو ذرا

ممکن نہیں ہے بھولنا جس راہ کو
اس راہ میں بارِ دگر ٹھہرو ذرا

تسکیں ملے، احوالِ جاں تم سے کہیں
ہے داستاں بھی مختصر، ٹھہرو ذرا

دیکھو کہ اب ہیں کرچیاں بکھری ہوئی
کچھ لوگ تھے آئینہ گر، ٹھہرو ذرا

بیگانگی کی آنچ میں جھلسے ہوئے
موسم بدل جائیں اگر ٹھہرو ذرا

مانا کہ یوں ہم بھی یہاں خوش تو نہیں
روشن مگر ہے ایک در ٹھہرو ذرا

بے چارگی کو چارہ گر بھی دیکھ لو
گزرو نہ تم یوں بے خبر ٹھہرو ذرا

منزل وہی ہے تم جسے منزل کہو
پابستۂ شام و سحر ٹھہرو ذرا

○

ہر ایک قطرۂ خوں سے دیے جلائے ہوئے
یہ کون لوگ ہیں، کن بستیوں سے آئے ہوئے

تمھیں خبر نہ ہوئی، ہم نے انتظار کیا
تمھاری راہ میں کتنے فلک بچھائے ہوئے

ستارے کیا کہ یہاں دشتِ ماہتاب بھی ہے
ہماری آنکھ ہے کتنے ہنر چھپائے ہوئے

یقیں کیوں نہیں آتا کہ سچ ہے اب بھی وہی
زمانہ گزرا ہے جس پر یقین لائے ہوئے

تو کیا ابھی ہمیں آدابِ غم بھی سیکھنا ہیں
فگار دل کے ہر اعزاز کو بھلائے ہوئے

تو کیا ہوائیں سندیسہ کوئی نہ لائیں گی
جو چہرہ چہرہ اُجالے تھے کیا وہ سائے ہوئے

کھنڈر بھی دیکھو، خزینے بہت ملیں گے تمھیں
یہ قریے اہلِ محبّت کے تھے بسائے ہوئے

سفر طویل تھا لیکن سفر طویل سہی
میں آ رہی ہوں زمانوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے

اداؔ حصار سے باہر قدم تو رکھنا تھا
زمانہ پاس سے گزرا نظر بچائے ہوئے

ضیا جالندھری

○

یہ زمیں صحیفۂ خاک ہے، یہ فلک صحیفۂ نور ہے
یہ کلام پڑھ کبھی غور سے، یہاں ذرّہ ذرّہ زبور ہے

یہاں برگ برگ ہے اک نوا، گل و یاسمن ہیں سخن سرا
اسے حفظ کر، اسے دل میں رکھ، یہ چمن جو تیرے حضور ہے

یہ جو چند پل ترے بس میں ہیں، انھیں دُر سمجھ کے سمیٹ لے
یہ جو آگ سی ترے دل میں ہے، یہ شبیہِ شعلۂ طور ہے

میں خزاں سے خوف زدہ نہیں، میں ہوا کا دست نگر نہیں
تبِ موجِ گل مرے خوں میں ہے، مرے دل میں لحنِ طیور ہے

وُہی جی گئے جو حیات کے خد و خال خوں سے سجا گئے
انھیں موت کا کوئی ڈر نہیں جنھیں زندگی کا شعور ہے

کبھی راحتوں میں بھی رو لئے، کبھی جی کو غم سے رجھا لیا
یہاں، ہجر و وصل سب ایک ہیں، نہ وہ پاس تھا، نہ وہ دُور ہے

شب و روز دشتِ حیات کے سفرِ گراں میں گذر گئے
وہی جسم و جاں کی شکستگی، وہی آرزو کا وفور ہے

پسِ خندہ جھانک لیا نہ ہو، رخِ گریہ دیکھ لیا نہ ہو
یہ جو حد سے بڑھ کے تپاک ہے، کوئی پردہ اس میں ضرور ہے

وہ غریب مجھ کو عزیز ہے، وہ فقیر میرا امام ہے
جسے خاک ہونے پہ ناز ہے، جسے چشمِ تر پہ غرور ہے

دلِ آدمی میں بھڑک اُٹھی ہے یہ کیسی خواہشِ خودکشی
یہ جو شہر شہر فساد ہے، یہ جو قریہ قریہ فتور ہے

کوئی نغمہ سنج ہو کیا ضیا، یہاں کوئی بزم سجائے کیا
نہ ہوا میں پہلا خمار ہے، نہ فضا میں رفتہ سرور ہے

ضیا جالندھری

○

رابطے ٹوٹ گئے، رشتے فراموش ہوئے
کیا چہکتے ہوئے کوچے تھے کہ خاموش ہوئے

آخرِ شب تری آواز کا اشراق ہُوا
عالمِ ہُو میں دو عالم ہمہ تن گوش ہوئے

لذّتِ تشنہ لبی، دل کے سلیقے کی جزا
وہ جو کم ذوق تھے، رندانِ بلانوش ہوئے

سبھی مصروفِ تماشا تھے، پہ کس نے دیکھے
دل جو افسردہ سرِ بزمِ طرب دوش ہوئے

آنکھ اُسے دیکھ کے پھر دیکھتی رہ جاتی ہے
جس کے باعث کئی خورشید سیہ پوش ہوئے

وہ عجب لمحہ تھا، اس پل کی کشش ایسی تھی
بڑھ کے ہم آپ قیامت سے ہم آغوش ہوئے

ہوش آیا تو ضیا قصۂ پارینہ لگے
وہ کہ جو باعثِ غارت گریٔ ہوش ہوئے

زہرا نگاہ

○

یہ شہر کیسے طلسمات کے نقاب میں ہے
بڑے سکون سے ہر شخص اک عذاب میں ہے

وہ محفلیں کہ خلاؤں میں جیسے برپا ہیں
وہ رتجگے ہیں کہ ہر کوئی جیسے خواب میں ہے

کوئی حساب نہیں بے حسابیوں کا، مگر
جسے بھی دیکھئے، الجھا کسی حساب میں ہے

کسی کی آہ سے دھندلائے چہرۂ مہتاب
کسی کا قطرۂ خوں چشمِ آفتاب میں ہے

یہ کس کی خاک بندھی ہے، ہوا کے آنچل میں
یہ کس کے گھر کا دھواں دامنِ سحاب میں ہے

خدائے رحم و کرم! لب پہ کیوں نہیں آتا
وہ ایک حرفِ وفا، جو دعا کے باب میں ہے

حسن عابدی

○

اب جو ملیں تو کیا ملیں، گردشِ ماہ و سال میں
وہ بھی کسی خیال میں، ہم بھی کسی خیال میں

اک شبِ تار و بے کنار، عشق کی چشمِ تر میں ہے
اور کسی دیے کی لَو قامتِ خوش جمال میں

ایک خزاں نصیبِ دل، وقتِ گریز پا کے ساتھ
ایک بہار منتظر حسن کے خد و خال میں

جمع کچھ اس طرح ہوئے لوگ، بکھر بکھر گئے
رقص کے نیم دائرے، ٹوٹ گئے دھمال میں

عشرہ گردوں کی خیر ہو، اک شبِ ماہ کے عوض
ایک نئی صدی کے خواب رکھ لیے یرغمال میں

کنجِ قفس نہ آشیاں، ہم ہوئے ایسے بے نشاں
بس پر و بال رہ گئے، موجِ صبا کے جال میں

○

دانہ دانہ جیسے تنکوں کی طرح چُنتے ہیں
رزق کی مار ہے، ہم ایک قفس بُنتے ہیں

کھُل ہی جاتے ہیں سبھی جنبشِ لب کے معنی
لوگ اب شہر میں آواز کہاں سُنتے ہیں

ایک چہرہ لئے پھرتا ہے سرِ دشتِ خیال
اک تبسم جسے پھولوں کی طرح چُنتے ہیں

نہ وہ جادہ، نہ وہ منزل، نہ وہ رہبر، پھر بھی
کان اب تک وہی آوازِ جرس سنتے ہیں

اب یہی ہم نفسو! معجزۂ فن ٹھہرا
اپنے ہی نالۂ بے سوز پہ سر دُھنتے ہیں

بیدل حیدری

○

موسم میں جان تھی نہ گلوں پر نکھار تھا
جشنِ بہار اب کے خلافِ بہار تھا

پیہم جب اضطراب سے سینہ دوچار تھا
میں زندگی کی تازہ صفوں میں شمار تھا

یہ باغباں کے فیض سے پہلے کی بات ہے
ہر شاخ کے گلے میں گلابوں کا ہار تھا

حالات کے لحاظ سے ویران تھا مگر
زخموں کے اعتبار سے دل، لالہ زار تھا

سرگوشیاں رہی ہیں ستاروں میں رات بھر
بیدل یہ کون چاند کے رتھ میں سوار تھا

○

یادش بخیر، جب میں ترا غم اسیر تھا
جو اشک ٹوٹتا تھا، لہو کی لکیر تھا

مجھ سے چلے ہیں خون چھڑکنے کے سلسلے
میں دشت میں بہار کا پہلا سفیر تھا

وہ رو پڑا خراب و حزیں دیکھ کر مجھے
میں ہنس پڑا کہ دورِ ستم کا اخیر تھا

میں صبح کی ہوا سے مہکتا نہ کس لئے
بیدل مرا خمیر گلوں کا خمیر تھا

آفتاب اقبال شمیم

○

پلا کے مست کرو، مست کر کے ڈھیر کرو
اِسی طریق سے اِس رات کو سویر کرو

کمالِ کارِ سیاست اِسی کو کہتے ہیں
خبر وہی رہے، لفظوں میں ہیر پھیر کرو

جریدۂ فنِ شہزادگی میں لکھا ہے
کہ اسپِ چوب سے تیغ و سناں کو زیر کرو

جنم جنم سے میں آ آ کے ہار ہار گیا
پتہ نہیں کہ تم آنے میں کتنی دیر کرو

تمھارا جبر وہی اور اپنا صبر وہی
سہار لیں گے، بڑے شوق سے اندھیر کرو

یہ خلق یورشِ زر سے نہ ہار جائے کہیں
اِسے بصیرتیں بخشو، اسے دلیر کرو

○

نے ستائش نہ داد مانگتا ہوں
بس توجہ زیاد مانگتا ہوں

کتنا سادہ ہوں، پیرِ دنیا سے
طفل کا اِعتماد مانگتا ہوں

حرف ڈھونڈوں الف سے پہلے کا
فکر و فن طبع زاد مانگتا ہوں

پیکرِ خاک ہوں نمو کے لیے
آتش و آب و باد مانگتا ہوں

اتنی آئیں کہ رات دن سی لگے
دل میں ایسا فساد مانگتا ہوں

سنگ کر دے نہ دیدِ گم شدگاں!
اپنے نسیاں سے یاد مانگتا ہوں

ظفر اقبال

○

شور شرابے کی بہتات زیادہ ہے
فرصت سے اتنی سی بات زیادہ ہے

چاروں سمت چھلکتا رہتا ہوں ہر دم
کائنات سے میری ذات زیادہ ہے

سوچتا رہتا ہوں، لوگوں اور لفظوں میں
میرا رشتہ کس کے ساتھ زیادہ ہے

رنج بہت معمولی لگتا ہے، لیکن
ہوتا یہ اکثر اوقات زیادہ ہے

چلتا رہتا ہے باہر تو جھکڑ سا
اندر ہی اندر برسات زیادہ ہے

ایک مسافت ایسی ہے مجھ کو درپیش
جس میں دن تھوڑا ہے، رات زیادہ ہے

ذاتی سا جھگڑا ہے میرا اور دل کا
اور اس میں بھی اُس کا ہاتھ زیادہ ہے

میٹھی بات بھی کافی ہوتی ہے اکثر
اتنا بھی بھوکے کو بھات زیادہ ہے

ایک اکیلی سے تو نمٹ سکتا ہوں، ظفر
آفت سے پھر بھی آفات زیادہ ہے

○

کچھ اُن سے شکایت ہی نہیں ہے مجھ کو
سچ ہے کہ محبت ہی نہیں ہے مجھ کو

کیا کام نکالوں گا خوشامد سے یہاں
حاصل یہ مہارت ہی نہیں ہے مجھ کو

کچھ اور مسائل بھی ہوئے ہیں ظاہر
خالی کوئی وحشت ہی نہیں ہے مجھ کو

کرتے ہیں مہیا مجھے دن رات وہی
جس شے کی ضرورت ہی نہیں ہے مجھ کو

ہے قابلِ افسوس بھی اُس کا یہ سلوک
اُس بات پہ حیرت ہی نہیں ہے مجھ کو

ہے کس لیے اب اتنی توجہ مجھ پر
اب تو کوئی حسرت ہی نہیں ہے مجھ کو

کیوں خوش نہ پھروں صورتِ حالات سے میں
ادراکِ حقیقت ہی نہیں ہے مجھ کو

یہ جھوٹ بھی اچھا تو نہیں ہے، لیکن
سچ کہنے کی عادت ہی نہیں ہے مجھ کو

مجبور ہوں، لکھتا ہوں زیادہ، کہ ظفر
کم لکھنے کی فرصت ہی نہیں ہے مجھ کو

افتخار عارف

ہم نہ ہوئے تو کوئی افق مہتاب نہیں دیکھے گا
ایسی نیند اڑے گی، پھر کوئی خواب نہیں دیکھے گا

نرمی اور مٹھاس میں ڈوبا ہی مہذب لہجہ
تلخ ہوا تو محفل کے آداب نہیں دیکھے گا

پیش لفظ سے اختتام تک پڑھنے والا قاری
جس میں ہم تحریر ہیں بس وہی باب نہیں دیکھے گا

لہو رلاتے، خاک اڑاتے موسم کی سفاکی
دیکھتے ہیں، کب تک یہ شہر گلاب نہیں دیکھے گا

بپھرے ہوئے دریا کو ہوا کا ایک اشارہ کافی
کوئی گھر، کوئی بھی گھر سیلاب نہیں دیکھے گا

بے معنی، بے مصرف عمر کی آخری شام کا آنسو
ایک سبب دیکھے گا، سب اسباب نہیں دیکھے گا

اک ہجرت اور ایک مسلسل دربدری کا قصہ
سب تعبیریں دیکھیں گے کوئی خواب نہیں دیکھے گا

○

آسمانوں پر نظر کر، انجم و مہتاب دیکھ
صبح کی بنیاد رکھنی ہے تو پہلے خواب دیکھ

دوش پر ترکش پڑا رہنے دے، پہلے دل سنبھال
دل سنبھل جائے تو سوئے سینۂ احباب دیکھ

ہم بھی سوچیں گے دعائے بے اثر کے باب میں
اک نظر تو بھی تضادِ منبر و محراب دیکھ

موجۂ سرکش کناروں سے چھلک جائے تو پھر
کیسی کیسی بستیاں آتی ہیں زیرِ آب، دیکھ

بوند میں سارا سمندر، آنکھ میں کُل کائنات
ایک مشتِ خاک میں سورج کی آب و تاب دیکھ

افتخار عارف کے تند و تیز لہجے پر نہ جا
افتخار عارف کی آنکھوں میں الجھتے خواب دیکھ

جون ایلیا

○

میں نہ ٹھیروں، نہ جان! تو ٹھیرے
کون لمحوں کے روبرو ٹھیرے

نہ گذرنے پہ زندگی گذری
نہ ٹھہرنے پہ چار سو ٹھیرے

ہے مری بزم بیدلی بھی عجب
دلِ پُرخوں جہاں سبو ٹھیرے

ایک چاکِ برہنگی ہے وجود
پیرہن ہو تو بے رفو ٹھیرے

میں یہاں مدتوں میں آیا ہوں
ایک ہنگامہ کو بہ کو ٹھیرے

○

شہر بہ شہر کر سفر، زادِ سفر لیے بغیر
کوئی اثر کیے بغیر، کوئی اثر لیے بغیر

کچھ بھی ہو، قتل گاہ میں حسنِ بدن کا ہے ضرر
میں نہ وہاں سے آؤں گا، دوش پہ سر لیے بغیر

قریۂ گریہ میں مرا گریۂ ہُنر ورانہ ہے
یاں سے نہیں ٹلوں گا میں دادِ ہُنر لیے بغیر

اسکے بھی کچھ گلے ہیں دل! اُنکا حساب تم رکھو
دید نے اُس میں کی بسر اس کی خبر لیے بغیر

اسکا سخن بھی چاہیے اور وہ یہ کہ جونؔ تم
شہرۂ شہر ہو تو کیا، شہر میں گھر لیے بغیر

انور شعور

○

نہ روکے کوئی رہگذر میں مجھے
مزا آرہا ہے سفر میں مجھے

یہ عُمر، اور جینا بھی مرنا بھی ہے
اسی مدتِ مختصر میں مجھے

مری اُنگلیوں پر ہیں سیّارگاں
رکھو لحظہ لحظہ نظر میں مجھے

یہ خستہ لفافے، یہ تیرے خطوط
نوادر ملے ہیں کھنڈر میں مجھے

نہ جانے لگیں اور کتنی شبیں
ابھی اہتمامِ سحر میں مجھے

جو دیکھا تو کوئی بشر دُوسرا
دکھائی دیا ہر بشر میں مجھے

تمھیں خط میں کیا اپنی حالت لکھوں
پڑھو گے کسی دن خبر میں مجھے

اکابر کو دیکھا تو ایک انکسار
ملا اکثر و بیشتر میں مجھے

کہیں تو ملے چھاؤں یا چھت شعورؔ
بیابان میں یا نگر میں مجھے

○

کون سا خوب رُو نہیں ملتا
نہیں ملتا تو تُو نہیں ملتا

اتفاقاً کہیں وہ ملتا ہے
سو بھی بے جستجو نہیں ملتا

اس طرح آدمی کو حق اپنا
اے مرے نرم خُو! نہیں ملتا

وہ مئے آتشیں نہیں ملتی
وہ لبِ مُشک بُو نہیں ملتا

کوئی اس عالمِ تغیّر میں
عمر بھر ہُو بہُو نہیں ملتا

وہ تو ملتا ہے صبح و شام مگر
موقعِ گفتگو نہیں ملتا

اب کسی آنکھ کے صدف میں شعورؔ
گوہرِ آبرو نہیں ملتا

مرتضیٰ برلاس

○

کیا عشق شریعت والوں کا بہ طرزِ عمل، کم اچھا ہے
ہر در پہ، سوائے اک در کے، کرتے نہیں سر خم اچھا ہے

آنکھوں میں ہے سُرخی، زخم ہرے اور زرد ہے رنگت چہروں کی
اس بار عجب نیرنگی ہے، اس سال تو موسم اچھا ہے

ہنگامۂ بزمِ یاراں سے بہتر ہے یہ کنجِ تنہائی
جو یاد تری تازہ رکھے، خوشیوں سے تو وہ غم اچھا ہے

جب زخم ذرا بھرنے سا لگے تو زہر بجھا نشتر رکھ دے
ہے خوب یہ تیری چارہ گری، یہ زخم کا مرہم اچھا ہے

جو خویش پرستی سے آگے، کچھ دیکھ سکے، کچھ سوچ سکے
وہ شخص اگرچہ غیر بھی ہو، اپنوں سے وہ تاہم اچھا ہے

کس کام کے وہ دریا جن میں گرداب پلیں، سیلاب بسیں
جو خشک لبوں کو تر کر دے، وہ قطرۂ شبنم اچھا ہے

سینوں سے گھٹائیں اٹھتی ہیں آنکھوں سے جھڑی لگ جاتی ہے
پردیس میں یہ خوش خبری دو، اب دیس کا موسم اچھا ہے

○

اب تو وہ شخص بھی تیرے لیے انجانا ہے
جس کی نسبت سے تجھے شہر نے پہچانا ہے

ایک وہ بات جو ہونٹوں پہ نہ آئی ہے کبھی
عمر بھر ہم کو اسی بات پہ پچھتانا ہے

آج اٹکھیلیاں کرتی ہے جو موجِ ساحل
کل اسی نے تجھے منجدھار میں لے آنا ہے

حکم ہے اُس کا کہ ناخن مرے کھینچے جائیں
کوئی گتھی مجھے شاید ابھی سلجھانا ہے

اب تو دوری ہے مگر پہلے بھی قربت کب تھی
وہ بھی دن بیت گیا یہ بھی گذر جانا ہے

مختصر اتنی ہے رودادِ شگفتِ گل کی
شاخ پر کھلنا ہے گلدان میں سج جانا ہے

ماجد صدیقی

O

سر پہ کیا کیا بوجھ روز افزوں نظر آنے لگے
عمر ڈھل جانے لگی اور قرض بڑھ جانے لگے

بحر میں حالات کے، بے رحم موجیں دیکھ کر
اژدہے کچھ اور ہی آنکھوں میں لہرانے لگے

مہر کے ڈھلنے، نکلنے پر کڑکتی دھوپ سے
گرد کے جھونکے، ہمیں کیا کیا نہ سہلانے لگے

وحشتِ انساں کبھی خبروں میں یوں غالب نہ تھی
لفظ جو بھی کان تک پہنچے وہ دہلانے لگے

چھو کے وسطِ عمر کو، ہم بھی شروعِ عمر کے
اب وعدہ جینے عجب قصّے ہی دہرانے لگے

O

اک اک قدم پہ ہے نئی افتادہ، کیا کہیں
واماندگی ہے ورثۂ اجداد، کیا کہیں

صحرا میں جیسے کوئی بگولا ہو بے مہار
ہم آپ ہیں کچھ ایسے ہی آزاد، کیا کہیں

ہم مطمئن ہیں جس طرح اینٹوں کو جوڑ کر
یوں بھی کبھی ہوئے نگر آباد، کیا کہیں

باتوں سے تولتے ہیں جو پھولوں کی پتیاں
حق میں ہمارے فن کے وہ نقاد، کیا کہیں

ہم جنس، اوجِ تخت سے لگتے ہیں کیوں حقیر
ماجد یہ ہم کہ جو نہیں شہ زاد، کیا کہیں

محسن احسان

○

صدفِ چشم میں نظر بے خواب
دستِ شب میں گلِ سحر بے خواب

سب پلکیں محوِ خواب ہیں لیکن
ہے فقط اک چراغ در بے خواب

میری طیب زمین پوچھتی ہے
کیوں ہیں میرے شجر حجر بے خواب

کٹ رہے ہیں کچھ اس طرح شب و روز
شام بے ذائقہ، سحر بے خواب

دارِ فانی کا ہے ازل سے یہ کھیل
خیر خوابیدہ اور شر بے خواب

معبدوں مقبروں کے منگی لوگ
کتنے بے ذوق، بے خبر بے خواب

زرد چہروں پہ قہقہے مجروح
شہر بیمار، چارہ گر بے خواب

جہل باوضع، بااثر باہوش
علم بے نور، بے وقر، بے خواب

جنگلوں کی ہوا کو دو یہ نوید
راکھ کی تہہ میں ہے شرر بے خواب

کوئی طوفان آنے والا ہے
شہر کے ہیں تمام گھر بے خواب

سرِ دریا بھنور بے چین
تہہِ دریا گہر گہر بے خواب

پابہ زنجیر مست و شوخ ہوا
باغ بے برگ، بے ثمر، بے خواب

ہو کلہ سر پہ تو پھر اہلِ کلاہ
رہنا پڑتا ہے عمر بھر بے خواب

بجلیاں بادلوں میں نوحہ کناں
نقش کوزہ میں کوزہ گر بے خواب

کہکشاں پر ہیں آدمی کے قدم
ہے ستاروں کی رہگذر بے خواب

جاگتی آنکھ میں ہے خواب کا حسن
خواب کے حسن کو نہ کر بے خواب

زیرِ دیوار کوئی چشم براہ
اور کوئی بامِ قصر پر بے خواب

جس گلی کے ہیں لوگ سوئے ہوئے
اس گلی میں ہیں بام و در بے خواب

بوند سا دن عذاب میں گذرا
خواب آمادہ چشمِ تر بے خواب

پلکیں دستِ دعا اٹھائے ہوئے
کہہ رہی ہیں، ہمیں نہ کر بے خواب

سب کی آنکھوں کے خواب گروی ہیں
محسن آنکھیں رہیں مگر بے خواب

ارشد ملتانی

○

جبرِ وقت نے گرچہ دشمنی کی ٹھانی ہے
رہنما ہمارا بھی عزم کامرانی ہے

زیست کی کہانی بھی اک عجب کہانی ہے
لفظ لفظ میں جس کے قلزم معانی ہے

اک طرف شناور کا عزم غیر فانی ہے
اک طرف سمندر کو نازِ بیکرانی ہے

تنگ ہوتی جاتی ہیں وسعتیں جہانوں کی
حکمراں زمانے پر آگہی کی رانی ہے

اک توازنِ طبعی حسنِ آدمیت ہے
زندگی حقیقت میں آگ ہے نہ پانی ہے

ہم بچھڑ نہیں سکتے زندگی کے میلے میں
ہے وہی نشاں میرا، جو تری نشانی ہے

فرش پر بسیرا ہے، عرش ہے نگاہوں میں
ہم زمین زادوں کی فکر آسمانی ہے

جو ازل سے روشن ہیں وقت کے صحیفوں پر
اک مرا فسانہ ہے، اک تری کہانی ہے

شوخ و شنگ ندی میں ضو فشاں بدن تیرا
انگ انگ مستی ہے، رنگ رنگ پانی ہے

پیرِ میکدہ سے بھی ہے قدیم یارانہ
شیخ جی سے بھی اپنی دوستی پرانی ہے

علم و دانش و حکمت سب درست ہیں لیکن
کون اپنی سنتا ہے، کس کی ہم نے مانی ہے

روز اک تجلی سے ہم کلام کرتے ہیں
طور کی کہانی تو دور کی کہانی ہے

قیس و کوہکن تک ہی تجربے نہیں محدود
اپنے اپنے صحرا کی سب نے خاک چھانی ہے

سولیوں پہ لہرانا، خنجروں سے کٹ جانا
عشق کے قبیلے کی رسم یہ پرانی ہے

ہو گئی شکست ارشد تیرگی کے لشکر کو
سورجوں کے نرغے میں شب کی راجدھانی ہے

محمود شام

○

ترمیم ہو رہی ہے مقدر میں ان دنوں
برپا ہے ایک حشر جہاں بھر میں ان دنوں

تاریخ لکھ رہے ہیں نئے زاویے سے لوگ
قومیں ہیں آگہی کے سمندر میں ان دنوں

اک نسل لے رہی ہے گزشتہ کا سب حساب
تبدیلیوں کی لہر ہے گھر گھر میں ان دنوں

یارب! ہو خیر شہر کی، جانے ہو کیا فریب
اک شرم سی ہے چشمِ ستمگر میں ان دنوں

ذہنوں سے گرد جھاڑ کے بے کس نکل پڑے
ہے کھلبلی مچی ہوئی لشکر میں ان دنوں

اپنے مشاہدے میں ہے مصروف کائنات
لگتی نہیں زمین بھی محور میں ان دنوں

ہر قوم ٹوٹنے کے کٹھن مرحلے میں ہے
شدت پہ انتشار ہے عنصر میں ان دنوں

پھر سے نہ کیوں سنبھال لیں لمحوں کی باگ شام
سودا سما رہا ہے عجب سر میں ان دنوں

○

عجب چلن پہ ہمیں زندگی نے ڈال دیا
خیالِ ہم نفساں دل سے ہی نکال دیا

میں آدمی تو تلاطم مزاج تھا لیکن
سمندروں نے مجھے شہر میں اچھال دیا

خدا نے فکر تو بخشی ہے ماورائے ابد
مگر وجود گرفتارِ ماہ و سال دیا

کسی نے ایک ہی قطرے میں عمر بھر جھانکا
کسی نے پل میں سمندر یہاں کھنگال دیا

امیرِ شہر کی مصروفیت! خدا کی پناہ
کہ اصل فرض ہمیشہ ہی کل پہ ٹال دیا

کیا جنوب کو محرومیوں سے مالامال
تمام حسن و سکوں جانبِ شمال دیا

حلیم قریشی

○

(کراچی کی نذر)

تجھے آواز دینے کیلئے اب تو اجازت کی ضرورت ہے
محبت میں جہاں بھی عقل در آئے تو وحشت کی ضرورت ہے

ابھی اک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے کا موسم ہے
ہمارے جرم جو ہم کو دکھائے اس قیامت کی ضرورت ہے

غریب شہر کا جلتا ہوا گھر دیکھ کر ہم رقص کرتے ہیں
ہماری سوچ کتنی پست ہے اس پر ندامت کی ضرورت ہے

بڑے نادان ہیں کوئی ہمارے دشمنوں کو یہ تو سمجھائے
ہمیں گر مارنا چاہیں تو تھوڑی سی محبت کی ضرورت ہے

کچھ ایسے ہیں جو دل کے درد کو کاغذ پہ لکھ کر بھول جاتے ہیں
کچھ ایسے بھی جنھیں اس درد سے دنیا میں شہرت کی ضرورت ہے

حلیم اب شہر نے تنہائیوں سے محفلیں کرنے کی ٹھانی ہے
امیر شہر سے اس سلسلے میں اب شکایت کی ضرورت ہے

○

روشن دن کی لاش اٹھائے اُتر رہے ہیں
شام نہیں پہنچی اور سائے اُتر رہے ہیں

جھونپڑیاں تو کب کی ڈوب چکیں پانی میں
بادل کس کی گھات لگائے اُتر رہے ہیں

کوہِ انا کی چوٹی پر مسکن تھا جن کا
جانے کیوں چہروں کو چھپائے اُتر رہے ہیں

آنے والے! ایک چراغ بھی لیتے آنا
شام نہیں پہنچی اور سائے اُتر رہے ہیں

صفدر سلیم سیال

○

یوں دیکھنے کو تو قامت کشیدہ رکھتے ہیں
کسے خبر ہے کہ ہم دل دریدہ رکھتے ہیں
ہمارے ساتھ اٹھائیں وہ لطفِ دربدری
جو ایک عمر سے روحیں کبیدہ رکھتے ہیں
سگانِ شہرِ شقاوت کو رائیگاں نہ کریں
کہ ہم تو جسم ہی مردم گزیدہ رکھتے ہیں
صدا نہ دے ہمیں اُس پار سے، غمِ دوراں!
تجھے خبر ہے کہ بازو بُریدہ رکھتے ہیں
کچھ احتیاط کرو ایسے بد ارادوں سے
جو دل میں قہر، لبوں پر قصیدہ رکھتے ہیں
کسی بھی حال میں حد سے کبھی نہیں گزرے
اسی لئے تو دلِ نودمیدہ رکھتے ہیں
یہ کیسے لوگ ہیں، کرتے ہیں پیار بھی ہم سے
تعلقات بھی ہم سے کشیدہ رکھتے ہیں
تمہارا حق ہے، سنبھل کر مگر بیان کرو
کہ اور لوگ بھی اپنا عقیدہ رکھتے ہیں
نہ جانے کب کوئی پیاسا پلٹ پڑے یونہی
ہم اپنی آنکھیں سدا آبدیدہ رکھتے ہیں
تمام شہر سے ہے اپنی رسم و راہ سلیم
تعلقات مگر چیدہ چیدہ رکھتے ہیں

○

زمانے میں اُسے میری پذیرائی کا دُکھ ہے
مجھے اس جمگھٹے میں اپنی تنہائی کا دکھ ہے
مراسم کا نبھانا کیا کہیں، کتنا کٹھن ہے
نہ جانے کتنے لوگوں کو شناسائی کا دکھ ہے
پریشاں ہیں بہت سے لوگ دانائی کے باعث
مجھے بھی اپنی اس بدبخت دانائی کا دکھ ہے
سُنا ہے وہ بھی اپنے فیصلے پر ہے پشیماں
اُسے بھی میری اِس بے درد تنہائی کا دکھ ہے
نہ جانے بے ضرورت کیوں بدلتا جا رہا ہے
مجھے اُس بے وفا، بے عقل ہرجائی کا دکھ ہے
کسی سے بھی کسی دکھ کا مداوا ہو نہ پایا
یہاں تو ہر مسیحا کو مسیحائی کا دکھ ہے
جو ہونا تھا ہُوا، اُس کی تلافی غیر ممکن
بچھڑ کر بھی ہمیں تو اُس کی رسوائی کا دُکھ ہے

شفیق سلیمی

○

اِک پرندہ پورا دن گاتا رہا دیوار پر
اور پھر ہم نے دیا اِک رکھ دیا دیوار پر

لفظ گونگے ہی سہی پر آنکھ تو اندھی نہیں
نقش کر دیں گے انھیں ہم جا بجا دیوار پر

آج کا دن بھی ہماری جان کا دشمن ہُوا
آج کا سُورج بھی، دیکھو آ چڑھا دیوار پر

جس کی بنیادوں میں پانی مر رہا تھا دیر سے
آ گری ہم پر تو پھر کیسا گِلہ دیوار پر

ہر کوئی حیرت میں گُم ہے شکل اپنی دیکھ کر
کون ہے جس نے لگایا آئنہ دیوار پر

○

کبھی منزل کبھی رستہ کوئی کیسے بدلتا ہے
ہمیں معلوم ہی کب تھا کوئی کیسے بدلتا ہے

ہمارے درد کی اوقات ہی کیا ہے زمانے میں
کسی کے ہاتھ کا لکھا کوئی کیسے بدلتا ہے

کہانی کے سبھی کردار ہوں جب موم کے پُتلے
کوئی کیسے بدل دے گا، کوئی کیسے بدلتا ہے

خس و خاشاک کی صورت جو لے جائیں اُڑائیں بھی
بھلا رُخ اُن ہواؤں کا کوئی کیسے بدلتا ہے

یقیں سے بے یقینی کے سفر تک ساتھ تھا میرے
بدل کر اُس نے دکھلایا، کوئی کیسے بدلتا ہے

(ابوظبی)

روحی کنجاہی

○

زندگی پر ایک گہرا طنز کر جاتے ہیں لوگ
موت برحق ہے مگر بے موت مر جاتے ہیں لوگ

کیسی کیسی فرقتیں کرتی ہے پیدا بادِ تند
خشک پتوں کی طرح کیسے بکھر جاتے ہیں لوگ

ہائے رے بیچارگی اور بے بسی انسان کی
نوجوانی میں بھی جاں سے پیارے مر جاتے ہیں لوگ

جاتے جاتے ساتھ لے جاتے ہیں سب صبر و قرار
کتنی ہشیاری سے اپنا کام کر جاتے ہیں لوگ

تجھ سے ملنے کو چلے آتے ہیں کتنے شوق سے
تیری محفل سے مگر با چشمِ تر جاتے ہیں لوگ

کچھ خبر ہونے نہیں دیتے کسی کو کانوں کان
ایک نشتر کی طرح دل میں اتر جاتے ہیں لوگ

یاد رکھتے ہیں ہمیشہ دوسروں کی بات بات
اپنی ہر اک بات سے یکسر مکر جاتے ہیں لوگ

کتنے ظالم ہیں کہ تھوڑی سی سہولت کے لیے
دوسروں کی زندگی میں زہر بھر جاتے ہیں لوگ

ہاتھ کوئی روکنے والا نہ آ پہنچے اگر
ظلم کرتے وقت ہر حد سے گزر جاتے ہیں لوگ

ہم تو کشتی میں بھی کر پائے نہ اک ندی عبور
ایک تنکے پر سمندر پار کر جاتے ہیں لوگ

حادثاتِ زیست کی شدت کا اندازہ کریں
ذہن و دل سے آج ملتے ہی اُتر جاتے ہیں لوگ

اور بھی ہوتے ہیں جائے حادثہ پر حادثے
اک تماشا دیکھنے کو بھی ٹھہر جاتے ہیں لوگ

مجرموں کی پُشت پر ہوتے ہیں کیسے کیسے ہاتھ
اور معصوموں پہ ہر الزام دھر جاتے ہیں لوگ

کچھ نہیں کھُلتا کسی پر کیا ہے رُوحی زندگی
بے خبر آتے ہیں لوگ اور بے خبر جاتے ہیں لوگ

صبیحہ خاتون صبا

○

(رفیق حیات کی رحلت پر)

سر جھکائے ہوئے بالیں پہ ہے کب سے کوئی ہاں مگر نیند کے ڈھونڈے ہے بہانے کوئی
بعد مدت کے ہُوا ہے کوئی آسودۂ خواب حسنِ سیماب کو دم بھر نہ جگائے کوئی
گریۂ آتشی و بلقیس و سلیمان و صبا سُن بھی پائے تو کہاں جاگ ہی پائے کوئی
لالۂ و گل سے کہو، چاک رکھیں پیراہن چشمِ نرگس کو بھی رونے سے نہ روکے کوئی
یہ بھی ممکن ہے یہ فریاد و فغاں کام آجائے پردۂ خواب سے آجائے نکل کے کوئی
"نہ بزاری، نہ بزورے، نہ بزر می آید" یہ جو ہے مُہر بہ لب سادہ قبائے کوئی
تازہ و تر ہیں ابھی عارضِ رنگیں کے گلاب اور کچھ دیر یہ چہرہ نہ چھپائے کوئی
ٹھہرو، ٹھہرو! کہ یہ تعجیلِ وداعی کیسی دیکھو، دیکھو! ہے ابھی دور سے آئے کوئی
ہمنشیں، دوست، رفیقِ غمِ دوراں، ہمدم جائے جائے کہ منا کر اُسے لائے کوئی
اِک خلا ہے کہ مقدّر مرے افکار کا ہے اب کسے ان کہے اشعار سُنائے کوئی
وہ محبت بھری تادیب، وہ نکتہ سنجی ایسا باذوق، سخن فہم تو ڈھونڈے کوئی
بذلہ سنجی سے لطافت بھرے اسلوب کے ساتھ کر گیا گردشِ حالات کے شکوے کوئی
پیکرِ صبر و تشکر مرا ایوب مثال اس طرح نازِ مرض کے تو اُٹھائے کوئی
ایسا پاکیزہ و معصوم و سراپا اخلاص اب جو ڈھونڈے بھی تو کیا ڈھونڈ ہی پائے کوئی

ہم سے بے مایۂ آدابِ رفاقت کو صبا
درد سہنے کی ہی تہذیب سکھا دے کوئی

(نیویارک)

خلیق احمد خلیق

○

وصل میں ہے نہ کسی ساعتِ دیدار میں ہے
جو تشفّی کسی سچائی کے اظہار میں ہے
ہے یہ لمحہ ترے اخلاص کا لمحہ شاید
اک حلاوت سی تری تلخیٔ گفتار میں ہے
دل و دیدہ میں ہر اک بات پہ ٹھن جاتی ہے
ہر گھڑی جان مری عالمِ پیکار میں ہے
سچ سناتا ہو، دکھاتا ہو حقیقی منظر
ایسا روزن، ابھی کوئی کسی دیوار میں ہے
غارتِ وقت سے بچ پائی ہے اک چیز یہی
آشتی سی، جو مرے دیدۂ بیدار میں ہے
دورِ افلاس میں رکھا ہے غنی اِس نے مجھے
بات اچھی یہی میرے دلِ پُرکار میں ہے
ایک بچے کی طرح پالنا پڑتا ہے اِسے
نکتہ یہ سب سے بڑا عشق کے اسرار میں ہے
ایک سناٹے میں لپٹا ہوا پھرتا ہوں خلیق
ایسی تنہائی کسی دشت نہ کہسار میں ہے

○

دیکھا نہ میں نے کیا کیا زمانہ عذاب کا
چسکا نہ پڑ سکا مجھے پھر بھی ثواب کا
نس نس چٹک اٹھی مرے سوکھے وجود کی
نکلا جو ایک جسم سے بھبکا شباب کا
میں زندگی کے رقصِ مسلسل میں محو ہوں
کیا ہوش مجھ کو سود و زیاں کے حساب کا
چہرے کی سلوٹوں میں فروزاں ہیں نقشِ زیست
ماتم کناں نہیں ہیں غروبِ شباب کا
بیدار ہوں تو خواب نہ دیکھوں میں کس طرح
کیونکر رہوں اسیر، جہانِ خراب کا
دریافت آبجوئے حقیقت نہ ہو سکی
پانی بنا رہا ہوں میں ریگِ سراب کا!
دیکھوں تو محتسب کی کہاں تک گرفت ہے
میں کام لے رہا ہوں صبا سے شراب کا
بدمستیوں پہ میری نہ جانا کہ میں خلیق
عریاں کیا ہوا ہوں کسی کے حجاب کا!

خاقان خاور

○

مرے وجود کو بھی سنگِ در ہی جانا ہے
رُکے بغیر اُسے بھی گزر ہی جانا ہے

کوئی ندی ہو کہ اپنے وجود کا سایہ
چلے جو ساتھ، اُسے ہم سفر ہی جانا ہے

زمین کھینچتی ہے آدمی کو اپنی طرف
پرائے دیس میں رہ کر بھی گھر ہی جانا ہے

سدا عروج کسی کو نہیں زمانے میں
چھتوں سے دُھوپ کو آخر اُتر ہی جانا ہے

جو میرے سائے میں بیٹھے تھے، مجھ کو کاٹ گئے
مسافروں نے مجھے بھی شجر ہی جانا ہے

ذرا سا تنکا ہوں، مجبور اور بے بس ہوں
جدھر اڑائیں گے جھونکے، اُدھر ہی جانا ہے

زمیں کسی کی سدا منتظر نہیں رہتی
ہر ایک شخص کو اس میں اُتر ہی جانا ہے

حیات منزلِ مقصود تو نہیں خاور
یہ رہگذر ہے، اسے رہگذر ہی جانا ہے

○

حرفِ انکار وہ نہیں، میں تھا
بر سرِ دار وہ نہیں، میں تھا

سب گرانے مجھے چلے آئے
جیسے دیوار وہ نہیں، میں تھا

پوچھ مجھ سے عذاب ظلمت کے
شب کو بیدار وہ نہیں، میں تھا

انگلیاں اس کی کٹ گئیں کیسے
محوِ دیدار وہ نہیں، میں تھا

بُن لیا جال اُس نے پل بھر میں
اب گرفتار وہ نہیں، میں تھا

حلم رستوں کا تھا اُسے خاور
دشت کے پار وہ نہیں، میں تھا

اختر ضیائی

○

دل کہ مدت سے تھا مایوس پشیمانی سے
دفعتاً جھوم اُٹھا سلسلہ جنبانی سے

یونہی بڑھتا نہ گیا بوجھ تمناؤں کا،
کام سنورے بھی تو کچھ بے سر و سامانی سے

فکرِ دنیا سے فزوں تر ہے غمِ یومِ حساب
پر فراغت بھی ملے کارِ جہاں بانی سے

ایک اک کر کے ہوئے اہلِ خرد میں مقبول
کام جو ہم نے کئے تھے کبھی نادانی سے

جان جو کھوں کا عمل معرفتِ حرف و خیال
یہ ہنر ہاتھ نہ آئے کبھی آسانی سے

جس کی اُلفت سے سدا دل کا نگر تھا شاداب
اُس کے جاتے ہی در و بام لگے فانی سے

وہ تو جذبات میں اک موجِ طرب تھی اختر
ہم سمجھ بیٹھے کرم لطف کی ارزانی سے

○

مت پوچھ خزاں کے موسم میں گُل کیسے سینہ چاک ہوئے
جو صحنِ چمن کی رونق تھے، پگ پگ بکھرے خاشاک ہوئے

بن تیرے جیون کٹ تو گیا، دل اُس محور سے ہٹ تو گیا
پر یاد ہمیشہ ساتھ رہی جب بھی آئی، غمناک ہوئے

جذبات کبھی معصوم بھی تھے، بے نام سے نامعلوم بھی تھے
حالات نے جب مجبور کیا، اُلجھے، سلجھے، بے باک ہوئے

کچھ جاہ و حشم کی خواہش میں باطن کا نور گنوا بیٹھے
کچھ غربت کی تاریکی میں پل کر روشن ادراک ہوئے

ہم راہِ وفا میں چلتے ہوئے قدموں کے نشاں تو چھوڑ گئے
وہ بھی تھے جو ہمت ہار گئے اور خاک میں مل کر خاک ہوئے

یہ پیار کا کھیل ہے اختر جی کردار کو درمیان میں رکھنا ہے
گفتار کے غازی جیت کے بھی چالاک سہی، سفاک ہوئے

سیّد عطا جالندھری

یہ کس کا غم نویدِ زندگی دینے لگا ہے
مرے اندر کا سورج روشنی دینے لگا ہے

کبھی بھیگی نہ تھیں یہ زندگی کے حادثوں پر
نہ جانے کون پلکوں کو نمی دینے لگا ہے

ادا کیسے کروں میں شکریہ اُس مہرباں کا
مرے نغموں کو جو برجستگی دینے لگا ہے

بظاہر پیار کے لہجے میں کتنی تلخیاں ہیں
مرے دل کو وُہ کیسی برہمی دینے لگا ہے

عجب کیا جو مری پرواز اب افلاک میں ہو
وہ میرے بال و پر کو تازگی دینے لگا ہے

مری فکر و نظر کو روشنی جس نے عطا کی
وہی مجھ کو شعورِ شاعری دینے لگا ہے

(برمنگھم)

رشک خلیلی

○

ہے سفر گرچہ چند لمحوں کا
میرے سر پر ہے بوجھ صدیوں کا

دیکھ آئینے کو نہ ٹھیس لگے
بھید کھل جائے گا شکستوں کا

مجھ سے روشن خیال پوچھتے ہیں
آندھیوں میں پتا چراغوں کا

فاصلہ بڑھ رہا ہے ہر لمحہ
کتنی آنکھوں سے کتنے چہروں کا

بات تو وسعتِ نظر کی ہے
عکس ذرّوں میں ہے ستاروں کا

میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو
اِک نیا سلسلہ ہے خوابوں کا

کون ہے وہ کہ جس کو آتا ہے
راستہ روکنا بگولوں کا

اب تری پیاس بجھ نہیں سکتی
رشکؔ یہ دور ہے سرابوں کا

اشفاق حسین

○

ہنگامِ شب و روز میں اُلجھا ہوا کیوں ہوں
دریا ہوں تو پھر راہ میں ٹھہرا ہوا کیوں ہوں
کیوں میری جڑیں جا کے زمیں سے نہیں ملتیں
گملوں کی طرح صحن میں رکھا ہوا کیوں ہوں
اس گھر کے مکینوں کا رویّہ بھی تو دیکھوں
تزئینِ در و بام میں کھویا ہوا کیوں ہوں
میرا بھی کوئی عکس نظر آئے کہیں پر
شیشوں کی عمارت میں سمایا ہوا کیوں ہوں
ہر شہر میں ہے ایک خوش آباد علاقہ
ہر شہر سے بیزار سا لگتا ہوا کیوں ہوں
پوچھوں بھی تو میں اپنے سوا کس سے یہ پوچھوں
تنہا جو نہیں ہوں تو اکیلا ہوا کیوں ہوں
گرتی نہیں کیوں مجھ پہ کسی زخم کی شبنم
میں قافلۂ درد سے بچھڑا ہوا کیوں ہوں
آنکھوں پہ جو اُترا نہ ہُوا دل پہ جو تحریر
اُس خواب کی تعبیر سے سہما ہوا کیوں ہوں
دن بھر کے جھمیلوں سے بچا لایا تھا خود کو
شام آتے ہی اشفاق میں ٹوٹا ہوا کیوں ہوں

○

دل اک نئی دنیا سے معانی سے ملا ہے
یہ پھل بھی ہمیں نقلِ مکانی سے ملا ہے
جو نام کبھی نقش تھا دل پر، وہ نہیں یاد
اب اس کا پتہ یاد دہانی سے ملا ہے
یہ درد کی دہلیز پہ سر پھوڑتی دنیا
اس کا بھی سرا میری کہانی سے ملا ہے
کھوئے ہوئے لوگوں کا سراغ اہلِ سفر کو
جلتے ہوئے خیموں کی نشانی سے ملا ہے
خاطر میں کسی کو بھی نہ لانے کا یہ انداز
بپھری ہوئی موجوں کی روانی سے ملا ہے
لفظوں میں ہر اک رنج سمونے کا قرینہ
اس آنکھ میں ٹھہرے ہوئے پانی سے ملا ہے
اشفاق اسے ہم ہی سمجھتے ہیں کہ ہم کو
کیا سلسلۂ شب کی گرانی سے ملا ہے

عبداللہ جاوید

○

حرفِ غلط نہ تھا، مجھے سمجھا گیا غلط
لکھا گیا غلط، کبھی بولا گیا غلط

میں بھی غلط نہ تھا، مری باتیں غلط نہ تھیں
مجھ کو، مرے کلام کو جانچا گیا غلط

مجھ میں نہیں تھے عیب، کسوٹی میں عیب تھے
میرا یہ ہے قصور کہ پرکھا گیا غلط

گو مرتبے میں ہیچ ہوں لیکن غلط نہیں
سقراط کی طرح مجھے مارا گیا غلط

افراد ہیں غلط کہ غلط ہیں تصورات
یا، اس معاشرے ہی کو ڈھالا گیا غلط

مُجرم کو اپنے جرم کا احساس تک نہیں
افسوس کر رہا ہے کہ پکڑا گیا غلط

میزانِ عدل ٹھیک ہے، پلڑے درست ہیں
یہ کون دیکھتا ہے کہ تولا گیا غلط

ڈالی پہ تھا تو کون سا محفوظ داماں میں تھا
پھر بھی گلہ ہے پھول کو، توڑا گیا غلط

آدم کو ہے بہشت سے اخراج کا ملال
ابلیس کہہ رہا ہے، نکالا گیا غلط

طوفاں کے بعد اہلِ تدبر کو فکر ہے
ساحل کا تھا قصور کہ دریا گیا غلط

اکثر وہ لوگ زندۂ جاوید ہو گئے
تاریخِ عصر میں جنہیں لکھا گیا غلط

○

آئینہ شخص ہوں، ڈرنا مجھ سے
نہیں ممکن کوئی پردا مجھ سے

جھوٹ پہنے ہو تو عریاں ہو گے
حال ایسا ہو تو بچنا مجھ سے

شرم رکھ لی، نہیں ٹوکا میں نے
لوگ کرتے رہے دھوکا مجھ سے

بخششیں کیں بھی تو، چھینا کیا کیا
عمرِ رفتہ ذرا فرما مجھ سے

پھول سے شاخ نے سرگوشی کی
بوجھ اُٹھتا نہیں تیرا مجھ سے

عکس سے آئینہ کرتا ہے سوال
کوئی ہے بھی ترا ناتا مجھ سے

میرا ظاہر تو ہے، دنیا، تیرا
میرا باطن نہیں لینا مجھ سے

میں ہوں جاوید یہ مرضی رب کی
موت برحق ہے نہ کہنا مجھ سے

کاوش بٹ

○

ہر اک شے کی فراوانی ریاکاروں کے گھر میں ہے
مگر آسودگی دل کی وفاداروں کے گھر میں ہے

تری اُلفت کو سینوں میں بسا کر محترم ٹھہرے
اثاثہ زندگی بھر کا عزاداروں کے گھر میں ہے

صداقت، آبرو، پندارِ الفت اور وفاداری
یہی سامان تیرے درد کے ماروں کے گھر میں ہے

میسر ہے کہاں ہر شخص کو تسکین کی دولت
مجھے یہ فخر، مجھ میں اور مرے یاروں کے گھر میں ہے

تُو زرداروں کا حامی ہے تمے زردار حامی ہیں
یہ چرچا ان دنوں کتنے قلمکاروں کے گھر میں ہے

یعقوب تصوّر

○

کیسے کیسے صدمے جھیلے بال اور پر کے آتے آتے
سبز رُتیں معدوم ہوئیں پروازِ ہنر کے آتے آتے

پتھر اپنے تن پر اوڑھے چُورا چُورا جسم سمیٹا
ملکِ استبداد سے چل کر اس نگر کے آتے آتے

تشنہ لبوں تک پانی کی ترسیل کے سارے وعدے ٹوٹے
اس نے شانے تک کٹوائے چھاگل بھر کے آتے آتے

رُخ بدلا ناؤ کا اور نہ پانی ہی میں کود سکا وہ
اک تدبیر بھی کام نہ آئی پاس بھنور کے آتے آتے

خاک سنہرے خواب تصوّر کیا حُسنِ تخئیل کہ دل جب
محرومِ احساس ہوا تعبیر گہر کے آتے آتے

(ابوظبی)

سلیم کوثر

○

چاہتا ہے شادابی مجھ میں شخص کوئی ویرانے جیسا
ہے کوئی لہر سمندر جیسی، بادل رنگ جمانے جیسا

جیون گھاٹ سے تن من موسم ابھی نہا کر نکلا ہوں میں
پھر کوئی یاد بھلانے جیسی، پھر کوئی روگ لگانے جیسا

جب تک اُس کے پنکھ بکھیر و گلشن جاں میں لہراتے ہیں
کر کوئی بات نہ کرنے جیسی، یا کوئی بھید بتانے جیسا

ایک مسافت کے دھوکے میں چاروں اور سفر میں میرے
راہ کوئی مل جائے جیسی، رستہ گم ہو جانے جیسا

ہجر و وصال تو جسم و رُوح کے صحرا کا منظر نامہ ہے
آہٹ سی تیرے آنے جیسی، سایا سا تیرے جانے جیسا

یا تو جو ہے یہی ہے سب کچھ، یا پھر سب کچھ یہی نہیں ہے
یا پھر دنیا دیکھ رہی ہے خواب کوئی دیوانے جیسا

○

یاد کہاں رکھنی ہے، تیرا خواب کہاں رکھنا ہے
دل میں یا پھر آنکھوں میں، مہتاب کہاں رکھنا ہے

گھر اور آنگن دونوں ہی تقسیم کی نذر ہوئے ہیں
تجھے کہاں ٹھہرانا ہے، اسباب کہاں رکھنا ہے

جو کچھ تھا، سب بانٹ دیا ہے، جو ہے تم لے جاؤ
سود و زیاں کا ہم ایسوں نے حساب کہاں رکھنا ہے

وہ کہتا ہے، آخری باب عشق مکمل کر لیں
اور میں سوچ رہا ہوں، پہلا باب کہاں رکھنا ہے

حسن کی یکتائی کا بس اتنا احساس ہے مجھ کو
کانٹوں کی ترتیب میں ایک گلاب کہاں رکھنا ہے

غلام حسین ساجد

○

نگاہ کرتا ہوں آبِ آئینہ سے اُدھر بھی
کہ ایک دنیا ہے بابِ آئینہ سے اُدھر بھی

چراغ ہے اِک چراغِ بینائی کے علاوہ
گلاب ہے اِک گلابِ آئینہ سے اُدھر بھی

اسیر کرتا نہیں مجھے یہ جہانِ حیرت
مَیں پڑھ رہا ہوں کتابِ آئینہ سے اُدھر بھی

جو میرے پیشِ نظر ہے وہ بھی بُرا نہیں ہے
مگر مَیں تکتا ہوں خوابِ آئینہ سے اُدھر بھی

یہ واقعہ ہے کہ اب تلک اِک ہجومِ معنی
رُکا ہوا ہے نصابِ آئینہ سے اُدھر بھی

کچھ اِس طرح منتشر ہوتے ہیں سبھی عناصر
کوئی نہیں ہے غیابِ آئینہ سے اُدھر بھی

غبار اُڑاتا ہوا کوئی جا رہا ہے ساجد
کہ دُھند سی ہے سحابِ آئینہ سے اُدھر بھی

○

فرازِ عرش پر موجِ رواں زنجیر کر لیتا
مَیں سحرِ خاک سے سارا جہاں زنجیر کر لیتا

کبھی مَیں اکتفا کرتا نہیں ان چند تاروں پر
وہ کہہ دیتا تو مَیں اک کہکشاں زنجیر کر لیتا

اُتر آتا اگر رنگِ تمازت میری آنکھوں میں
مَیں سائے کے لیے اک سائباں زنجیر کر لیتا

بدلنے پر مُصر ہوتا اگر یہ موسمِ گریہ
بہار آزاد کر دیتا، خزاں زنجیر کر لیتا

اسیرِ خاکداں رکھتا دماغِ رُودِ خاکی کو
اور آبِ آئنہ سے آسماں زنجیر کر لیتا

مقرر گر نہیں ہوتا چراغ اُسکی حفاظت پر
تو میری صبح کو اک شمعداں زنجیر کر لیتا

اگر ہوتی اُسے بھی سیرِ دُنیا سے غرض ساجد
میں اُس کے واسطے اِک کارواں زنجیر کر لیتا

(پروفیسر) محمد افضل

○

اب کے وہ خواب پرانے ہوئے، مدت گذری
ان کے ہجراں میں زمانے ہوئے، مدت گذری

زندگی اپنا تعارف تو کرا دے کہ ہمیں
تجھ کو دیکھے ہوئے، جانے ہوئے، مدت گذری

آؤ اب ہم بھی چلیں کوہ و بیاباں کی طرف
قیس و فرہاد پرانے ہوئے، مدت گذری

وقت نے چھین لیا عشق سے معیارِ وفا
شہر کے لوگ دوانے ہوئے، مدت گذری

آپ چلتے ہیں ہمیشہ سے نئے وقت کے ساتھ
اور ہم لوگ پرانے ہوئے، مدت گذری

اب تو دل کہتا ہے، کچھ اپنی بھی مانو افضلؔ
آپ کی بات نہ مانے ہوئے، مدت گذری

○

سچ وہی تھا جو چشم نم نے کہا
آپ سمجھے نہیں جو ہم نے کہا

کیا کہیں اُس کٹھن زمانے کی
کہنے والے بہت تھے کم نے کہا

آنسوؤں کے چراغ گل کر کے
سو نہ جانا، شبِ الم نے کہا

ریت کے ہیں مکان سب افضلؔ
شہر کو دیکھ کر یہ ہم نے کہا

امتیاز الحق امتیاز

○

نقابِ سنگ ہٹ جائے صنم آئے نظر
مرے افکار تراشیں تو یہ غم آئے نظر

تری ہمدردیاں سر آنکھوں پر رکھوں گا میں
اگر تجھ کو مری گردن میں خم آئے نظر

یہاں سے کون گزرا تھا بڑی حیرت میں ہوں
حدِ امکان پر نقشِ قدم آئے نظر

اُسی سے گفتگو ہو جو نہیں بولا کبھی
زیادہ تر اُسے دیکھوں جو کم آئے نظر

قرینہِ نقش میں پہچان کا کوئی نہیں
غنیمت ہے زمانے کو جو ہم آئے نظر

دلِ آوارگاں کس حُسن کا قیدی ہُوا
کہ اپنی خاک کے ذرّے بہم آئے نظر

میں منظر سے پرے پہنچا فلک سے بھی پرے
بظاہر تو مجھے دیر و حرم آئے نظر

دُعا کو ہاتھ اُٹھیں اور بھرے جھولی مری
مصیبت میں ترا دستِ کرم آئے نظر

○

تسلیم و رضا کی انتہا ہوں
میں ماں کا کہنا مانتا ہوں

ٹھہرا پانی ہوں ساونوں میں
ہر شاخِ شجر کا آئینہ ہوں

تنہائی گلے سے یوں لگی ہے
میں خود سے کٹ کے جی رہا ہوں

تخلیق کی کیفیت عجب تھی
کچھ دیر تو میں خدا رہا ہوں

ہوتے تھے مکالمے اُسی سے
چُپ چاپ جسے میں دیکھتا ہوں

کوئی موسیقیوں کو سمجھے
بارش میں دُور کی صدا ہوں

کیا بات تھی امتیاز دل میں
کس بات پہ آج رو پڑا ہوں

رفیق سندیلوی

○

ہاں کی طاقتیں، کیا غیب اور کیا موجود
پھڑ کے تجھ سے بدن ہی نہیں رہا موجود

ڑے ہیں سمتِ فنا باغِ خواب کے پتّے
ہ ایسے تیز چلی ہے ہوائے ناموجود

یاہ شب میں وہ تیری ہی تھی سفید ہنسی
رکیا مدار میں تُو تھا ستارہ سا موجود

ں قوس توڑ کے نکلا تو یہ خبر ہی نہ تھی
دائرے کے اِدھر بھی ہے دائرہ موجود

ں بھی پردۂ تمثیل پر ہوں ہم دونوں
سب میں رہتا ہے ہر وقت تیسرا موجود

○

عدم کے دشت میں بس ایک رات بعدالموت
میں رُک کے دیکھوں کہ کیا ہے حیات بعدالموت

وہی علاقۂ حیرت، وہی خفی پردے
ملی نہیں ہے بدن کو نجات بعدالموت

فلک نے پہلے ہی متروک کر دیا تھا مجھے
زمیں بھی چھوڑ گئی میرا ساتھ بعدالموت

یہیں دھرے کا دھرا رہ گیا تھا مال و منال
کسی کے کچھ بھی نہ آیا تھا ہاتھ بعدالموت

ابھی میں پاٹ کے آیا ہی تھا نَفَس کی خلیج
عبور کرنا پڑا پُلِ صراط[1] بعدالموت

---

[1] صوتی قافیہ

مسعود احمد

○

چہرہ چہرہ وحشت ہے ویرانی ہے
ہر کردار کی اپنی ایک کہانی ہے

کچھ تو آخر صحراؤں کی پیاس بجھے
دریاؤں کے اندر کتنا پانی ہے!

رفتہ رفتہ سارے سنگ گلاب گئے
اس شوریدہ سر نے کیسی ٹھانی ہے

اس دنیا میں اک دن ہمیں نہیں ہونا
اپنے ہونے کی یہ ایک نشانی ہے

برسوں سے مصروف ہے وہ اس دھندے میں
آگ لگانی ہے اور آگ بجھانی ہے

کوشش کرنی ہے دل کو سمجھانے کی
لیکن اس کے ہاتھوں منہ کی کھانی ہے

اس دنیا میں کچھ کارِ دشوار نہیں
ساری مشکل اپنی تن آسانی ہے

○

نئے سرے سے ہم اپنی اڑان دیکھیں گے
قفس سے نکلیں گے تو آسمان دیکھیں گے

یہی بہت ہے اگر زندگی نے ساتھ دیا
تمہیں کبھی نہ کبھی مہربان دیکھیں گے

اس امتحاں سے گزر بھی گئے تو کیا حاصل
پھر اس کے بعد کوئی امتحان دیکھیں گے

علم اٹھائیں گے تھک ہار کر بغاوت کا
ابھی تو تیرے ستم کی اٹھان دیکھیں گے

یہاں ملے تو بجا ہے، بصورتِ دیگر
تری تلاش میں اگلا جہان دیکھیں گے

نجیب احمد

○

نہ ملے تم نہ ملا نام، چلو یونہی سہی
اپنی قسمت سے تھے کچھ الزام، چلو یونہی سہی

ہم نہیں ہیں سببِ رونقِ محفل، نہ سہی
یار ہیں نورِ در و بام، چلو یونہی سہی

ہم ابھی زمزمۂ عشق سے مانوس نہیں
دلِ رسوا! دلِ ناکام! چلو یونہی سہی

ہم نے دیکھی پسِ پیکر کسی فرعون کی روح
ہم نے دیکھے نہیں اہرام، چلو یونہی سہی

مرحلہ مرحلہ آفاق کشا تھی منزل
تابِ منزل نہ تھی یک گام، چلو یونہی سہی

عمر بھر کون ادا قرضِ رفاقت کرتا
رات کی رات ہے بسرام، چلو یونہی سہی

کسی زرگر کی کٹھالی میں پگھل جائیں گے
خاک ہوں گے نہ زرِ انجام، چلو یونہی سہی

یہ لب و رُخ مری رسوائی کے محتاج نہیں
آپ ہیں آئنہ اندام، چلو یونہی سہی

○

یہ بچے کتنے پیارے لگ رہے ہیں
مرے ماں باپ مجھ میں آ بسے ہیں

ہزاروں بت ہیں خیمہ گاہِ دل میں
لبوں پہ اک خدا کے تذکرے ہیں

نہیں وجہِ الم، شب کی طوالت
چراغوں کو ہواؤں سے گلے ہیں

مرے سادہ سخن کے تیوروں سے
ترے ماتھے پہ کیا کیا بل پڑے ہیں

ترے مہجور، کل تک انجمن تھے
تجھے پا کر اکیلے ہو گئے ہیں

تری یادوں کے آوارہ سفینے
مرے دل کے کنارے چل رہے ہیں

دل نواز دل

○

نکھ سے دیکھا تو کیا دیکھا
دل میں سوچا تو کیا سوچا

دل پر ہاتھ رکھو تو سنبھلوں
سر پر رکھا تو کیا رکھا

زیست کے کھیت میں، مَیں بیچارہ
اشک نہ بوتا تو کیا بوتا

غیر کی موت پہ جو ہنستا تھا
آپ مرا تو کوئی نہ رویا

اب تک دل میں سوچ رہا ہوں
آنکھ نہ کھلتی تو کیا ہوتا

خواب میں دیکھا تو بس تُو تھا
جس کو دیکھا تجھی کو دیکھا

رُکتا رُکتا، گرتا پڑتا
پہنچا بھی دل تو کیا پہنچا

○

وہ گُل چہرہ کھلا جب سے
چمن کو رشک ہوا تب سے

یہی ہے اب دُعا رب سے
غزل ہو تو جُدا سب سے

نہ دن سے کوئی شکوہ ہے
نہ ہے کوئی گلا شب سے

کسی سے کچھ کہا مَیں نے
مگر تُو نے سُنا سب سے

نہ بچھڑا وہ قرینے سے
نہ آکر ہی ملا ڈھب سے

وہ اک بندہ خدا کا تھا
خدا وہ بن گیا کب سے

یوسف حسن

○

تیرے لبوں کی لَو جو مرے آس پاس تھی
دل کی فسردگی میں بھی کتنی مٹھاس تھی

جو مضطرب رہی تری پلکوں کی اوٹ میں
میری نگاہ میں بھی وہی التماس تھی

لپٹی ہوئی تھی کتنے ہی پردوں میں آرزو
آنکھوں کے آئینوں میں مگر بے لباس تھی

جس میں شفق شفق ترا عکسِ جمال تھا
مجھ کو وہ گرد گرد مسافت بھی راس تھی

یا تیری اک جھلک بھی نہیں دُور دُور تک
یا گام گام پر ترے ملنے کی آس تھی

یوسف جو سر اٹھاتے ہی پامال ہو گیا
میرے وجود میں اسی سبزے کی باس تھی

سر اٹھاتے ہی ہو گئے پامال سبزۂ نو دمیدہ کی مانند
(میر)

○

ہم جو تیری لہر میں ہیں
کتنے پیاسے شہر میں ہیں

تیرے شام و سحر کے لیے
ہم دل کی دوپہر میں ہیں

دریا تھے جو آپ کبھی
کیوں آسودہ نہر میں ہیں

چہرہ چہرہ مسخ ہوا
رنگ بلا کے شہر میں ہیں

کس کی خاک سوال ہوئی
منبر و مسند قہر میں ہیں

اَمرت اب کس کس سے کہے
تاثیریں کیا زہر میں ہیں

یوسف جیون جیون ہم
ایک غبارِ دہر میں ہیں

جلیل عالی

○

اس دل کی نگہباں جو کوئی ذات نہ ہوتی
اک جیت خوشی بھی پسِ صدمات نہ ہوتی

اب آنکھ میں بے ربطیٔ منظر کی تھکن ہے
رفتارِ نظر ایسی بھی محتاط نہ ہوتی

اتنے بھی زمانے سے گریزاں نہ گزرتے
رستے میں اگر تم سے ملاقات نہ ہوتی

یا درد اُترتا کسی انجام کنارے
یا سلسلۂ غم کی شروعات نہ ہوتی

ہوتا کہ کوئی سانس تو من موج میں جیتے
بیگار کی صورت بسر اوقات نہ ہوتی

اک لَے پہ لہو رقص میں رہتا جو نہ عالیؔ
حرفوں کے سُروں میں یہ کرامات نہ ہوتی

○

ہوتے ہوتے ہم اتنے محتاط ہوئے
سارے شوق سوالِ اسیرِ ذات ہوئے

بس اک درد کی دُھول دلوں میں اُڑتی ہے
برسوں بیتے ان باغوں برسات ہوئے

اُس نے بساط بچھائی اب کے کچھ ایسے
اپنی انا کے سارے مہرے مات ہوئے

اک بے نام شکار کی مار پہ بیٹھے ہیں
اپنی گپھا میں اور کسی کی گھات ہوئے

کس کی یاد پسِ احساس فروزاں ہے
کس کے نام تمام مرے دن رات ہوئے

آوارہ الفاظ کہانی کیا بنتے
اک ترتیب میں آئے تو اک بات ہوئے

اشرف جاوید

○

خواب آنکھوں میں سجائے نیند کو چلتا کیا
رتجگوں کے شہر میں سودا بڑا مہنگا کیا

دشت تھا، پہنائی تھی اور آبلہ پائی بھی تھی
اک بگولے کی طرح دُھن میں سفر تنہا کیا

سانس کے بدلے ہوا نے جسم گروی رکھ لیے
بھیک میں لی زندگی، یہ فیصلہ کیسا کیا!

تیر کی صورت کرن نکلی کمانِ صبح سے
روشنی کے لمس نے ہر آنکھ کو اندھا کیا

اک پتا کیا گرا، ساری حقیقت کھُل گئی
ایک جھونکے نے سبھی اشجار کو ننگا کیا

گر پڑے ہیں خاک کے قدموں میں تارے ٹوٹ کر
رات بھر اک خوف نے کیا حشر سا برپا کیا

اب فصیلِ جسم بھی ٹوٹے گی دیواروں کے ساتھ
گھر کے اندر سے بھی دشمن نے بڑا حملہ کیا

○

فرازِ شب کے کلس سے اتر بھی آئے گا
وہ چاند ہے تو سرِ چشمِ تر بھی آئے گا

لہو لہو ہیں مرے ہاتھ دستکوں سے، مگر
سماعتوں کی فصیلوں میں در بھی آئے گا

وہ مجھ سے بات کرے گا مرے ہی لہجے میں
امیرِ شہر کو خلقت سے ڈر بھی آئے گا

درِ ہوا پہ چراغوں کو جلتے رہنا ہے
کہیں تو لمحۂ جشنِ سحر بھی آئے گا

یہ میرا چہرہ بشارت ہے اس کے ہونے کی
اسی حوالے سے وہ لوٹ کر بھی آئے گا

دھرا ہوں چاک پہ صدیوں سے انتظار میں ہوں
مرے نصیب میں دستِ ہنر بھی آئے گا

نصیر احمد ناصر

○

درد کی گھر سے خالی ہیں فضائیں کچھ دیر
کیوں نہ یادوں کے کبوتر ہی اڑائیں کچھ دیر

زندگی غم کی فصیلوں میں مقید ہے ابھی
روک لو سینے میں آوارہ نوائیں کچھ دیر

شہرِ احساس کے درماندہ مسافر کی طرح
اک تمنّا ہے کہ دیتی ہے صدائیں کچھ دیر

آ محبت میں شکستوں کو فروزاں کر کے
جشن ہارے ہوئے خوابوں کا منائیں کچھ دیر

پھول گلشن میں مہکتے ہیں تو جل اٹھتی ہیں
میرے ہونٹوں پہ تبسم کی ردائیں کچھ دیر

پھر کسی پھول کو، پتے کو نہ یاد آئے گا
جانے والے کو پکاریں گی ہوائیں کچھ دیر

گو یہاں کوئی جہانگیر نہیں ہے ناصر
آؤ انصاف کی زنجیر ہلائیں کچھ دیر

○

جو لے گیا تھا چھین کے بینائیاں مری
جلتی ہیں اُس کی آنکھ میں پرچھائیاں مری

اس شہرِ بے صدا کے دریچے نہ کھل سکے
گلیوں میں چیختی رہیں تنہائیاں مری

لمحوں میں بٹ گئی ہے مرے جسم کی صدی
کم ہو گئی ہیں پھیل کے گہرائیاں مری

روکا ہے ایک اجنبی خوشبو نے راستہ
حیران سی کھڑی ہیں شناسائیاں مری

سورج کے سامنے ہے مرا برف سا بدن
سیّال ہو رہی ہیں توانائیاں مری

رکھی ہیں کس نے جسم کے بربط پہ انگلیاں
بجنے لگی ہیں روح میں شہنائیاں مری

اے دوست! راستوں میں سمندر بھی آئیں گے
کام آئیں گی ترے کبھی گہرائیاں مری

معین نجمی

○

دیکھنے والوں کے اندازِ نظر ہوتے ہیں
پھول بھی پھول کہاں زخمِ شجر ہوتے ہیں

دیکھ سکتا ہو جب انسان نقائص اپنے
آئینے باعثِ توہینِ نظر ہوتے ہیں

جلتی آنکھوں کی عبارت بھی تو پڑھنا سیکھو
ان میں اُمڈے ہوئے آنسو بھی شرر ہوتے ہیں

جاگ کر اب تو کیا کرتے ہیں نیندیں پوری
خواب پلکوں پہ بہ اندازِ دگر ہوتے ہیں

ڈوبنے کے لیے دریا کی ضرورت کیسی
ایسی آنکھیں بھی تو ہیں جن میں بھنور ہوتے ہیں

تم ابھی سے ہو پریشان گلستان والو!
وہ بھی ہیں جن کے بیابانوں میں گھر ہوتے ہیں

شہرِ ظلمت سے گزرنے کا تو کچھ خوف نہیں
یہاں دیوار کے سائے پسِ در ہوتے ہیں

اب کوئی عکس سلامت ہو تو کیسے نجمی
اب تو ٹوٹے ہوئے لوگ آئنہ گر ہوتے ہیں

تصدق شعار

○

تیرے اعجاز سے موجود و میسر ہوں میں
ورنہ اک خاک کی ڈھیری کے برابر ہوں میں

اُس کی دلچسپیوں میں میرا کہیں ذکر نہیں
کسی فائل کی طرح داخلِ دفتر ہوں میں

میرا ایمان ہی راضی بہ رضا رہنا ہے
ورنہ ایسی بھی نہیں بات کہ پتھر ہوں میں

مصلحت مہر بہ لب رکھتی ہے لمحہ لمحہ
میں ہی کچھ جانتا ہوں کیسا سخنور ہوں میں

ایک جھونکا جو مجھے چھو کے کبھی گزرا تھا
آج تک اُس کے تواتر سے معطر ہوں میں

علی اصغر عباس

○

دشت میں نوحہ کناں پھیلتی ویرانی پر
کس نے اس شہر کی بنیاد رکھی پانی پر

ہم مسافر ہیں، ہمیں کون یہاں پوچھتا ہے
کوئی رنجور نہ ہو بے سروسامانی پر

تیرگی اور بڑھی جاتی ہے رفتہ رفتہ
آج کیوں رات کمر بستہ ہے عریانی پر

جسم کی حد سے پرے کوئی کھڑا سوچتا ہے
کیسے اب ریت کی دیوار بنے پانی پر

آسماں، تیری لحد کھود رہا ہے کوئی
اب زمیں اور کسے لائے نگہبانی پر

اس فسوں کار محبت میں یہی ہوتا ہے
ہونٹ خاموش رہیں، آنکھ ہو طغیانی پر

○

مسافرت میں کہاں پر پڑاؤ ڈال دیا
کہ آسمان نے سورج نیا اچھال دیا

یہ کائنات کہاں دسترس سے باہر تھی
ترے خیال نے دل سے اسے نکال دیا

جواب ذہن سے سارے مٹا دیئے اس نے
ہمارے ہاتھ میں بس کاسۂ سوال دیا

وہ اور ہوں گے جنہیں راحتیں میسّر ہیں
ہمیں نصیب نے یہ قریۂ ملال دیا

محبتوں کو جنہوں نے فروغ دینا تھا
انہیں تو لوگوں نے اس شہر سے نکال دیا

یہ چاندنی کہ جو تیرہ شبوں کی مہماں تھی
ترے وجود نے اس کو بہت اُجال دیا

عباس تابش

○

زخم چھپانے کو ہم خلعت مانگتے ہیں
تم کہتے ہو اجر، اُجرت مانگتے ہیں

کاٹھ کی روٹی باندھ کے خالی شکموں پر
لوگ محبت، صرف محبت مانگتے ہیں

تُو بھی عشق کی خاطر کوئی وقت نکال
ہم بھی اپنے رب سے مہلت مانگتے ہیں

اب تو شاید سَر دے کر ہی بات بنے
جزیہ دینے والے بیعت مانگتے ہیں

میری دعا سے اور تری آمین سے کیا
اس بستی کے لوگ قیامت مانگتے ہیں

لے دے کر اک خاک نشینی باقی ہے
اس پر بھی یہ لوگ خلافت مانگتے ہیں

شام کو شکرانے کے نفل ادا کر کے
ساری رات خدا سے عزت مانگتے ہیں

تیرے دوارے پھرنے والے بے گھر لوگ
داتا تیری نگری میں چھت مانگتے ہیں

○

پانی آنکھ میں بھر کر لایا جا سکتا ہے
اب بھی جلتا شہر بچایا جا سکتا ہے

ایک محبت اور وہ بھی ناکام محبت
لیکن اس سے کام چلایا جا سکتا ہے

دل پر پانی پینے آتی ہیں اُمیدیں
اس چشمے میں زہر ملایا جا سکتا ہے

مجھ گمنام سے پوچھتے ہیں فرہاد و مجنوں
عشق میں کتنا کام کمایا جا سکتا ہے

یہ مہتاب، یہ رات کی پیشانی کا گھاؤ
ایسا زخم تو دل پر کھایا جا سکتا ہے

پھٹا پرانا خواب ہے میرا پھر بھی تابشؔ
اس میں اپنا آپ چھپایا جا سکتا ہے

قمر رضا شہزاد

○

لباسِ زر کہ غربت میں رہوں گا
میں اپنی اصل صورت میں رہوں گا

سبھی کچھ آشکارا ہے مگر میں
کسی نادیدہ حیرت میں رہوں گا

میں اپنا آپ ہوں ظلِ الٰہی
میں اپنی ہی حکومت میں رہوں گا

سنور نے کیا ہیں خال و خد کہ جب میں
سدا کارِ مشقت میں رہوں گا

اٹھا سکتا ہوں میں بھی صبر کا پھل
مگر افسوس عجلت میں رہوں گا

بچانا چاہتا ہوں تیری دنیا
اسی خاطر ہلاکت میں رہوں گا

غروبِ مہر تک شہزاد میں بھی
مسلسل اپنی حدت میں رہوں گا

○

تری محبت کا بوجھ ڈھونے سے رہ گیا ہوں
مجھے یہ دکھ ہے میں تیرا ہونے سے رہ گیا ہوں

مجھے بھی آتی ہے دنیا داری، بچھڑنے والے!
مگر میں اِس سانحے پہ رونے سے رہ گیا ہوں

کہیں ہوں موجود میں بھی اِس داستاں میں لیکن
تری زبانی بیان ہونے سے رہ گیا ہوں

مرے خد و خال مختلف تو نہیں ہیں تجھ سے
مگر میں کیوں تیرے جیسا ہونے سے رہ گیا ہوں

یہ خاک میرے لہو کی پیاسی ہے اور شہزاد
یہاں میں شاخِ گلاب بونے سے رہ گیا ہوں

عدنان بیگ

○

آنکھ بھی کسی کی ہے خواب بھی کسی کے ہیں
رتجگوں کے جنگل میں صرف درد میرے ہیں

شاخِ چشم سے آنسو بور کی طرح اُترے
غم کی تیز آندھی میں پیڑ بھی اکیلے ہیں

بھید کیا کھُلے ہم پر اِس نمو کے موسم کا
سرسراتے پتّوں میں ان کہے فسانے ہیں

شامِ غم! بتا تجھ پر کس بلا کا سایا ہے
یہ جو تیرے لمحے ہیں کیوں نہیں گذرتے ہیں

کتنا خالی خالی تھا آنسوؤں کا موسم بھی
آنکھ بھر تماشے کو بوند بوند ترسے ہیں

صبحِ شہرِ افسردہ! تو بھی شامِ غم سی ہے
دُور افق کی آنکھوں میں زرد رُت کے سائے ہیں

عہدِ بے تصرف میں تم ملو تو سوچیں بھی
یہ زمین کس کی ہے، یہ زمانے کس کے ہیں

اب تو یہ دُعا ہے تُو لمحہ بھر کو مل جائے
یوں بھی ایک لمحے میں اَن گنت زمانے ہیں

اُسکے دل میں تو عدنان خواہشیں کسی کی تھیں
میں نے جسکی آنکھوں میں اپنے خواب چاہے ہیں

○

دعائیں بھی نہ منزل تک پہنچ پائیں تو کیسا ہو
پلٹ آئیں یہ گڑگڑاتی ہوئی گونجیں تو کیسا ہو

بتائے جا چکے تنہائی کے موسم کی باتوں میں
اچانک ہنستے ہنستے ہم اگر رو دیں تو کیسا ہو

کبھی ہم ساتھ چلتی رہگزر میں بھٹکے پھرتے ہوں
ہوائیں رُک کے ہم سے راستہ پوچھیں تو کیسا ہو

کسی کی پتلیوں میں عکس بن جانے کی خواہش ہے
کسی دن تم سے بھی یہ بات ہم کہہ دیں تو کیسا ہو

اُداسی رنگ بن کر چاروں جانب پھیلتی جائے
اگر لمحے بھی اِس لمحے ٹھہر جائیں تو کیسا ہو

کبھی یوں ہو کہ ہم تیرے علاوہ اور کچھ مانگیں
دُعا کے بعد خود سے بھی نہ ہم بولیں تو کیسا ہو

جُدائی کی طرف بڑھتے ہوئے بھی مسکراتے ہوں
بچھڑنے سے ذرا پہلے پلٹ آئیں تو کیسا ہو

تابش کمال

○

کبھی اِس نگر تجھے دیکھنا، کبھی اُس نگر تجھے ڈھونڈنا
کبھی سارا دن تجھے سوچنا، کبھی رات بھر تجھے ڈھونڈنا

مرا خواب تھا کہ خیال تھا، وہ عروج تھا کہ زوال تھا
کبھی خاک پر تجھے دیکھنا، کبھی چاند پر تجھے ڈھونڈنا

مجھے جابجا تری جستجو، تجھے ڈھونڈتا ہوں میں کُو بہ کُو
کہاں کُھل سکا ترے رُو برو مرا اس قدر تجھے ڈھونڈنا

یہاں ہر کسی سے ہی بیر ہے، ترا شہر قریۂ غیر ہے
یہاں سہل بھی تو نہیں کوئی، مرے بے خبر! تجھے ڈھونڈنا

تری یاد آئی تو رو دیا جو تو مل گیا تجھے کھو دیا
مرے مشغلے بھی عجیب ہیں، تجھے چھوڑ کر تجھے ڈھونڈنا

یہ لگے کہ یوم حساب ہے، یہ ثواب ہے کہ عذاب ہے
مرا خواب ہے، مرے ہمسفر! سر رہگزر تجھے ڈھونڈنا

تجھے ڈھونڈنا مرا شوق ہے، تری آرزو مرا ذوق ہے
یہی قرب تو مرا طوق ہے، کہیں دُور تر تجھے ڈھونڈنا

یہ مری غزل کا کمال ہے کہ مری نظر کا جمال ہے
تجھے شعر شعر میں سوچنا، سر بام و در تجھے ڈھونڈنا

اے جی جوش

○

سُونا سُونا دل کا مجھے نگر لگتا ہے
اپنے سائے سے بھی آج تو ڈر لگتا ہے

بانٹ رہا ہے دامن دامن میری چاہت
اپنا دل بھی کسی سخی کا در لگتا ہے

محرومی نے جہاں بسیرا ڈھونڈ لیا ہو
مجھ کو تو وہ گھر بھی اپنا گھر لگتا ہے

شب سیاہ کی زُلفیں سُلجھاتا رہتا ہوں
میرا تو اس کام میں جی شب بھر لگتا ہے

ہر ساون میں کھل جاتے ہیں زخم دلوں کے
نخلِ وفا میں شاید یہی ثمر لگتا ہے

میری بربادی میں حصہ ہے اپنوں کا
ممکن ہے یہ بات غلط ہو، پر لگتا ہے

جوشؔ ہوں میں دیوانے پن کی اُس منزل پہ
جہاں رقیب بھی اپنا نامہ بر لگتا ہے

اختر شیخ

○

عجب نسیان ہے، کوشش کہیں رکھ دی ہے میں نے
زمیں کی آخری خواہش کہیں رکھ دی ہے میں نے

بہت مشکل ہُوا ساکت بدن سے کام لینا
بسر اوقات میں جُنبش کہیں رکھ دی ہے میں نے

تعلق ہے اگرچہ آمد و رفتِ جہاں سے
مگر فی الحال تو گردش کہیں رکھ دی ہے میں نے

سوالِ خاکِ تشنہ بھی نہیں بے سُود لیکن
سرِ آب رواں بارش کہیں رکھ دی ہے میں نے

تو یُوں بھونچال کے مدِ مقابل آ گیا ہوں
در و دیوار میں لرزش کہیں رکھ دی ہے میں نے

متاعِ وہم اپنے ساتھ لے آیا ہوں اختر
مگر اجداد کی دانش کہیں رکھ دی ہے میں نے

○

ہوتا ہی چلا جاتا ہے ہونا نہیں ہونا
اس حال میں مٹی نے تو سونا نہیں ہونا

بوسیدہ سہی زیرِ بدن کچھ تو رہا ہے
یک ریشۂ خواہش کو بچھونا نہیں ہونا

چرچا ہے عجب شہر میں اُس قلت و قد کا
آئینہ تو ہو جانا کھلونا نہیں ہونا

پہلے ہی تحیر سے ہے لبریز یہ دُنیا
یکساں ہے یہاں معجزہ ہونا نہیں ہونا

کتنا بھی جُدا کھیل ہو اس موج سے اختر
دریا کو ہی دریا میں ڈبونا نہیں ہونا

اختر عثمان

○

جانے کس رنگ میں ہو آجکل اپنا دریا
سن رہا ہوں کہ ہوا تیز ہے دریا دریا

تجھ سمندر کی گھنی موج تک آتے آتے
مجھ کو رستے میں پڑے ہیں کئی صحرا، دریا

آج بھی وصل کی وہ لہر لیے پھرتی ہے
کس قدر ناز دکھاتا ہے اُترتا دریا

لہر لہرائے تو لگتی ہے لہو میں لَو سی
لہلہاتا ہے کسی آئنے جیسا دریا

یہ چنبیلی کے ہیں لہرے کہ بدن کی ململ
جھلملاتا ہوا آنچل ہے ترا، یا دریا

عالمِ نشہ وحیرت میں کھلا عقدۂ بحر
حالتِ ہوش میں پیدا ہی نہیں تھا دریا

ڈوبتے وقت بھلے ہاتھ ہلاتے رہیے
کس کا غم خوار بھلا، کس کا شناسا دریا

کئی پہلو، کئی پرتو، کئی پیرائے ہیں
عمر بھر ایک طرف کو نہیں بہتا دریا

کیا طلاطم تھے کہ پل میں خس وخاشاک ہوئے
صاحبو! خاک ہوئے دشت میں کیا کیا دریا

وہ تو بس مصلحتِ خاص تھی اختر، ورنہ
ہم سے ایسا بھی کوئی دور نہیں تھا دریا

سعود عثمانی

○

حسابِ ترکِ تعلق تمام میں نے کیا
شروع اُس نے کیا، اختتام میں نے کیا

مجھے بھی ترکِ محبت پہ حیرتیں ہی رہیں
جو کام میرا نہیں تھا، وہ کام میں نے کیا

وہ چاہتا تھا کہ دیکھے مجھے بکھرتے ہوئے
سو اُس کا جشن بصد اہتمام میں نے کیا

بہت دنوں مرے چہرے پہ کرچیاں سی رہیں
شکستِ ذات کو آئینہ فام میں نے کیا

بہت دنوں میں مرے گھر کی خامشی ٹوٹی
خود اپنے آپ سے اک دن کلام میں نے کیا

اُس اک درخت پہ لکھے حروف پھر سے پڑھے
پھر ایک نام وہاں ارتسام میں نے کیا

چلی جو سیلِ رواں پر وہ کاغذی کشتی
تو زیرِ آب محبت کے نام میں نے کیا

اُس ایک ہجر نے ملوا دیا وصال سے بھی
کہ تو گیا تو محبت کو عام میں نے کیا

مزاجِ غم نے بہر طور مشغلے ڈھونڈے
جو دل دکھا تو کوئی کام وام میں نے کیا

وہ آفتاب جو دل میں دہک رہا تھا سعود
اُسے غروبِ شفق آج شام میں نے کیا

جمشید چشتی

○

اُتر گیا ہے جو اک بوجھ میرے سر پر تھا
غضب خدا کا، کوئی قرض تھا کہ پتھر تھا

میں چھوڑ آیا ہوں بچپن کے سب نقوش وہیں
وہ اک مکاں جو کسی کا تھا، اور مرا گھر تھا

شکست دے کے مرا حوصلہ بلند کیا
وہ مہربان ہی نکلا اگر ستمگر تھا

ہماری شام کسی کی سحر پہ ختم ہوئی
اُبھرنا، ڈوبنا خورشید کا برابر تھا

کٹا پہاڑ، تو نکلی نہ جوئے شیر، مگر
جو شب کٹی تو اُجالوں کا اک سمندر تھا

○

ظلم اب یوں ہے، روا ہو جیسے
اور ہر شخص خدا ہو جیسے

گھر سے نکلوں تو مجھے لگتا ہے
ہر طرف حشر بپا ہو جیسے

یوں جھکا دیتا ہوں ہر مشکل میں
سر میں کچھ بھی نہ رہا ہو جیسے

یوں محبت مری ٹھکرائی گئی
کسی بے کس کی دعا ہو جیسے

یوں لگا دیکھ کے اس کو جمشید
شعر فطرت نے کہا ہو جیسے

احمد ندیم قاسمی

○

زمیں کو میں نے کبھی آسماں نہ ہونے دیا
متاعِ خاک کو یوں رائیگاں نہ ہونے دیا

صنم تراش کے، پھر اس کی گفتگو بھی سُنی
کہ میں نے سنگ کو بھی بے زباں نہ ہونے دیا

میں زخم زخم ہوں اور اس کی داد چاہتا ہوں
لگی جو چوٹ، اسے بے نشاں نہ ہونے دیا

یہ راز کیا ہے کہ ارض و سما کے خالق نے
کسی کو اپنے سوا جاوداں نہ ہونے دیا

طفولیت میں ہے انسان مبتلا اب تک
کسی بھی دَور نے اس کو جواں نہ ہونے دیا

بہار رُک نہ سکی میرے روکنے سے ندیمؔ
مگر چمن کو سپردِ خزاں نہ ہونے دیا

اختلافات

عامر سہیل ، افتخار مغل ، امتیاز علی خان ، خاور نقوی

فنون ۴۴

رشید ملک کے مقالات علمی، تحقیقی ، تنقیدی اور تجزیاتی اعتبار سے خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انڈالوجی کے حوالے سے وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب پران کا مقالہ بہت پسند آیا۔ یہ موضوع میری دلچسپی کا تھا اس لئے میں نے اسے بڑے شوق سے پڑھا بلکہ بار بار پڑھا۔ جان مارشل اور ڈائن بی نے وادیٔ سندھ کی اس عظیم الشان تہذیب کے بارے میں جن مفروضات کو متعارف کرایا تھا اس کے نتیجے میں دیگر ماہرینِ آثار کے تجزیے اور نتائج غیر جانبداری کی شرائط کو کلی طور پر پورا نہیں کر سکے، لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک خوش آئند بات ہے کہ بہت سے آرکیالوجسٹ اس تہذیب کو کسی حد تک غیر جانبداری سے دیکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ قضیہ خاصا الجھا ہوا ہے لیکن رشید ملک نے بڑی عرق ریزی کے بعد مارشل اور ڈائن بی کے قائم کردہ مسلمات کو جدید حفریات EXCAVATION کی روشنی میں پرکھا ہے اور اس ضمن میں علم ارضیات (GEOLOGY) سے مدد لیتے ہوئے جن حقائق کو منظر عام پر لایا گیا ہے وہ کوئی معمولی بات نہیں۔

یہ تہذیب اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر ایف ، اے خان نے ۱۹۵۰ء میں کوٹ ڈی جی کے مقام پر جو کھدائی کی تھی اُس کے بعد وادیٔ سندھ کے بارے میں بہت سے وضعی نظریات کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ کوٹ ڈی جی سے ملنے والی اشیاء کا جب ریڈیو کاربن کے ذریعے معائنہ اور تجزیہ کیا گیا تو انکشاف ہوا کہ اس تہذیب کا تسلسل ۳۸۰۰ ق م تک قائم ہے، لیکن بعد میں کی جانے والی کوششوں نے اس کی قدامت کو ۵۰۰۰ ق م تک پھیلا دیا تھا۔ اس تہذیب کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ صرف چولستان کے مقام پر ڈاکٹر محمد رفیق مغل نے تین سو تریسٹھ (۳۶۳) مدفون بستیوں کا سراغ لگایا ہے اور ان سب بستیوں کا تعلق براہِ راست اسی تہذیب سے ہے۔

وادیٔ سندھ کے بڑے بڑے شہروں میں ہڑپہ ، موہنجوداڑو اور گنویری کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس تہذیب سے تعلق رکھنے والے قرب و جوار کے تمام علاقے آپس میں حیرت انگیز یکسانیت رکھتے ہیں۔ مکانوں، گلیوں کے نقشوں سے لے کر رہن سہن کے طریقوں تک کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ نیز مادّی ثقافت کے بنیادی عناصر کے علاوہ زبان اور رسم خط بھی ہر دور میں تقریباً ایک جیسا ہی رہا۔ اس طرح کی مزید تفصیلات کے لیے پگٹ (PIGGOT) کی PRE-HISTORIC INDIA یا کوسامبی (D.D.KOSAMBI) AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF INDIAN-HISTORY کا مطالعہ قارئین کے لیے دلچسپ بھی ہوگا اور معلومات افزا بھی۔ سومیر (SOMERIANS) مصر اور چین کی ہمعصر یہ تہذیب ایک وسیع و عریض خطے پر پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف تو اس کا پھیلاؤ پنجاب ، سندھ اور بلوچستان تک تھا اور دوسری طرف کشمیر اور کاٹھیاواڑ تک۔ اِس کے آثار سے یہ امر بھی پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ بنیادی طور پر یہ

ایک شہری تہذیب تھی۔ یہ تہذیب جہاں اور بے شمار متنازعہ مباحث کی محرک ہے وہاں ایک اہم مسئلہ اس تہذیب کے نسلی اور ثقافتی عناصر کا بھی ہے۔ کچھ ماہرین کے نزدیک اس تہذیب کا تعلق دراوڑی نسل سے ہے، جب کہ دوسرے گروہ کو اس میں آریائی کلچر کے آثار زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ جان مارشل کا مکتب اسے آریائی اور ویدک تہذیبوں سے الگ کر کے دیکھنے کا مشورہ دیتا ہے آر۔ ڈی بینرجی جو کہ اس تہذیب کی کھدائی میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں، اسے دراوڑی کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر گوچا نے بہر حال اسے مخلوط تہذیب قرار دیا ہے جس پر ابھی تک کوئی قابل ذکر اعتراض وارد نہیں ہوا۔ رشید ملک صاحب اگر وادیٔ سندھ کے اِن متنازعہ پہلوؤں پر بھی توجہ کرتے تو بہت سے پیچیدہ عقدے وا ہو سکتے تھے۔

"فنون" میں شائع ہونے والے افسانے پڑھ کر زندگی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے ورنہ آج کل تو علامت، تجدید اور نام نہاد آفاقیت کے زعم میں فن افسانہ نگاری کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی المیے سے کم نہیں، گذشتہ آٹھ نو عشروں میں اُردو مختصر افسانے میں فن اور اسلوب کے اعتبار سے کئی نئی جہتیں سامنے آئی ہیں۔ یقیناً ان میں بہت سے تجربات کامیاب بھی ہوئے لیکن ایک کم سواد طبقے نے محض اِن تجربات ہی کو افسانے کی اصل بنیاد سمجھتے ہوئے جو کچھ لکھا اُس سے نہ صرف فن کاروں کی توانائیاں ضائع ہوئیں بلکہ افسانے کا فنی و فکری وقار بھی مشکوک ہو کر رہ گیا تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ جس افسانے کو پریم چند کرشن چندر، سجاد حیدر یلدرم، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری، ممتاز شیریں، راجندر سنگھ بیدی عزیز احمد اور عصمت چغتائی جیسے پختہ کار اور بلند پایہ افسانہ نگار ملے ہوں وہ پھر بھی قبلہ ثانی کی تلاش میں سرگرداں رہا۔

آج کل بھی مختلف ادبی رسائل و جرائد میں ایسے "آفاقی" افسانے پڑھنے کو مل جاتے ہیں جو (SHACE AGE) کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے معرضِ تحریر میں لائے گئے ہیں، ایسے "روشن خیال" لکھاریوں سے میرا صرف ایک سوال ہے۔ کیا ان افسانوں کا زمین سے بھی کوئی تعلق ہے؟

"فنون" کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اُس نے تجربات کے اس عبوری دور میں اپنے قارئین کو معیاری افسانے پڑھنے کو دیئے "فنون" میں خواتین افسانہ نگاروں کی بھرپور شرکت خوش آئند بات ہے، عطیہ سید، عذرا سید، نشاط فاطمہ، نیلوفر اقبال، اُم عمارہ، نگہت مرزا، رفعت مرتضیٰ، ارجمند شاہین، جیلانی بانو، بانو قدسیہ، خالدہ حسین، یاسمین مری، سیما پیروز، رضیہ فصیح الدین، شبانہ حبیب فرحت پروین، نعیمہ ضیاالدین، بلقیس ظفر، نیلم احمد بشیر، سائرہ ہاشمی، مسرت لغاری اور شہزادی نے اپنے افسانوں میں جیتی جاگتی زندگی کو جس فنکارانہ ہنرمندی اور رکھ رکھاؤ سے پیش کیا ہے اس سے دوسرے لکھنے والے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، ان میں سے ہر افسانہ نگار اپنے مزاج ماحول اور تجربات کے حوالے سے دوسرے سے مختلف ہے۔ لیکن ایک صفت اِن میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ یہ سب فنِ افسانہ نگاری کی اعلیٰ اور پائیدار روایات کے امین ہیں مندرجہ صدر ناموں کی فہرست نامکمل ہے۔ کیونکہ ان کو لکھتے وقت محض یادداشت پر بھروسا کیا گیا ہے آئندہ اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔

عطیہ سید ان دنوں منظر سے غائب ہیں۔ اُمید ہے کہ جلد اُن کا کوئی تازہ افسانہ پڑھنے کو مل جائے گا۔ میں نے اب تک اُن کے جو افسانے پڑھے ہیں (مثلاً آخری کہانی، کرسمس کی شب، بنتِ اسرائیل، پری زاد، شمالی ستارہ، میری میرا، ایبل اور وہ، خزاں میں کونپل، شہر ہول، چھ بجے کی خبر اور ہوٹل سلازار وغیرہ) ان کا تاثر ابھی تک ذہن میں قائم ہے اس قابل افسانہ نگار نے امریکی طرزِ معاشرت کے کھوکھلے اندرون کے بارے میں جس باریک بینی سے قلم اٹھایا ہے اس کی وجہ سے قارئین کو اس معاشرت کے تقریباً تمام پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے جرمن مفکر آسولڈ سپنگلر نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "زوالِ مغرب"

میں مغرب کی دیمک زدہ تہذیب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ عطیہ سید نے بھی اسی مسئلہ کو فکشن کے اُسلوب میں زیادہ وضاحت کے ساتھ اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ عطیہ سید کے افسانوں کی شعریات سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ان کا قاری فلسفہ، نفسیات، عمرانیات اور اسی طرح کے دیگر سماجی علوم سے اگر زیادہ نہیں تو کم از کم مبادیات کی حد تک ضرور واقف ہو۔ کیوں کہ اُن کے افسانے موضوع اور اُسلوب کے اعتبار سے ذمہ دار قاری کا تقاضا کرتے ہیں۔ حسن کاری، سحر انگیزی، کلاسیکی اُسلوب، فکری ارتکاز، روایت کا احترام، عصری شعور، حقیقت پسندی، مشاہدے کی گہرائی اور فنی پختگی عطیہ سید کے افسانوں کے نمایاں اوصاف ہیں۔ ان کے افسانوں کی فنی ترتیب کے حوالے سے میں یہ بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ وہ اپنے افسانوں کے پلاٹ بالعموم سادہ رکھتی ہیں لیکن اس سادگی میں بھی منطقی ربط و تسلسل کی وجہ سے "کہانی پن" کا مجموعی تاثر خاصا مضبوط رہتا ہے عطیہ سید پلاٹ کی فنی ترتیب کو عزیز رکھتی ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں پلاٹ کے دیگر اجزاء اُلجھاؤ، تحیر زائی، ابہام اور معکوسیت (REVERSAL) کا شعور بھی احسن طریقے سے ملتا ہے۔ اُردو افسانے میں علامت نگاری، تصوریت، وجودیت، تجریدیت شعور کی رو اور سرئیلزم جیسی تحریکوں نے ہمارے نئے اور پرانے لکھنے والوں کو بڑا متاثر کیا ہے۔ عطیہ سید نے بھی یقیناً ان کا مطالعہ کیا ہوگا لیکن کتنی خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے اپنے فنی سفر میں اِن سے محض زادِ راہ کا کام لیا ہے، منزل نہیں بنایا۔

نکہت مرزا بھی اچھے اور خوبصورت افسانے لکھ رہی ہیں۔ اُن کا حالیہ افسانہ "بیت العنکبوت" کا موضوع مشرقی اقدار کی زوال پذیری ہے اس افسانے میں شناخت کا بحران جس شدت سے اُبھرتا ہے، اُسے ہر حساس قاری بآسانی محسوس کر سکتا ہے۔ تقسیم کے موضوع پر گلزار کا افسانہ "راوی پار" پڑھ کر دل افسردہ ہو گیا۔ "تقسیم" ہمارے ادب کا بڑا نازک موضوع ہے۔ اِس پر اتنا کچھ لکھا جانے کے باوجود بھی گنجائش موجود ہے۔ اُردو کے کئی معروف افسانہ نگاروں نے اس پر بڑا وقیع کام کیا ہے۔ ان میں رامانند ساگر، حیات اللہ انصاری، عزیز احمد، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، قدرت اللہ شہاب اور اشفاق احمد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اِس حوالے سے اور بھی بیسیوں نام گنوائے جا سکتے ہیں لیکن انہیں صرف اس لیے چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان کے افسانے یا تو تخلیقی صداقت سے عاری ہیں یا پھر محض سستی جذباتیت کے نمونے۔ گلزار نے "راوی پار" لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب بھی اِس موضوع پر لکھنے کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ اِس افسانے کو بلا شبہ "کالی رات"[1]، "یا خدا"[2]، "بھاگ ان بردہ فروشوں سے"[3]، "شکر گزار آنکھیں"[4]، "گڈریا"[5]، "لاجونتی"[6] اور "پرمیشر سنگھ"[7] جیسے اہم افسانوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ محمد الیاس کا افسانہ "قفس" جس خوش اُسلوبی سے "حضرت صاحب" کے فضائل و کمالات کی نقاب کشائی کرتا ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔ موجودہ عہد کے تناظر میں تجریدی افسانے لکھنے سے بہتر ہے کہ کہانی فکشن کے ذریعے اپنے اصلی مسائل کی نشاندہی کرے۔ یہ بھی اپنی جگہ بہت بڑا جہاد ہے۔ ہمارے موجودہ حالات اِس قابل نہیں ہیں کہ ادب کو محض ذہنی عیاشی کا ذریعہ بنائیں۔

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "عاجز بندہ" ایک ایسے احساس کی پیداوار ہے جس کا خمیر انسانیت، محبت اور نرمی سے پیدا ہوتا ہے۔ مرکزی کردار کی نفسیات کا گہرا مطالعہ پڑھنے والے کو بڑا متاثر کرتا ہے۔ "چائے کی پیالی" میں نیلم احمد بشیر نے جس کردار کو

---

[1] عزیز احمد، [2] قدرت اللہ شہاب، [3] رامانند ساگر،
[4] حیات اللہ انصاری، [5] اشفاق احمد، [6] راجندر سنگھ بیدی،
[7] احمد ندیم قاسمی،

متعارف کرایا ہے وہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ عبرت آموز بھی ہے۔ یہ افسانہ پڑھ کر بڑا لطف آیا۔ اس افسانے کے اختتام سے کچھ دیر پہلے معاً یہ خیال ذہن میں آیا کہ شاید کہانی میں کوئی ڈرامائی موڑ آجائے اور کوئی تیسرا شخص بطور چور کے سامنے آئے۔ لیکن "شازی" کی طرح مجھے بھی حیرت ہوئی کہ "خالد انجم"، ایک شاطر عاشق ہونے کے علاوہ ایک منتی چور بھی ہے۔ اس کہانی کے مرکزی کردار خالد انجم نے عشق اور چوری دونوں میں قابلِ رشک ہاتھ کی صفائی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مسرت لغاری، فرحت پروین محمد سعید شیخ اور سیما پیرزدہ کے افسانے بھی خوب تھے۔

اس دفعہ کے شمارے میں حسبِ معمول آزاد نظموں اور غزلوں کا ایک خوبصورت انتخاب شامل تھا جسے پڑھ کر میں نے باری باری تمام شعرائے کرام کو غائبانہ داد دی۔ ویسے "فنون" کا حصۂ نظم ایک طرح سے مشاعرے ہی کا درجہ رکھتا ہے جس میں قاری نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے باری باری تمام شعراء کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنا اپنا کلام بلاغت نظام پیش کریں۔ اس مشاعرے کی نوعیت قدرے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں کلام شاعر بزبانِ شاعر کے برعکس کلام شاعر بزبانِ قاری ادا ہوتا ہے۔ سید مبارک شاہ کی نظم "دستک"، اپنے بے ساختہ پن، تازگی اور گہرائی کی وجہ سے بے حد پسند آئی۔

ڈاکٹر شارب ردولوی کا جامع مقالہ "کم سخن، کم گو، کم آمیز شاعر۔ جذبی"، بڑا پسند آیا۔ ترقی پسند غزل کے عناصرِ خمسہ میں فیض، مجروح، تاباں اور جاں نثار کے ساتھ جذبی کو بھی اہم اور منفرد مقام حاصل ہے۔ جذبی نے ترقی پسند تحریک کے نام پر محض نعرہ بازی نہیں کی بلکہ بڑے متوازن انداز سے اپنے شعری اور فکری سفر کو جاری رکھا۔ مشکور حسین یاد کا انشائیہ "غیر ذات کی رعنائی" میں نے بہت دفعہ پڑھا۔ میری ہر نئی قرأت نے اس انشائیے میں چھپے نئے نئے معنوں کو دریافت کیا۔ صنفِ انشائیہ پر اختلافی مباحث کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ شاید یہ مسئلہ مزید طول کھینچے گا۔ موئیدین اور منکرین اس صنف پر مقدور بھر کام کرنے کے بعد اُردو نقادوں کو یہ کہتے ہوئے سبکدوش ہو گئے کہ

ہم سے جو ہو سکا وہ کر گزرے
اب ترا امتحان ہے پیارے (جگر)

اور ادھر انشائیے کی حالت یہ ہے کہ وہ بار بار رحم طلب نظروں سے نقادوں کی طرف دیکھتا ہے اور با آوازِ بلند مجاز کے اس شعر کا وِرد کرتا جاتا ہے۔

نہیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا
بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں

میرے خیال میں اس صنف پر زیادہ سے زیادہ کام ہونا چاہیئے۔ آہستہ آہستہ اس کے خدوخال کا تعین بھی ہوتا جائے گا۔ انشائیے کی قرأت اور اس سے لطف اندوز ہونے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ قاری پہلے انشائیہ نگار کے بارے میں ہر قسم کے تعصبات کو اپنے ذہن سے باہر نکالے اور پھر پورے خلوص سے انشائیے کا مطالعہ کرے۔ انشائیہ میں قوت اور توانائی موجود ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام نقاد ذاتی پرخاش سے بلند ہو کر اس صنف کے دامن کو وسیع کریں۔

منصورہ احمد کا زیرِ طبع مجموعہ "گداز"، عنقریب منظرِ عام پر آنے والا ہوگا۔ میری طرح اور بھی بہت سے احباب اس کے انتظار میں ہیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ منصورہ نے آزاد نظم میں اپنا ایک منفرد مقام بنالیا ہے۔ "فنون"، میں شائع ہونے والی ان کی بیشتر نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد میری رائے یہ ہے کہ منصورہ احمد کی نظموں کا داخلی اور خارجی منظرنامہ معاشرے کی زندہ قدروں

اور رویوں سے مواد حاصل کرتا ہے۔ انہوں نے محض تخیل کی بلند پروازی کو کام میں لاکر نظمیں تخلیق نہیں کیں بلکہ جو کچھ کہا ہے زندگی کو محسوس کرکے کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں مختلف فنی تجربات سے گزر کر بھی اظہار و ابلاغ کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ منصورہ احمد اپنی نظموں میں مجرد اور مشخص احساسات و تجربات کو تمثالوں (IMAGES) کے ذریعے سامنے لائی ہیں۔ یہ تمثالیں اتنی جاندار اور واضح ہوتی ہیں کہ فکر و احساس کی ایک ایک لہر اپنے انفرادی نقش و نگار رکھنے کے باوجود ارتباطِ مضمون اور وحدتِ تاثر کو کمزور نہیں ہونے دیتیں۔

احمد ظفر، گلزار، افتخار عارف، یوسف حسن، سلیم کوثر، خالد احمد، ریحانہ روحی، سید مبارک شاہ، ثمینہ راجا، ایوب خاور، سید آمنہ بہار رونا، شعیب آفریدی، عرشی زادہ اور احمد ندیم قاسمی کی نظمیں بھی توجہ سے پڑھیں۔ کشمیر کے تناظر میں چار نظمیں بہت عمدہ تھیں۔ پروفیسر افتخار مغل صاحب اپنے توانا قلم سے بھرپور کام لے رہے ہیں۔

حصہ غزل میں آصف ثاقب، ضیاء الدین ضیاء، اوپندر ناتھ اشک، محب عارفی، آفتاب اقبال شمیم، ظفر اقبال، انور شعور، جون ایلیا، شبنم شکیل، ادا جعفری، اختر ہوشیار پوری، پروین کمار اشک، غلام حسین ساجد، خالد اقبال یاسر، حسن عباس رضا، و۔ سنبل، نجیب احمد، خالد احمد، انیل چوہان، سعود عثمانی اور احمد ندیم قاسمی کا کلام تازگی اور شعریت سے بھرپور تھا۔

شعیب آفریدی اِن دنوں اشاعات میں نظر نہیں آرہے۔ استاذِ گرامی پروفیسر صوفی عبدالرشید صاحب کی غیر حاضری بھی خاصی طویل ہو گئی ہے۔ سہ ماہی "صحیفہ" میں ان کے تحقیقی اور تنقیدی مقالات نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ پروفیسر موصوف ایک وسیع المطالعہ شخص ہیں۔ اُردو، ہندی، فارسی، انگریزی اور عربی ادبیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ایبٹ آباد شہر میں ہم جیسے طالب علموں کے لیے ان کا دم غنیمت ہے۔ خدا نے ان کو جہاں بے شمار خصوصیات سے نوازا ہے وہاں ایک خاص وصف ان کا طبعی انکسار ہے۔ ان کے پاس آنے والا ہر شخص ان کی عالمانہ بصیرت سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی خوش خلقی کا بھی گہرا اثر قبول کرتا ہے۔

گزشتہ شمارے میں آصف ثاقب صاحب نے پروفیسر یحییٰ خالد، ارشاد شاکر، صدیق منظر، ریاض ساغر اور سلطان سکون وغیرہ کا ذکر بھی کیا تھا۔ پروفیسر یحییٰ خالد ان دنوں ہندکو ادب کی ترویج و ترقی میں سرگرم عمل ہیں۔ یہی حال سلطان سکون کا بھی ہے حال میں سکون صاحب کی نئی ہندکو کتاب "کاری دی گل" (کام کی بات) منظرِ عام پر آئی ہے۔ ہندکو لوک ادب میں یہ کتاب ایک اہم اضافہ ہے۔

عامر سہیل

ایبٹ آباد (ہزارہ)

ایک بار پھر "فنون" نے بڑی راہ دکھائی اور ایک بار پھر "فنون" کی خاص بات اس کا حصۂ غزل تھا۔ فنون ۳۵ کی تینوں غزلیں اوّل تا آخر "بے پناہ" ثابت ہوئیں۔

۱: کوئی ہے جو آنکھ اُٹھا سکے مرے خوش جمال کے سامنے (ندیم)

۲: عشق کی جنت جگانے میں بڑی دیر لگی (عباس تابش)

۳: نئے سوار ہیں، پر حوصلے پرانے ہیں (آصف ثاقب)

علاوہ ازیں محب عارفی، سعید قیس، آفتاب اقبال شمیم، خالد احمد، ایوب خاور، جلیل عالی، خالد اقبال یاسر،

و سنبل، حسن عباس رضا، پروین کمار اشک اور سعود عثمانی کی غزلیات میں ایک سے زیادہ اچھے اشعار تھے جنہوں نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ایوب خاور کی غزلوں میں کچھ مصرعے اچھے تھے لیکن، پتہ نہیں کیوں، ان کی غزل کا رنگ جما نہیں، خالد احمد کی غزل اپنے موضوعی مزاج کے باوجود خوبصورت رنگ رکھتی تھی۔ اختر ضیائی کی دونوں غزلوں (بالخصوص ان کے مقطعوں) کی یکسانیت کافی کھٹکتی ہے اور پروفیسر محمد افضل کی "خواب پرانے"، "ہجراں"، "معیار رضا"، اور "دوانے"، جیسی "فراز زدہ" تراکیب والفاظ نے اُن کا اپنا رنگ جمنے نہیں دیا۔

ندیم کی یہ غزل (کوئی ہے جو آنکھ اٹھا سکے .....) اُن کے شعری مزاج کی نمائندہ تخلیق کہی جا سکتی ہے۔ وہی ندیم کا الوہی لہجہ۔ وہی زمین کی سطح سے اوپر اُٹھتے اور اٹھاتے ہوئے مضامین ـــــ وہی پیغمبرانہ نگہداری ـــــ وہی کائنات اور خالقِ کائنات سے مکالمہ ـــــ وہی شیئت کی ـــــ لاشیئت اور لاشیئت کی شیئت کی طرف کروٹیں!

میں افسانوں اور نظموں میں جس صنعتی ادراک، عصری شعور اور حسیتِ جدید کی بات کیا کرتا ہوں وہ اس بار غزل میں بھی (نمایاں طور پر) جھلکتی نظر آئی۔ چنانچہ انور شعور کی غزل میں ماحولیات اور افراطِ آبادی، اختر ضیائی کی غزلوں میں خلائی تسخیر، خالد اقبال یاسر، قیوم طاہر اور ادریس بابر کی غزلوں میں لمحۂ موجود کا سیاسی تشنج (بالخصوص پاکستان کے عروس البلاد، کراچی کے حوالے سے) واضح نظر آتا ہے۔ باقر نقوی کی غزل میں "GREEN.SIGNAL" کا ترجمہ (سبز اشارہ) بھی اسی جدید (لسانی) حسیت کا ثبوت ہے۔

نظموں میں احسان اکبر کی نظم "چمکدار ساعتوں کی تلاش" نے سب سے زیادہ "اپیل" کیا ہے۔ علاوہ ازیں گلزار کی نظم "دین گوگ کی زبانی"، شاہین کی نظم "سرخ لالٹین"، افتخار عارف کی نظم "یا سریع الرضا....."، یوسف حسن کی نظم "تابانیٔ امکاں"، اور سید مبارک شاہ کی نظم "دستک" نے اپنے ماحول، نشاط آمنہ ایلیا کی نظم "بود نبود"، اکبر عرشی زادہ کی نظم کوئی "قیامت کا خواب" اور یوسف حسن کی نظم "وصال" نے اپنی فارم اور لفظیات اور ثمینہ راجا کی نظم "چلو کشمیر چلتے ہیں"، ادیب سہیل کی نظم "اوہام کے اجالے"، ڈاکٹر اشرف عدیل کی نظم "کائنات"، اعجاز رضوی کی نظم "فیصلہ" اور شعیب آفریدی کی نظم "اپنی ابتدا سے بات" نے اپنے اپنے مضامین کے حسن کی بنا پر اپنی جانب توجہ مبذول کرائی۔

سیدہ آمنہ بہار رونا کی نظمیں "مسافر خیریت سے ہیں" اور "رواجا گتے موسم کا دکھ" اپنے خوبصورت عنوانات کے باوجود بے تاثیر رہیں۔ اوّل الذکر نظم مضامین کے انتشار اور مفہوم کے نامکمل "سرکٹ" کی بنا پر اور مؤخر الذکر اسی حد سے بڑھی ہوئی تخلیقی یکسانیت کی وجہ سے جسے ہماری شاعرات کی اکثریت "نسائی لہجہ" کہہ کر کلیجے سے لگائے ہوئے ہے اور جسے میں موضوع اور "اپروچ" کا "زنانہ پن" کہا کرتا ہوں۔

منصورہ احمد کی نظم "تلاش"، شاید مضمون کی طوالت یا خیال کی تکرار کی نذر ہو گئی۔ مشکل یہ ہے کہ اس بار مجھے منصورہ پر نہ تو غصہ آیا اور نہ فخر محسوس ہوا۔ ریحانہ روحی کی نظم "مشورہ" اپنے موضوع کی تمام تر شدت اور کٹیلے پن کے باوجود اپنے تاثر میں خاصی کُند اور "سیٹر لوپٹا تپ" رہی۔ ندیم کی نظم "ایک یادگار روزنامچہ" اپنے مواد کے سوندھے پن اور اپنی نسائی کلیت کی نوکلاسیکی "ٹریٹمنٹ" کی بنا پر منفرد رہی۔ چنانچہ تختی کے کچے رنگوں، کچی مٹی کی خوشبو، پھولوں کی قطاروں اور دمکتے ہوئے چہروں کی رواں ندی نے مل جل کر جو چھدری چھاؤں بنائی ذرا دیر اُس میں سستا لینے سے بڑی فرحت اور خنکی کا احساس ہوتا ہے لیکن اب کے ندیم صاحب کی غزل کی چکاچوند نے آنکھوں کو اتنا چندھیا دیا تھا کہ اتنی اچھی نظم کی لو بھی مدھم مدھم سی نظر آئی۔

اس دفعہ "فنون" میں ایک سے زیادہ چونکا دینے والی کہانیاں تھیں۔ مسعود مفتی کی "ٹائم ایکسپریس" کا "سفر" زیادہ خوشگوار

نہیں گزرا۔ علامتی افسانوں میں ابلاغ کا مسئلہ جوں کا توں موجود ہے اور یہ مسئلہ اِن کہانیوں کے کہانی پن نے بھی حل نہیں کیا بلکہ اب کہانی پن (یعنی ڈرامائیت) تو کہانی کا کوئی بڑا مسئلہ رہا ہی نہیں تاہم صورتِ واقعہ اپنی "کنکریٹ نس" کے مطالبے سے باز نہیں آئی۔ خیر اب، جبکہ ندیمؔ صاحب جیسے بڑے کہانی کار نے بھی "علامتیت" کو جائز قرار دینا شروع کر دیا ہے تو ہم جیسے طوطیوں کی آواز کون سنے گا۔

راوی پار، گلزار کے روایتی موضوع اور مواد کے باوجود بہت حیران کر دینے والی کہانی ثابت ہوئی۔ اس کہانی کو ایک مکمل کہانی نہ کہنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اس کہانی کی خوبی یہ ہے کہ اپنے کلائمکس پر یہ اپنی پوری شدت سے پڑھنے والے کو جھنجھوڑتی ہے لیکن جھنجھوڑنے کا یہ عمل محض ڈرامائی نہیں بلکہ اپنا مکمل واقعاتی جواز رکھتا ہے۔ یہ جواز محض واقعہ کا محتاج نہیں بلکہ صورت واقعہ کا نتیجہ ہے ـــــ وہ صورت واقعہ جو گلزار اکثر اپنے فنی خلوص کی تپسیا کے نتیجے میں تجسیم کرتے ہیں۔

نگہت مرزا "کا بیت العنکبوت" اس توجہ سے نہیں "بنایا گیا" جس کا متقاضی تھا۔ چنانچہ بہت سے کردار تصور کی سطح پر تو بہت تیزی سے ڈوبتے ابھرتے ہیں لیکن جو کہانی بناتے ہیں وہ خاصی بے ترتیب اور بے اثر ہے۔ "مما" "زیرک" اور "گانے والی" ـــــ تینوں کردار اپنے اپنے الگ الگ خدوخال بنانے میں ناکام رہے ہیں اور ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ واقعات اور صورتحال کا ذمہ دار آخر کون ہے۔ ویسے مسئلہ تو یہ بھی ہے کہ آخر اِس کہانی کا مسئلہ کیا ہے؟

مسرت لغاری کا افسانہ "ارزاں" اور سیما پرویز کا افسانہ "امانت" کافی کمزور افسانے ثابت ہوئے۔ لیکن نیلم احمد بشیر کی "پیاسی پیاس" تو اِن سے بھی زیادہ بے اثر رہی۔ خالد کے توسط سے نیلم نے اس کلاس کے لوگوں کے جس تضاد کو ابھارنا چاہا ہے وہ خود ایک تضاد بن گیا ہے ـــــ اتنا کمپوزڈ اور لٹریری آدمی ـــــ اس قدر پوچ اور سطحی! اس تضاد کو پورے تخلیقی جواز کے ساتھ "پینٹ" کرنے میں شاید کوئی کمی رہ گئی ہے۔ دوسری بات یہ کہ شازی حقیقت میں جس "ایسٹیبلشمنٹ" کا شکار ہوئی ہے وہ خود اِس کے بارے میں "کلیئر" نہیں ہے۔ اُسے اپنی وفاداری اور آبرومندی کے گہنا لٹنے کا تو افسوس نہیں لیکن جیولری سیٹ سے ہاتھ دھو لینے کا بے حد افسوس ہے۔ بہرحال اِس کہانی کے مکالمے بہت چست اور برجستہ ہیں۔

فنون ۴۵-۴۶ کی تین اچھی کہانیوں میں سے ایک محمد الیاس کی کہانی "قفس" ہے۔ اِسے ایک مکمل تاثر کی حامل کہانی کہا جا سکتا ہے۔ یہ کہانی جس تضاد کو ہمارے لاشعور سے ابھار کر شعور تک لاتی ہے، وہ اپنے مدھم رنگوں اور سادہ ترتیب کے باوجود اپنے مجموعی تاثر میں بہت شوخ، بہت تیکھا ہے۔

فرحت پروین کا افسانہ "گردِ راہ" اپنی جذباتی اور واقعاتی جزئیات نگاری کی بنا پر کامیاب رہا تاہم اِس کہانی کو پڑھ کر ندیمؔ صاحب کی کہانی "سفارش" یاد آجاتی ہے! نہ جانے کیوں!

محمد سعید شیخ کی کہانی "سولی" محاکاتی تفصیل پسندی ـ بلکہ طوالت کا شکار ہو گئی۔ میری رائے میں یہ کہانی "زینت نے پورے خلوص سے اپنے بچے کی طبعی موت کی دعائیں مانگیں" سے شروع ہونی چاہیئے تھی اور۔۔۔۔ "اس کی دعا منظور ہو چکی تھی" پر ختم ہو جانی چاہیئے تھی۔ باقی ساری باتیں جو افسانہ نگار کے وعظ و نصیحت کی صورت میں سامنے آئی ہیں، قارئین کی تخئیلی صوابدید پر چھوڑ دینی چاہیئے تھی۔

ندیم صاحب کا افسانہ "عاجز بندہ" اِس قابل ہے کہ اس پر الگ سے ایک مضمون لکھا جائے۔ یہ کہانی اعتقادات، طبقاتی شعور، واقعہ نگاری اور سیرت نگاری کی جن انتہاؤں کو چھوتی ہے اور اِن انتہاؤں کے ذریعے "کہے اور ان کہے" کے درمیان جو پل بناتی ہے وہ اتنا بڑا موضوع ہے کہ چند سطروں اور چند صفحوں میں اس پہ بات ہی نہیں مکمل ہو سکتی ہے۔ صرف اس کی زبان کی طرف تھوڑی سی توجہ مبذول کراؤں گا۔

مجھے یہ افسانہ (فنِ افسانہ نگاری کے تمام تر کمالات کے علاوہ) اپنے لاثانی اسلوب میں ایک خوبصورت نظم کی طرح محسوس ہوا،

اس کی سطروں میں چیزیں کروٹ لیتی ہوئی، جاگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس کے جملوں کی چمک کسی نظم کے مصرعوں کی طرح آنکھوں کو خیرہ کرتی محسوس ہوتی ہے۔ چند جملے دیکھیے۔

- "وہ ستارے کو یوں پیار سے دیکھنے لگا جیسے اپنے مولا سے اس کی ملاقات ہو گئی ہے۔"
- "تم کہاں چھپ جاتے ہو؟ یہ دوستی تو نہ ہوئی نا، کہ میں تمہاری عیادت ہی میں سارا آسمان گھوم آؤں اور تم کہیں نظر ہی نہ آؤ۔"
- "اب نظر آئے ہو تو آتے رہنا ورنہ مجھے نیند نہیں آئے گی اور مجھے نیند نہ آئی تو تمہیں دیکھ دیکھ کر تھکا دوں گا۔"
- "وہ میرے کوٹھے کی آدھی چھت گرانے کے بعد بجلی چمکاتا ہے کہ دیکھ لے اپنے گھر کا ملبہ، واہ رے میرے مولا۔"
- "جب میاں حنیف مسجد پہنچا تو بجلی ہزار بجلیوں کی طرح چمکی اور بادل اس زور سے کڑکا کہ فضا دیر تک لرزتی رہی۔"
- "اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولا "کیا تجھے بہت غصہ آ رہا ہے اس عاجز بندے پر میرے مولا! ...... اس کی چھت تو تیری بارشوں نے برابر کر دی۔ اب تیرا بادل کیوں دھاڑ رہا ہے؟"
- "تو نے اکٹھا چار ستارے کیوں بھیج دیئے مجھے منانے کو۔ میں عاجز بندہ تو عمر بھر تیرے ایک ہی ستارے سے بہلا رہا ہوں۔"

مقالات میں رشید ملک کا مضمون "المالزی" اور الیاس عشقی کا مقالہ "ابوالعلامعری کا رسالۂ غفران" بہت معلومات افزا رہے۔ عشقی صاحب کے اس مقالے کے ذریعے اس "صاحب غفران ولزومات" کی اس معرکتہ الآرا اور مشہور و معروف تصنیف کے حوالے سے قابلِ قدر معلومات حاصل ہوئیں۔

"فن اور فن کار" کے ذیل میں ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون "افتخار عارف کا فن" اس صاحبِ توفیق شاعر کے منہاج فن کو سمجھنے کے لیے ایک خوبصورت تحریر تھی۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اخلاف توقع اس مقالے میں اپنا تنقیدی اسلوب نفسیاتی کی بجائے تاثراتی اور تحقیقی رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بالکل بجا لکھا ہے کہ ہم جس "عہد کلیات" میں جی رہے ہیں اور جس میں شاعری لکھنے کی "میراتھن ریس" لگی ہوئی ہے اس میں شعری مجموعوں کا وزن شعرا کے اپنے وزن سے بھی بڑھ جاتا ہے لیکن کتنے لوگ ہیں جو محض بند کی سطح سے اوپر اٹھ سکتے ہیں؟ اس "ٹریش نگاری" کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ درجنوں کتابیں لکھ مارنے کے باوجود ایک مصرعۂ مقبول ——— ایک حرفِ بر لب، کے لیے ترستے ہیں۔ شعر سازی کا نقار خانہ چل رہا ہے جس میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ڈاکٹر خورشید رضوی نے کیا خوبصورت بات کہی ہے۔

میں عمیق تھا کہ پلا ہوا تھا سکوت میں ۔۔۔ یہ جو لوگ محوِ کلام ہیں، مجھے کھا گئے

محمد کبیر خان کی تخلیق "آبا" اپنی بنت کے اعتبار سے افسانے سے زیادہ قریب نظر آتی ہے لیکن غالباً ہلکے پھلکے اسلوب کی بنا پر اسے خاکہ سمجھ کر الگ موضوع یعنی "شخصیت" کے ذیل میں درج کیا گیا ہے لیکن میرے خیال میں یہ خاکہ بہرحال نہیں ہے یہ التباس غالباً کبیر خان کی ایک اور تحریر "ڈنگی بے جی" سے مماثلت کی بنا پر ہوا جو فنون کے ہی ایک گذشتہ شمارے میں شائع ہوئی تھی لیکن ——— میرا خیال ہے یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔

"خطوط/ملاقات" میں عامر سہیل، آصف ثاقب اور خاور نقوی کی تحریریں اچھی لگیں۔

افتخار مغل
چکار (آزاد کشمیر)

نومبر، دسمبر ۱۹۹۴ء کا شمارہ (۴۴) جولائی ۱۹۹۵ء میں دیکھنے کو ملا۔ شاید اس لیے کہ میں وطن سے دور بیٹھا ہوں اور شاید اس لیے بھی کہ "فنون" کا "انداز خرام" کچھ ایسا ہی ہے۔

مضامین میں رشید ملک کے سلسلہ وار مقالے "انڈالوجی" کی اہمیت اپنی جگہ مگر اب کے الیاس عشقی کے مقالے

"ابوالعلاء معری" کا رسالۃ الغفران میرے لیے ایک نعمت ثابت ہوا۔ اس سے پہلے میں محمد کاظم کے ان زندہ جاوید مقالات کا مطالعہ کر چکا ہوں جو دیگر کلاسیکل عرب شعراء کے علاوہ معری کے شعر و فن کے بارے میں بھی لکھی گئی بھاری بھاری کتابوں پہ بھی بھاری نکلے تھے۔ الیاس عشقی کا مقالہ اسی خوبصورت سلسلے کی ایک کڑی ہے کہ اس میں معری کی صرف ایک تصنیف کو موضوع بنایا گیا ہے۔ الیاس عشقی کہیں آس پاس ہوں تو ان کی خدمت میں اس دور افتادہ کا آداب پہنچا دیجیے گا۔ ہندی پر بھی ڈاکٹر شارب ردولوی کا مضمون بھی عمدہ ہے۔ رشید قیصرانی کے دوہوں پر عرش صدیقی کا مقالہ بھی بڑی محنت سے لکھا گیا ہے۔ مگر میری بدقسمتی دیکھیے کہ میں نے قیصرانی کے دوہے صرف اس مقالے میں پڑھے ہیں۔ فخر الدین بلّے مرتضیٰ برلاس کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے کہیں کہیں غیر ضروری مبالغہ آرائی کے شکار ہو گئے ہیں۔ برلاس اچھے شاعر ہیں مگر معلوم ہوتا ہے بلّے صاحب کے پیش نظر تنقید و تحسین کے علاوہ دوستی بھی یقیناً ہو گی۔ بہرحال یہ مضمون معلومات افزا ہے۔ امجد علی شاکر نے نقاد فتح محمد ملک کی کتاب "فیض، شاعری اور سیاست" پر متوازن تبصرہ کیا ہے۔ افتخار عارف کی شاعری پر ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مضمون کو گہرائی میں نہیں جانے دیا۔ رئیس امروہوی مرحوم نے شاہین کی شاعری پر مضمون کیا لکھا، بٹر شکیٹ جاری کیا۔ البتہ سعید انجم نے سائیں سچا کے ساتھ اور غافر شہزاد نے اعجاز رضوی کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

مسعود مفتی نے خلاف عادت ایک طویل علامتی افسانہ لکھا ہے مگر یہ علامت اتنی واضح ہے کہ پوری ایک صدی کی تاریخ زندہ ہو جاتی ہے۔ گلزار کے افسانہ "راوی پار" نے لرزا دیا ہے۔ اتنے مختصر افسانے میں اتنے بھرپور تاثر کی مثالیں کم ہیں۔ فرحت پروین نے "گرداب" کے مرکزی کردار "بیں" کے مزاج و کردار پر نہایت درجہ مؤثر طنز کیا ہے۔ اس "بیں" کی ہمدردی اور نمائش کے ہدف لڑکے کا کردار ایک زندہ کردار ہے۔ نکہت مرزا، مسرت لغاری، محمد سعید شیخ، نسیم احمد بشیر اور محمد الیاس کے افسانے بھی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ رہا مدیر "فنون" کا افسانہ "عاجز بندہ" تو یہ افسانہ تو ایک طرح سے ایک مکمل "نثری نظم" ہے۔ مشکور حسین یاد کا انشائیہ اب کے کچھ زیادہ ہی عمیق ہو گیا ہے۔ ایک بار پھر پڑھوں گا۔ محمد کبیر خان کے لکھے ہوئے شخصی خاکے "ابا" سے مجھے انہی کا ایک اور یادگار اور لافانی شخصی خاکہ "نکی بے جی" یاد آ گیا، مگر "ابا"، "نکی بے جی" کے ہم پلہ نہیں ہو سکا۔

نظموں اور غزلوں کا انتخاب حسب معمول لاجواب ہے۔ میں نظموں میں بطور خاص منصورہ احمد، جاوید انور، سید مبارک شاہ نسیم سید، افتخار مغل اور ریحانہ روحی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ان کی نظمیں جدید اردو شاعری کی کامیاب ترین نمائندہ ہیں منصورہ احمد نے "تلاش" میں اپنے فن کے اونچے معیاروں کو کچھ اور اونچا کر دکھایا ہے۔ وہی سادگی اور سلاست ہے جو ان کی نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ مگر اس سادگی میں بھی زندگی کی گمبھیر حقیقتیں پوری سچائی کے ساتھ صف آرا ہیں۔ اس نظم کے چار ادوار ہیں جن میں انسانی زندگی کی چار منازل سمٹ آئی ہیں۔ اور پھر وہ "نشتر" قسم کی لائنیں جو ضرب المثل بن سکتی ہیں صرف ایک مثال کافی ہو گی۔

عجب سی جستجو ہے جس میں ہر پل
ریت مٹھی سے پھسلتی جا رہی ہے

نہ اضافت بازی، نہ لفاظی ——— سچی، کھری، باشعور اور جرأت مندانہ شاعری منصورہ احمد کے فن کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ دوسرے نظم نگاروں نے بھی اپنی تخلیقات میں اپنے کمالِ فن کے ثبوت مہیا کیے ہیں اس ضمن میں سید مبارک شاہ خاص داد کے مستحق ہیں۔

غزلوں میں مجھے بھی غزلیں اچھی لگیں۔ ان کے اشعار دہرانے کو جی چاہتا ہے مگر آپ انتخاب چھاپتے ہی نہیں، قلمزد کر دیتے ہیں۔ خود آپ کی نظم اور غزل کے بارے میں بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر آپ اس معاملے میں بھی "خست" برتتے ہیں۔ اور بیشتر تحریں کاٹ دیتے ہیں۔ اس لیے کچھ عرض کرنے کا فائدہ ؟

میں نے "اختلافات" کی "سویٹ ڈش" آخر میں استعمال کی۔ ہر شمارے کا یہ حصہ میرا استاد اور رہنما ہے اب کے ایبٹ آباد کے عامر سہیل کی آراء نے حد درجہ متاثر کیا۔ وہ اس سے پہلے بھی متاثر کرتے رہے ہیں۔ مگر اس بار ان کا تجزیہ اتنا عالمانہ اور فن کارانہ ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ وہ حوصلہ مند نقاد معلوم ہوتے ہیں کہ وہ اب کے محمد ارشاد کے سنے دیوار پر حملہ آور ہو گئے ہیں محمد ارشاد مناسب سمجھیں گے تو اس کا جواب دیں گے مگر عامر سہیل کی جرأت مندی اپنی جگہ۔ میں آصف ثاقب کو اردو کے معدودے چند ماہرین عروض میں شمار کرتا ہوں اور انہوں نے اب کے بھی "اختلافات" میں اپنی اس مہارت کے ثبوت فراہم کر دیئے ہیں۔ (حیرت ہے کہ ایک ماہر عروض ایک اچھا شاعر بھی ہے !) ایمسٹرڈیم کے فاروق خالد نے فنون ۴۳ کے حرفِ اول پہ معترض ہو کر فارسی کے اس مصرعے کو صحیح کر دکھایا ہے کہ :

سخن شناس نہ دلبرا، خطا ایں جاست

ان صاحب میں "سخن شناسی" کی شدید کمی معلوم ہوتی ہے۔ وہ بے چارے آپ کے اداریے کو سمجھے ہی نہیں۔ بس اسلام کے نام سے بھڑک اٹھے مگر ایمسٹرڈیم میں سکونت کا یہ مطلب تو نہیں ہونا چاہیئے۔ خاور نقوی کی "اختلافاتی" تحریریں بہت معیاری ہوتی ہے۔

اور اب یہ بتلایئے کہ جنوری فروری ۱۹۹۵ء کا "فنون" کیا جنوری فروری ۱۹۹۶ء میں نکلے گا ؟

امتیاز علی خان (شارجہ)

سید فخر الدین بلے کے مضمون "مرتضیٰ برلاس آئینۂ تخلیق میں" میں حقیقت پسندانہ تجزیئے پر تاثراتی عنصر غالب نظر آیا۔ امجد علی شاکر کا مضمون "فیض۔ شاعری اور سیاست" دیگر حوالوں کے علاوہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے۔ کہ جن لوگوں نے فتح محمد ملک کی کتاب "فیض۔ شاعری اور سیاست" نہیں پڑھی۔ انہیں اس مضمون سے فیض کے فکر و فن کے بارے میں چند اہم پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہو سکتی ہے۔

افتخار عارف کی نظم "یا سریع الرضا اغفرلمن لا یملک الا الدعا" ان کے وسیع مطالعے اور تخلیقی قوت کی غماز ہے۔ منصور احمد کی نظم "تلاش" میں اپنے ہدف کو پانے کا کرب بھرپور تخلیقی مہارت کے ساتھ نمایاں ہے۔ ثمینہ راجہ کی نظم "چلو کشمیر چلتے ہیں" اور افتخار مغل کی نظم "سری نگر سے ایک کہانی چلتی ہے" میں سوز و گداز اور درد کی ایک مسلسل رو بہتی دکھائی دیتی ہے۔

سعید قیس، آفتاب اقبال شمیم، شوکت ہاشمی اور عباس تابش کی غزلیں بھرپور تاثر کی حامل ہیں۔ انور شعور کی دوسری غزل حالات و واقعات کی بے ترتیبی کی دلگداز داستان پیش کرتی ہے۔ رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ نے غزل کو ایک شدید المناک صورتِ حال کا مرقع بنا دیا ہے۔

جہاں اب صرف دن ہے اور دن کا شور و ہنگامہ
یہاں اِک رات تھی پہلے یہاں اک خواب تھا پہلے

خالد احمد کی غزل میں کراچی کے سانحے کا شدید کرب تخلیقی قوت کے ساتھ ابھرتا نظر آتا ہے۔
احمد ندیم قاسمی کے سدابہار فن نے حسب معمول متاثر کیا۔ فنون میں تین اصناف نظم، غزل اور افسانے میں ان کے فن کی نمود نے اپنی تازگی اور جوانی کی دلیل بن کر خوشگوار حیرت کو جنم دیا ہے۔ ان کا اپنا ہی شعر قاری کے اس تحیر کا جواب پیش کرتا ہے۔

نہ میں اپنے آپ کو پا سکا، نہ میں شش جہت میں سما سکا
کہ یہ کائنات ہے۔ ایک نقطہ، مرے خیال کے سامنے

مسعود مفتی کا افسانہ "ٹائم ایکسپریس"، علامتی انداز میں تحریک پاکستان کے پس منظر میں قومی المیوں کا عکاس ہے جو قوم تاریخ سے سبق حاصل نہ کرتے ہوئے خود غرضی اور مفاد پرستی کے جال میں پھنس جاتے، اس کا کیا انجام ہوتا ہے یہ سوال اسی افسانے کی بنیاد بنتا ہے۔ گلزار کے افسانے "راوی پار" میں قیام پاکستان کے حوالے سے ہجرت کے خونچکاں واقعات کی ایک مؤثر جھلک ملتی ہے۔ ایسی جھلک جس میں ایک پورے عہد کا المیہ موجود ہے۔ سیما پیروز کا افسانہ "امانت" عورت کی وسیع النظری اور ایثار پیشگی کو فنی چابکدستی کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔ اس افسانے میں صفیہ کے کردار کی پیش کش میں فنی مہارت سے کام لیا گیا ہے۔ نیلم احمد بشیر کا افسانہ "جاتے کی پیاس"، جنس کو ایک نئے زاویئے سے سامنے لاتا ہے۔ جدید نسل کی جنسی جذباتیت اور گلیمر پر مرٹنے کا رجحان اس افسانے کا مرکزہ دکھائی دیتا ہے۔ غیر متوقع انجام نے اس افسانے کو اعتبار بخشا ہے۔
احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "عاجز بندہ"، میاں حنیف کی سادگی، بھولپن۔ خدا پر بھروسے اور توکل کی عمدہ مثال ہے۔ اس افسانے میں ندیم صاحب نے کردار نگاری میں فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ میاں حنیف اپنے اکلوتے کوٹھے کی چھت بیٹھ جانے پر خدا سے شکوہ کرتا ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسے اس کی رحمت اور مہربانی کا خیال آتا ہے اور وہ اپنے رویے پر پچھتاتا ہے۔ وہ اس قدر صاف باطن ہے۔ کہ "مگھ" سے نظر آنے والا ایک ستارہ اسے قرب خداوندی کا وسیلہ دکھائی دیتا ہے۔ کوٹھے کی چھت گرنے کے بعد مسجد کے حجرے میں مقیم ہے۔ مگر اس کی روحانی طمانیت میں کمی نہیں آتی۔ اس افسانے سے خود بخود ان لوگوں کے رویے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جو عالیشان مکانوں میں رہ کر اور مرغن غذائیں کھا کر بھی تقدیر کے شکوہ سنج رہتے ہیں۔ یوں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ عدم اطمینان کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔ بین السطور موازنے کی یہ چابکدستی ندیم صاحب کے دیگر افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ جو ان کے فن کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ اس افسانے میں "مگھ"، "سکاد"، منگرا اور روٹ جیسے الفاظ کا استعمال ندیم صاحب کی زباندانی اور تخلیقی صلاحیت کا آئینہ دار ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ پاکستانی زبانوں کے ایسے ہی الفاظ اردو افسانے کی فضا میں گھل مل کر وطن عزیز کی مٹی کی خوشبو کا احساس دلاتے ہیں۔ کہانی کی بنت اور کردار نگاری کے ساتھ ثقافت کی عکاسی اس افسانے کا ایک اور نمایاں عنصر ہے۔
اس شمارے میں یوسف حسن اپنی تخلیقی توانائی کے ساتھ نظم کے حصے میں نظر آئے۔ تاہم اختلافات کے حصے میں ان کی آراء نہ پا کر تشنگی کا احساس ہوا۔

خاور نقوی (اسلام آباد)

تبصرے

یوسف حسن، احمد ندیم قاسمی

بان کا لمحہ (افسانے)

مصنفہ: شمع خالد　　　　قیمت: ۷۵ روپے

ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

گزشتہ دو اڑھائی عشروں میں پاکستانی سماج میں بورژوا جدید کاری، کاروباریت اور اصرافیت میں پہلے کے مقابلے میں
صا اضافہ ہوا ہے۔ اور اسی عرصے میں گھر سے باہر تعلیمی، دفتری اور دوسرے شعبوں میں خواتین کی شرکت بھی نسبتاً بڑھ چکی ہے۔ اور اس کے
ا ہر ادب وفن میں بھی نظر آتے ہیں۔ شمع خالد نے آٹھویں عشرے میں جب افسانہ نگاری شروع کی تو پاکستانی سماج میں ان تبدیلیوں کے
اتھ ساتھ پاکستانی ادب میں ایک نمایاں تغیر آچکا تھا اور یہ تغیر جدیدیت کا زور ٹوٹنے اور ترقی پسندی کے رومانی یا حقیقت پسندانہ
ریق کار سے تخلیقی اور تنقیدی دونوں سطحوں پر مربوط ہونے کا تھا۔ شمع خالد نے ان سماجی اور ادبی دونوں ہی تبدیلیوں کے اثرات قبول
لیے ہیں۔

"پتھریلے چہرے" (۱۹۸۲ء) کے بعد "گیان کا لمحہ" (۱۹۹۱ء) شمع خالد کے اردو افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جس میں ان کے اٹھائیس
سانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں زیادہ تر پاکستانی پنجاب کے عصری شہری درمیانی اور نچلے طبقوں اور ان طبقوں سے تعلق رکھنے
ا لے افراد کے اجتماعی اور انفرادی مسئلوں اور رویوں کو موضوع بنایا گیا ہے، جبکہ ان میں سے تقریباً نصف افسانوں کے مرکزی کردا
لماتین کے ہیں جن میں بیشتر خواتین درمیانے طبقے کی ملازمت پیشہ یا ملازمت کی امیدوار ہیں۔ ان اور دوسری شہری خواتین کو اندرو
انہ اور بیرونِ خانہ کیسی کیسی صورتِ حال اور کن کن خارجی و داخلی مسئلوں اور رویوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اور وہ ان سے کیسے
لپٹے نمٹتی ہیں، یہ ان افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔ یہ افسانے مجموعی طور پہ پنجابی شہری خواتین کی مجبوری اور بیداری دونوں ہی
ے ترجمان ہیں اور ان میں مردوں کے دوغلے پن کے ساتھ ساتھ خود بعض خواتین کی بے اعتدالیوں یا کمزوریوں پر بھی بالواسطہ تنقید موجود
ہے۔ ان افسانوں میں سے "نجات"، "سمجھوتا"، "رکھوالا" اور "سینڈ رڈ" بہت اچھے افسانے ہیں۔

دوسرے افسانوں میں متنوع موضوعات اور کردار ہیں۔ تاہم ان میں بھی زیادہ کردار اور ماحول شہر کے ہیں۔ ان میں سے "بندے کی موت"
ذر بھکاری" متاثر کرنے والے افسانے ہیں پہلے افسانے میں انفرادی شناخت کو اور دوسرے افسانے میں ایک ملازمت پیشہ کردار کی
ندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دو افسانے "اللہ دیاں اللہ جانے" اور "پیاس" دیہاتی پس منظر میں ہیں۔ "پہاڑ چلتے ہیں" نام کا افسانہ

فطرت اور انسان کے رشتے پر ایک نہایت خوبصورت افسانہ ہے جس کے آخر میں ایک بڑا پہلو دار سوال سامنے آتا ہے کہ کیا پہاڑ جو اتنے بلند اتنے پرشکوہ ہوتے ہیں۔ انھیں بھی زندگی کا تحفظ حاصل نہیں کیا وہ بھی ہماری طرح ؟" (ص ۱۹۴)

شمع خالد نے یوں تو دوسرے فنی طریقہ ہائے کار میں بھی چند ایک افسانے لکھے ہیں لیکن ان کے کامیاب اور زیادہ افسانے حقیقت نگاری کی جدید روایت میں ہیں اور ان میں سماجی اور نفسیاتی رویوں کو کرداروں کی تقریروں سے نہیں، ان کے عمل سے سامنے لایا گیا ہے۔ اور سادگی کے ساتھ گہری باتوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ تاہم کہیں کہیں سادہ لوحی کا بھی احساس ہوتا ہے۔

شمع خالد افسانے کے مرکزی اور ضمنی وقوعوں کے انتخاب و حذف کا اچھا شعور رکھتی ہیں۔ ان کے تقریباً سارے ہی افسانے مختصر ہیں لیکن یہ اختصار کسی واقعاتی تشنگی کا احساس نہیں دلاتا بلکہ بعض افسانوں کے اختتامیوں میں قدرے غیر ضروری توضیح سے بچنے کی ضرورت تھی، زبان و بیان پر مزید دسترس حاصل کرنے کی گنجائش بھی موجود ہے۔ حقیقت نگاری کی جدید روایت میں متعدد خوبصورت افسانے لکھ کر شمع خالد نے اپنی منفرد پہچان کرالی ہے ۔ "اوڑگیان کا لمحہ" مجموعی طور پر افسانوں کی ایک خوشگوار کتاب ہے۔

یوسف حسن

مُشتِ غبار (سوانح)

مصنف : چودھری محمد اقبال گوندل قیمت: ۱۵۰

ناشر : جنگ پبلشرز، لاہور

ہمارے ذہنوں میں میر تقی میر کے اس شعر سے "مشتِ غبار" کا مفہوم متعین ہوا تھا کہ :

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

"مشتِ غبار" کے مصنف چودھری محمد اقبال گوندل کو ہم "آوارۂ عشق" بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان کی کتاب کے نام کا کوئی جواز پیدا ہوتا، چنانچہ اپنی تصنیف کا نام "مشتِ غبار" رکھ کر انھیں اتنی شدید کسرِ نفسی سے کام نہیں لینا چاہئے تھا۔ وہ اتنی مدت تک ڈپلومیٹک سروس میں رہے ہیں اور قریب قریب پورا کرۂ ارض چھان ڈالا ہے اور نشیب و فراز کی ان گنت کیفیتوں میں سے گزرے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ انھوں نے اس کتاب میں اپنے کھرے پن اور راست فکری اور راست گفتاری کی بے حساب مثالیں پیش کی ہیں اور یوں اس تحریر کو، غیر شعوری طور ہی سہی، تاریخِ پاکستان کا ایک ناگزیر حصہ بنا دیا ہے۔ میں تو یہ تک کہنے کو تیار ہوں کہ جب بھی پاکستان کی سچی غیر جانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ تاریخ لکھی جائے گی (جو ابھی تک نہیں لکھی گئی) تو چودھری محمد اقبال گوندل کی اس کتاب کے متعدد حوالے اس تاریخ کا حصہ بنیں گے۔ اس صورت میں تقریباً تین سو صفحات کی اس تاریخی تحریر کو "مشتِ غبار" قرار دینا سراسر غلط ہے۔ مگر اب توجہ ہو نا تھا وہ ہو چکا۔ یہاں مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آ رہا ہے۔ مہاتما گاندھی نے قائداعظم سے کہا تھا کہ میں حیران ہوں آپ کو مسٹر جناح کہوں یا قائداعظم۔ اور قائداعظم نے جواباً کہا تھا کہ گلاب کے پھول کا کوئی سا نام بھی رکھ لیں، اس کی خوشبو میں تو کوئی فرق نہیں آئے گا۔

"مشتِ غبار" کے مصنف کی طرح میں بھی کوہستانِ نمک کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں چنانچہ جب بھی اس کتاب میں کسی بڑی شخصیت نے گوندل صاحب کے سامنے اس امر پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ آپ دیہاتی ہو کر شہری زندگی سے کیسے ایڈجسٹ کر پائے، تو مجھے یہ سوچ کر تکلیف ہوئی ہے کہ یہ بزرگوار ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ پاکستان کی آبادی تو اسّی فی صد دیہاتیوں پر مشتمل ہے بلکہ ہمارے ہاں

کے بڑے شہروں کی اسی فی صد آبادی دیہات ہی سے وہاں پہنچی ہے، پھر اس پر اتنی حیرت کیوں ؟ صرف لاہور کے بڑے بڑے نام لے لیجیے۔ ان میں سے کوئی بھی خاص لاہور کا باشندہ نہ ہوگا۔ پھر بڑے بڑوں کے ذہن میں اس ایڈجسٹ منٹ پر حیرت کیوں بیدار ہوئی؛ اس ضمن میں گوندل صاحب کا رویہ نہایت مثبت رہا اور انھوں نے ہر موقعے پر اپنے دیہاتی ہونے کا کامیاب دفاع کیا۔

"مشتِ غبار" کو گوندل کی خود نوشت سوانح عمری قرار دینا چاہیے۔ یوں ہمارے ادب میں سوانح عمریوں کی جو کمی ہے وہ اس کتاب سے شاید دور تو نہ ہوسکے مگر گوندل صاحب کی سی متنوع اور بوقلموں زندگی گزارنے والے دوسرے کئی اصحاب اس کی پیروی کرتے ہوئے اپنی اپنی سوانح عمریاں لکھنے پر اکسائے جاسکتے ہیں۔ سوانح حیات لکھنے کے لیے تخلیق کار ادیب ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ صرف اظہار کی سہولت میسر ہونی چاہیے۔ اور دیکھیے کہ "مشتِ غبار" میں مصنف نے کسی مقام پر ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ مجھے تو شبہ ہے کہ انھوں نے اشاعت سے پہلے اپنی یہ تحریر کسی ادیب کو دکھائی بھی نہیں ورنہ اس میں زبان و بیان کی جو فروگزاشتیں ہیں وہ دور ہو جاتیں، مگر ان معصومانہ فروگزاشتوں نے بھی گوندل صاحب کے کھرے پن میں اضافہ ہی کیا ہے کہ ان کی خامیاں پکڑنے کی بجائے ان پر پیار آنے لگتا ہے۔

"مشتِ غبار" کی تہذیبی اور معاشرتی اہمیت کا تجزیہ میں بعد کے کسی وقت پر اٹھا رکھتا ہوں البتہ اس وقت مجھے اس مثبت حیرت کا اظہار کرنا ہے کہ اتنے سچے، کھرے، حوصلہ مند اور "سٹریٹ فارورڈ" ڈپلومیٹ نے اپنی سروس کا طویل عرصہ کس طرح بخیر و عافیت گزار لیا۔ میں آخر میں خود مصنف کی لکھی چند سطریں دہرانے پر اکتفا کروں گا جو ان کے نظریۂ حیات کا ایک COMPACT اظہار ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> "زندگی اور دریا میں ایک یگانگت ہے۔ دریا بارش کی بوندوں کو سمیٹ اور برفانی تودوں کے پگھلے ہوئے قطرات کو لپیٹ کر ایک راہ اختیار کر لیتا ہے۔ رستے میں جو چھوٹی بڑی رکاوٹ حائل ہوتی ہے اسے بس انداز کر کے نئی راہ کاٹ لیتا ہے۔ پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیوں سے ٹکراتا، جنگلات کو کاٹتا، صحرائی ٹیلوں کو چاٹتا، کسی بحر بیکراں سے مل کر خوب بے کنار ہو جاتا ہے۔ انسان ہمت کا دامن نہ چھوڑے تو زندگی بھی بلند و بالا و سنگلاخ چوٹیوں کو ٹکراتی یاان سے لپٹتی گھسٹتی، حیاتِ جاوداں سے مل کر بے کنار ہو جاتی ہے۔"

گوندل صاحب کے یہ الفاظ خود ان کی زندگی پر حرف بحرف صادق آتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

مجلہ "اوج" (نعت نمبر)

مرتب: ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی قیمت: ناشر:

گورنمنٹ کالج شاہدرہ کے علمی و ادبی مجلہ "اوج" کا نعت نمبر ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جس کے لیے نعت نگاری کی تاریخ لکھنے والوں کو ایک الگ باب کی ضرورت پڑے گی۔ نعتوں کے مجموعے تو شائع ہوتے رہتے ہیں اور ان میں سے بعض کی حیثیت یقیناً بے حد اہم ہے، مگر جو اہتمام مجلہ "اوج" کے مدیر اعلیٰ اور نعت نمبر کے مرتب و مدون ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب نقوی بروئے کار لائے ہیں وہ متعدد پہلوؤں سے بے مثال ہے۔

میرے پیش نظر "اوج" کا یہ نعت نمبر ہے جس میں نعتوں کا انتخاب دور حاضر کے نعت نگاروں تک پھیلا ہوا ہے مگر اس انتخاب کو صرف اردو تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ پاکستان کی دوسری زبانوں میں لکھی گئی نعتوں کے تراجم بھی شامل کئے گئے ہیں۔ یوں نہ صرف پاکستان میں نعت نگاری کا تذکرہ مکمل ہوتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی پاکستان کے مختلف علاقوں اور زبانوں کے اتحاد و یگانگت کا پہلو بھی نکلتا ہے اور یہ نہایت خوش آیند پہلو ہے۔ پھر اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، براہوی، سرائیکی، کشمیری، ہندکو، میواتی اور گجراتی زبانوں میں لکھی جانے والی نعتوں کے علاوہ جرمن، فرانسیسی، انگریزی، عربی، فارسی، چینی، بنگالی، مارواڑی اور ہندی نعت نگاری

کے تجزیے بھی پیش کئے گئے ہیں اور یوں اس نعت نمبر کو ہمہ گیر اور ہمہ جہت حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ نعت نگاری کے مختلف اور متنوع پہلوؤں سے اہلِ علم و دانش اور اربابِ شعر و فن نے جو معلومات افزا مقالات لکھے ہیں وہ بھی اس یادگار نمبر میں شامل ہیں اور یوں اس کی افادیت کو طالب علموں سے لے کر علماء و فضلاء تک پھیلا دیا گیا ہے۔ ایک اور خوبی اس مجموعے کی یہ ہے کہ اس میں پچاس کے قریب غیر مسلم شعراء کی نعتیں بھی شامل کی گئی ہیں اور ان میں مہاراجہ کشن پرشاد، پنڈت ہری چند اختر، لالہ تارا چند، برج موہن دتا تریہ کیفی، کنور مہندر سنگھ بیدی، بال مکند عرش ملسیانی، امرناتھ ساحر، پیارے لال رونق، اور جگن ناتھ آزاد کے سے نامی شعراء کے ساتھ غیر مسلموں میں غلام بھیک نیرنگ کا اسم گرامی دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ میرے لئے ان کا غیر مسلم ہونا ایک انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے۔ غرض نعت نگاری کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو جو ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب نقوی کی تحقیقی گرفت سے بچ نکلا ہو۔ حد یہ ہے کہ سینتالیس نعت خوانوں کی گفتگو کو بھی ریکارڈ کر دیا گیا ہے اور یہ بے حد دلچسپ حصہ ہے۔

میں اس ادبی کارنامے پر "اوج" کے نعت نمبر کے مرتب ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب نقوی کے علاوہ کالج کے پرنسپل پروفیسر میاں مقبول احمد صاحب اور ان طلباء و اساتذہ کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت و تحسین پیش کرتا ہوں جنہوں نے یہ بھرپور نعت نمبر مرتب کر کے نہ صرف ادب کے خزانوں میں اضافہ کیا بلکہ آج کے دور کو نعت نگاری کا دور ثابت کر دکھایا۔

احمد ندیم قاسمی

بجلی کے میٹر
اب
پاکستان میں ہی
تیار ہوتے ہیں

اس کی ہستی ایک اور زہریلے میں تبدیل ہوئی۔

احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر پبلشر نے محمد شریف کے اہتمام سے طفیل آرٹ پرنٹرز، ۱۸۷ سرکلر روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر فنون ۴۵-اے مزنگ روڈ لاہور سے شا

پاکستان

قدرتی وسائل اور افرادی قوّت سے مالا مال ترقی کی شاہراہ پر گامزن

محترمہ بے نظیر بھٹو کی روشن خیال قیادت میں نیشنل بینک قومی عزائم کی تکمیل کیلئے پوری طرح کوشاں ہے

نیشنل بینک کی اندرونِ ملک اور دنیا بھر میں پھیلی ہوئی
شاخیں درآمد و برآمد کنندگان کے درمیان رابطہ اور پاکستان
کی بین الاقوامی تجارت کے فروغ میں پیش پیش ہیں۔
واشنگٹن ڈی سی۔ شکاگو۔ نیویارک (۲ برانچیں) لندن (۲ برانچیں) برطانیہ میں
مزید ۶ برانچیں۔ پیرس۔ قاہرہ۔ بحرین۔ ہانگ کانگ (۲ برانچیں) کولون۔ سیول
ٹوکیو۔ اوساکا۔ نساؤ اور بیجنگ میں نمائندہ دفتر۔
سعودی عرب میں ہمارا شریک کار ادارہ بینک الجزیرہ اپنی ۲۶ شاخوں
کے ساتھ مملکت سعودیہ کی معاشی ترقی میں نمایاں طور پر سرگرم ہے۔

نیشنل بینک آف پاکستان

اعلیٰ خدمت مکمل تحفظ

ہیڈ آفس۔ آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ پاکستان Telephones 2416780-10 lines 2414041-5 lines Telex 21034 20732 29067 20733 20179 20180 NBP PK Fax 2416769

UNITED